حیات افلاطون

یعنی

یونان کے اُس عالی دماغ اور بلند پرواز فلاسفر کے مکمل اور مفصل حالات جس نے ارسطو کا سا لائق اور فاضل شاگرد پیدا کر کے یونانی حکمت کا چار دانگ عالم میں ڈنکا بجا دیا تھا۔

مولفۂ

منور خاں ساغر اکبر آبادی مترجم ولٹریری اسسٹنٹ بائبل سوسائٹی لاہور

جسکو

بعد حصول جملہ حقوق دوامی از مؤلف

منشی رام اگروال تاجر کتب پروپرائٹر اردو اخبار و مالک اُردو اخبار مشین پریس لاہور نے

اپنے

مطبع اُردو اخبار لاہور میں چھاپا

قیمت ۶/ چھ آنہ

افلاطون

افلاطون کی زندگی کے حالات

افلاطون یونان کے حکیموں میں ایک ایسا زبردست اور عالی دماغ حکیم گذرا ہے کہ جس کا مدمقابل تاریخ عالم میں مشکل ہی سے نظر آتا ہے۔ اُس کے دماغ کی پرواز اُس کی سوجھ بوجھ اور وہ علوم جن پر اُس نے بحث کی یا جن کی اُس نے بنیاد ڈالی ایسی باتیں ہیں جن کی بدولت افلاطون کا نام نامی دنیا میں اس آب و تاب کے ساتھ قایم رہے گا جس آب و تاب اور چمک دمک کے ساتھ عالم بالا پر نجوم روشن ہیں۔ اگرچہ اُس کی وفات کے بعد اُس کی قابلیت پر بہت سے لوگوں نے نکتہ چینیاں کیں۔ لیکن ایک بھی اُس کے نام اور علوم و دانش کی شہرت کو ذرا بھی نہ گھٹا سکا بلکہ خود اُن کی نکتہ چینیاں افلاطون کے دعوے بن گئیں۔ اور اُسکی شہرت اور بقائے نام کو زندہ رکھنے میں ممد و معاون ہوئیں۔ الغرض افلاطون حکمت بالغہ اور اسرار علوم شفشاہ گذرا ہے۔

افلاطون سے نامی حکیم اور فیلسوف کی زندگی کے حالات کو تصنیف کرنا اور وہ بھی بوضاحت بذات خود ایک اہم کام ہے۔ اسکی سوانح لکھنے کیلئے ایک وقفہ کی ضرورت ہے۔ اور خود سوانح لکھے جانے کے بعد ایک دفتر ہو جائینگے۔ مزید براں اگر اُن علوم پر جنپر اُس نے طبع آزمائی کی یا جن کی اُس نے بنیاد ڈالی مفصل بحث کی جائے تو مختصر کتب خانہ بنانے کے لائق کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔

ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ افلاطون کی سوانح عمری لکھنا ایک اہم کام ہے۔ کیونکہ یہ [illegible] ہے اور کا شخص جو علوم کے نام سے واقف ہو [illegible]

زندگی کے واقعات - اُس کے دماغی قوائے - اُس کی رائیوں - اُس کی عادات وخصایل - اور اُن علوم پر جنپر اُس نے طبع آزمائی کی یا جن کی اُس نے بنیاد ڈالی کیا خاک روشنی ڈال سکتا ہے -

اِن اوراق کا مصنف اپنے کو اس قابل نہیں پاتا کہ وہ مذکورہ بالا باتوں پر رائے قایم کر سکے - کیونکہ یہ کام اُس کے قبضہ اختیار و لیاقت سے بالکل باہر ہے - اسلئے وہ صرف اسی پر اکتفا کرتا ہے کہ اُس کی زندگی کے واقعات کو پبلک میں پیش کر سکے اُن کو اُس نقش قدم پر چلنے یا اُس کی سی لیاقت اور نام حاصل کرنے کی طرف توجہ دلا تا - اور ساتھ ہی سیدھے سادے طور پر یہ بتا دےگا کہ اُس نے کن کن علوم پر طبع آزمائی کی اور کن کن کی بنیاد ڈالی - رہا ان تمام علوم پر بحث کرنا سو یہ ایسا دشوار کام ہے جیسے کہ کوہ کندن وکاہ برآوردن ؂

سوانح عمریوں کے مطالعہ سے ایک چشم حق بین و دوربین رکھنے والا متعلم اگر چاہے تو بہت کچھ سیکھ سکتا اور بہت کچھ نام ونمود حاصل کر سکتا ہے - کیونکہ یورپ کے علماء کی رائے ہے کہ جو شخص بڑے بڑے ناموروں کی سوانح عمریوں کے مطالعہ کا شوق رکھتا ہے اُس کے لئے کسی اُستاد یا معلم یا رہنما کی ضرورت نہیں ہے - اور وہ اپنی خلوت میں بیٹھ کر بہت کچھ کر سکتا ہے اسی خیال سے اس رسالے کے مصنف نے اپنے اہل ملک کے فایدہ کو مدنظر رکھ کر افلاطون سے شخص کی سوانح عمری لکھی ہے -

افلاطون کی سوانح عمریاں قدیم زمانے کے کئی فیلسوفوں نے لکھی تھیں جو نسلاً بعد نسلٍ ہمارے ہاتھوں تک بھی آپہونچی ہیں - اور ان کے انتخاب سے ہم بھی اپنے رسالہ کو رونق دیتے ہیں - افلاطون کی ذات وصفات اور علم دماغ کی نسبت زمانہ مابعد میں بہت سے فسانے تراشے گئے - مگر موجودہ رسالہ میں ہم ان فسانوں پر بھی بحث نہیں کرنا چاہتے - ہم تو اُس کے دلوں پر یہ بات نقش کرنا چاہتے ہیں کہ افلاطون کیسا عالی دماغ - کیسا خلیق - کیسا معلم - کیسا رہبر - کیسا رہنما - کیسا نیک - اور بنی آدم کا کیسا ہوا خواہ تھا -

افلاطون سنہ ۴۲۷ قبل مسیح میں پیدا ہوا تھا - اُس کے مولد کی نسبت لوگوں

اور خصوصاً مورخوں وحیات نویسوں میں اختلاف ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ وہ ایتھنس (مدینۃ الحکما) میں پیدا ہوا تھا۔ اور کسی کی رائے یہ ہے کہ ایجینا ( ) میں۔ جہاں اُسکے باپ کی آراضی واقع تھی۔

افلاطون کا خاندان ایتھنس میں ایک معزز خاندان سمجھا جاتا ہے۔ اُس کے باپ کا نام اریسطو ( ) تھا۔ اور ماں کا نام پیرکٹیونی ( ) تھی۔ جو ایتھنس میں ایک زبردست حکیم گذرا تھا اور جس کے بنائے ہوئے قوانین پر عمل کر کے یونان کے باشندے ترقی وعظمت کے آسمان پر جا پہونچے تھے۔ اُس کی ماں حکیم سولن ( ) کے خاندان سے

حکیم سوسن ایک نامی گرامی شخص نیلیوس ( ) کی نسل میں سے تھا۔ اور نیلیوس پوسائیڈن ( ) کا بیٹا تھا۔ اریسطون ایتھنس کے آخری بادشاہ کوڈرس ( ) کی اولاد میں تھا اور کوڈرس بھی پوسائیڈن دیوتا کی نسل میں سے تھا۔

افلاطون نہ صرف اسی تعلق کے باعث دیوتا کی اولاد میں تھا۔ بلکہ ایک اور طرح پر بھی وہ دیوتا زاد تھا۔ وہ آفتاب کے دیوتا اپولو ( ) کی اولاد میں تھا۔ کیونکہ جب اریسطون نے پیرکٹیونی کے ساتھ شادی کی تو شب عروس کو اپولو دیوتا اُسے خواب میں نظر آیا۔ اور اُس سے کہہ گیا کہ تیری بیوی مجھ سے حاملہ ہے۔ افلاطون تھارگیلیئن مہینے (انگریزی ماہ مئی) کی آخری تاریخ کو پیدا ہوا جس روز خود اپولو دیوتا پیدا ہوا تھا۔ مزید براں افلاطون اسی ماہ کی اسی تاریخ کو جس تاریخ کو کہ وہ پیدا ہوا نوسال کی نوگنی (۹ × ۹ = ۸۱) عمر پر پہونچنے کے بعد فوت ہوا تھا۔ اور اپولو کے جلو میں بھی نوکی نوگنی (۸۱) ماہ پارا نازنین یا دیوتائیاں رہتی ہیں۔ ان تمام باتوں سے اہل یونان اور خصوصاً اہل ایتھنس نے یہ قرار دیا کہ افلاطون اپولو دیوتا کی اولاد سے تھا اور یونان کے لوگ دیوتاؤں کی اولاد کو عالی نسبت خیال کرتے تھے۔

جس روز کہ افلاطون پیدا ہوا اُس کے والدین اُسی روز اُسے کوہ ہیمیٹس ( ) پر لے گئے۔ جہاں اُنھوں نے پان اور اپولو دیوتاؤں اور سمندر کی نازنینوں یا دیوئیوں کی جناب میں دعا کرنے کے بعد اُن کے نام پر قربانی گذرانی

سنہ ۴۲۹ قبل مسیح (۱)

جب افلاطون وہاں سو رہا تھا تو شہد کی مکھیوں نے آکر اُس کے مُنہ کو شہد سے بھر دیا
یہ اس بات کی علامت تھی کہ اُس کی باتیں شہد سے زیادہ شیریں اور دلفریب
ہونگی۔

جب افلاطون پیدا ہوا تو حکیم سقراط نے خواب میں دیکھا کہ ہنس کا ایک بچہ آکر
اُس کے گھٹنوں پر بیٹھ گیا۔ اور پھر پر نکال کر اُڑ گیا۔ اور شہر میں میں چلاتا چلا گیا
دوسرے ہی دن افلاطون کو اُس کی خدمت میں حاضر کیا گیا تو اُسے اپنے خواب کی
تعبیر مل گئی۔ کیونکہ ہنس کا بچہ اپلو دیوتا کی علامت تھا۔ اس لئے خواب کا مطلب یہ
ہوا کہ اُس کے پاس افلاطون آئیگا وہ نادان آئیگا وہ دانا بن کر چلا جائیگا۔

مزید براں خود افلاطون اپنے کو ہنس کا رفیق خادم کہا کرتا تھا اور جب اُس
کی موت کا وقت نزدیک آیا تو اُس نے خواب میں دیکھا کہ وہ ہنس بن گیا۔ اور
ایک درخت سے دوسرے درخت پر اڑتا پھرتا ہے اور شکاریوں کے دام میں نہیں آتا۔

یہ قصص خواہ بذات خود کیسے ہی قابل وقعت ہوں۔ خواہ ناقابل وقعت اور خواہ ہم اُن کا مضحکہ
اُڑائیں۔ لیکن جس ملک میں افلاطون پیدا ہوا تھا وہاں کے لوگوں کے عقیدہ اور خیال کے
موافق یہ قصص احکام ربانی کا مرتبہ رکھتے تھے اور اُن ہی کے باعث افلاطون دیوتاؤں کی
اولاد کہلایا۔ انہی قصص کی بنیاد پر ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ عالی نسب تھا۔

لکھنے پڑھنے میں اُس کی تعلیم دیونائسس حکیم کے مبارک ہاتھوں سے شروع ہوئی اور
ورزش کی تعلیم ارسطون پہلوان ساکن آرگوس کے ہاتھوں سے ملی۔ اور فن موسیقی کی تعلیم
ڈریکون نے دی جو ڈیمن مطرب کا شاگرد رشید تھا۔

افلاطون کا نام اُسکے دادا کے نام پر ارسٹاقلیس ( ) رکھا گیا
لیکن اُس کے اُستاد نے جو اُسے ورزش سکھلایا کرتا تھا اُس کا نام فلاطون ( )
اس لئے رکھا کہ اُس کا سینہ اور پیشانی دونوں بہت چوڑے تھے۔ مگر بعض لوگ اُس کے نام کا
آغاز کچھ اور ہی طرح پر بتاتے ہیں جو درست نہیں ہے۔

عالم عنفوان شباب میں افلاطون جزیرہ تھماپوتان کے رہنے والوں کے ساتھ کشتیاں لڑتا
رہا۔ اور پائی تھیئس ( ) اُس نے جزیرہ تھماپوتان اور کورنتھ دونوں
جگہوں کے رہنے والوں کے ساتھ زور آزمائی۔ اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ اُس نے اولمپک

اور نیمیا کے کھیلوں میں بازی جیتی۔
عالم شباب میں افلاطون کو تین جنگی مہموں میں شریک ہونا پڑا پہلے ہم تن اگرا (
) دوسرے جنگ کرنتھ (   ) اور تیسرے
ڈیلیئم (   ) کی لڑائی میں۔

جوانی کے ایام میں افلاطون فن مصوری۔ نقاشی اور شعر گوئی کی مشق بھی کرتا تھا
فن شاعری میں اُس نے ایسی نظمیں بھی لکھی تھیں جن کے قصوں کا انجام بخیر نہیں ہوا
لیکن جب اُسے سقراط کا حال معلوم ہوا اور نیز یہ کہ وہ ایک بڑا زبردست حکیم و فلسفی
ہے تو اُس نے اپنی ساری نظموں کو جلا ڈالا۔ اس وقت افلاطون ایک حریف کے مقابلہ
کے لیے ایک نظم لکھ رہا تھا۔ لیکن اُس نے اسکی بھی مطلق پرواہ نہ کی۔ بلکہ فن شاعری
کو خیر باد کہہ کر فلسفہ کی تعلیم میں مشغول ہو گیا۔

جس وقت افلاطون کی عمر کوئی بیس سال کی ہو گی وہ اُس وقت حکیم سقراط کے
دائرہ شاگردی میں داخل ہوا تھا۔ اور جب کچھ عرصہ بعد حکیم سقراط کہیں دوسری جگہ
چلا گیا تو افلاطون نے حکیم قریطلیوس (   ) کی شاگردی اختیار کی لیکن
بعض مصنفوں کی رائے ہیں وہ اس حکیم کی شاگردی سے نکلکر حکیم سقراط کے شاگردوں
کی جماعت میں داخل ہوا تھا۔

اس کے بعد افلاطون ایک اور حکیم کا شاگرد بنا۔ جس کا نام ہرموجنیٹوس (
) اور اُس سے اُس نے ان اصولوں کو سیکھا جنکی تعلیم حکیم پارمیناڈیوس
(   ) دیا کرتا تھا۔ جب اُسکی عمر کوئی ۲۸ سال کی ہوئی تو
وہ اس حکیم کے پاس سے بھی رخصت ہوا اور میگارا (   ) کو چلا گیا۔ اُسکے
ساتھ حکیم سقراط کے بہت سے شاگرد تھے میگارا میں اُس نے حکیم اقلیدس سے علم ہندسہ
کی تکمیل کی۔ بعد وہ سیرینی (   ) گیا۔ اور حکیم تھیوڈورس (
) علم ریاضی سیکھتا رہا۔

سرینی سے افلاطون ملک اطالیہ میں فیثاغورث حکیم کے معتقدوں کی خدمت میں
حاضر ہوا۔ اور کچھ اصول و علوم کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مصر جا کر وہاں کے بڑے بڑے
زبردست عالم فاضل پیشوایان دین کی قدمبوسی حاصل کی۔ اور کچھ مدت اُنکی خدمت میں

رہ کر اور اُن کی نصیحت سے بہرہ یاب ہو کر اپنے وطن کو واپس چلا آیا۔

افلاطون نے وطن میں کچھ عرصہ قیام کر کے فارس جانے کا ارادہ اس نیت سے کیا کہ وہاں کے مجوسیوں کے علوم حاصل کرے۔ لیکن چونکہ اُس وقت ایشیائے کوچک میں جنگ جدل چھڑی ہوئی تھی۔ اس لئے اسے اپنا ارادہ ترک کرنا پڑا۔ مگر بعض مصنفوں نے لکھا ہے کہ وہ سرزمین فینکی ( ) تک ضرور گیا۔ اور وہیں اُس نے مجوسیوں سے زوراسٹر ( ) کے اصول سیکھے۔

جب افلاطون اپنی سیر و سیاحت سے فارغ ہو چکا تو اپنے وطن اتھینس میں ایسا آکر سکونت پذیر ہوا۔ اور اخادیمس ( ) مشہور پہلوان کے باغ میں لوگوں کو تعلیم دینے لگا۔ اگرچہ اُس کی تحریروں سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ ایک بڑا زبردست مدبر تھا۔ لیکن اُس نے امور ملکی میں کبھی اپنا پاؤں نہیں پھنسایا بلکہ اُس سے ہمیشہ حذر کرتا رہا۔

نوٹ

کہتے ہیں کہ جب اتھینس کے کسی شہری نے خابرئوس سپہ سالار کی طرفداری نہیں کی۔ تو افلاطون نے اُس کی امداد کی۔ اور حمایت کر کے اُسے ایک بڑے سنگین جرم کی سزا سے بچا لیا۔ اور جب وہ اپنے اس موکل کے ساتھ ایکروپولس کو جا رہا تھا۔ تو اُس موکل کا مدعی راستہ میں ملا اور افلاطون سے کہنے لگا یہ کیا تم ایک غیر کی حمایت و امداد کے لئے آئے ہوئے ہو کیا تمہیں خبر نہیں کہ زہر کا پیالہ جسے پی کر سقراط نے اپنی جان دی تھی تمہارا منتظر ہے۔ مگر افلاطون نے جواب میں کہا کہ جب میں نے اپنے ملک کیواسطے جنگ کی تھی تو خطروں کا مقابلہ کیا تھا۔ اور اُن کا میں اب بھی انصاف اور ایک دوست کی حمایت و امداد کی خاطر مقابلہ کرتا ہوں۔" ایک مورخ لکھتا ہے کہ جب اہل اتھینس اور اہل ارگیڈ نیا نے شہر میگالوپوس کی بنیاد ڈالی تو افلاطون سے استدعا کی کہ وہ اُس کے لئے قانون بنائے اور اُن کی سرداری قبول کرے۔ لیکن اُس نے اسے قبول ہی نہیں کیا۔

افلاطون نے جزیرہ سسلی (سسالیہ) کا تین بار سفر کیا۔ پہلے سفر تو اُس نے اُس سرزمین اور وہاں کے آتش فشاں پہاڑ اتھینا کے دیکھنے کے لئے کیا تھا۔ جب وہ اس سفر میں سرزمین سسلی میں مقیم تھا تو وہاں کے بادشاہ دیوجانس نے اُسے مقام سیراکیوز ( ) میں اپنے پاس بغرض ملاقات بلایا۔ لیکن جب

افلاطون نے امور مملکت پر آزادی کی رائے قایم کی تو بادشاہ ناخوش ہوگیا اور کہنے
لگا افلاطون ایک معمر شخص کی مانند بیابانی کے ساتھ گفتگو کرتا ہے۔ اس کے جواب
میں افلاطون کہنے لگا کہ تم تو ایک ظالم کی سی باتیں کرتے ہو۔

شاہ دیوجانس اس بات پر سخت ناخوش ہوگیا کیونکہ اسے یہ بات بڑی ناگوار
گذری اور بُری لگی۔ اس نے افلاطون کے قتل کرا دینے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن افلاطون
کے رفیق ڈیئن (   ) اور ارسطو مینیس (   )
کے کہنے سننے سے اپنے ارادہ سے باز رہا۔ لیکن اس نے افلاطون کو اہل لیسڈیمنیا
کے حوالہ کرکے ان سے کہا کہ اسے غلام کے طور پر فروخت کر دیں۔ یہ لوگ اس وقت
شاہ سسلی کے دربار میں سفیر بن کے گئے تھے۔ انھوں نے اس کے کہنے کو بسر و چشم
قبول کر لیا۔

جب اہل لیڈونیا اپنے ملک کو واپس آنے لگے تو افلاطون کو اپنے ساتھ لے
گئے اور ایجینا (   ) پہونچکر وہ لوگ اسے بازار میں لے جاکر
غلام کے طور پر بیچنے لگے۔ اہل ایجینا اس وقت سے پہلے ہی یہ عہد کر چکے تھے کہ
ایتھنس کا رہنے والا سب سے پہلے ان کے ملک میں آئے گا وہ اسے بلا انصاف قتل
کر دینگے۔ چنانچہ وہ اپنے عہد کے موافق اسے قتل کرنے لگے۔ لیکن ایک جو اُس سے
واقف تھا ان سے کہنے لگا کہ جسے تم قتل کرنے لگے ہو وہ ایک فلسفی ہے۔ اسلئے انہوں
نے اسے آزاد کر دیا۔ مگر بعض مصنفوں نے لکھا ہے کہ وہ لوگ اس بات کے سننے پر اسے
اپنے ہاں مالی مجلس میں لے گئے۔ اور دیکھا کہ وہ کیا تقریر کرتا ہے۔ لیکن افلاطون
خاموش رہا اس نے اپنی زبان سے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ پھر اہل مجلس نے یہ فیصلہ کیا کہ اسے
قتل نہ کیا جائے بلکہ جنگ کے قیدی کی حیثیت سے اسے فروخت کر دیا جائے۔ تب
مقام پرسیرینی کا ایک باشندہ جس کا نام اینی سیرکس (   )
تھا وہاں جا پہونچا اور اس نے اس کے عوض تاوان میں ایک معقول رقم دے کر
رہائی دلوائی اور اسکے دوستوں کے پاس ایتھنس میں بھجوا دیا۔

جس وقت افلاطون ایتھنس پہونچا تو اس کے رفیقوں کو بڑی ہی خوشی حاصل
ہوئی۔ اور بقول بعض مصنفوں کے صرف ڈیئن نے اور بقول بعض کے اہل ایتھنس نے

تاوان کا روپیہ اینی سیرس کے پاس پہونچا مگر اس نے نہیں لیا۔ یہ کہنے لگا کہ صرف
میں ہی ایسا آدمی نہیں ہوں جس نے افلاطون کا لحاظ کیا۔ بلکہ آگے چلکر بہت سے اس
کی اطاعت کرینگے۔ کہتے ہیں اینی سیرس نے اتھینس میں اپنے روپیہ سے افلاطون
کے لئے ایک باغ خریدا۔ جب شاہ ڈیاسن کو ان باتوں کی خبر ہوئی تو اس نے افلاطون
کو ایک خط لکھا کہ وہ اس کی برائی میں اپنی زبان کھولے۔ اس خط کا افلاطون نے
یہ جواب دیا کہ اسے اتنی بھی فرصت نہیں ہے کہ ڈیوجانسن کا خیال اپنے دل میں
لاسکے۔

افلاطون نے سسلی کا دوسرا سفر اس وقت کیا جبکہ ڈیوجانس کا بیٹا ڈیوجانس
اصغر اپنے باپ کی جگہ تخت شاہی پر حکمرانی کرتا تھا (دوسرا بیٹا ڈیوجانس اصغر اپنے
باپ کی جگہ تخت شاہی پر حکمرانی کرتا تھا) دوسرا سفر اس نے اس امید سے کیا تھا
کہ وہ اس بادشاہ سے کچھ اراضی اور آدمی حاصل کرکے اپنی ایک جمہوری سلطنت
قایم کرے۔ اگرچہ بادشاہ نے اس سے وعدہ کر لیا کہ وہ اسے روپیہ اور آدمی دیگا۔
لیکن اس کو وفا نہیں کیا۔ بعض مصنف لکھتے ہیں کہ اس سفر افلاطون نے ڈیئن کی
طرفداری کرنی چاہی تاکہ اسے تخت پر بٹھاکر جزیرہ سسلی کو ایک ظالم فرمانروا کے
پنجہ سے خلاصی دلاتے۔ لیکن حکیم فیثا غورث کے ایک معتقد نے جس کا نام
آرخیٹس ( ) تھا بادشاہ کو ایک خط کے ذریعہ اطلاع دی
کہ وہ افلاطون کو بہ امن و امان اس کے وطن کو واپس بھیجدے۔

تیسرا سفر افلاطون نے اس ملک کا اس غرض سے کیا کہ وہ بادشاہ ڈیوجانس
اور ڈیئن میں مصالحت کرادے۔ لیکن اس میں اسے کامیابی حاصل نہیں ہوئی
بلکہ بے نیل مرام اپنے وطن کو واپس آنا پڑا۔

افلاطون ایک کشیدہ قامت اور قوی الجثہ شخص تھا۔ اور اسقدر وجیہ جوان
تھا کہ جب وہ اولمپک کھیلوں میں شریک ہونے کے لئے گیا سارے یونانی
اسے دیکھکر عش عش کرتے تھے۔

افلاطون اگرچہ قوی تھا۔ لیکن اس کی آواز نہایت باریک تھی۔ لوگوں نے
اسے دومنٹ بھی مصروف رہنے نہیں دیکھا۔ اس کی موت اس وقت آئی جب وہ

اپنے ایک دوست کے ہاں ایک شادی کی مجلس میں شریک تھا - وفات کے بعد
اُسے اُس باغ میں دفن کیا گیا جس میں کہ وہ تعلیم دیا کرتا تھا - اُسکے جنازے کے ساتھ
سارا شہر گیا تھا - لوگوں نے اُس کی وفات کے مرثیے لکھے اور تاریخیں لکھیں۔ اُن
تاریخوں میں اُسے دیوتاؤں کا مرتبہ دیا گیا -

ہم افلاطون کی وفات کی ایک تاریخ کا ترجمہ جو نہایت مستند ہے ناظرین کی
دلچسپی کے لئے یہاں درج کرتے ہیں - اس تاریخ میں اُسے اسقیولا پیئس (
) پر بھی فوقیت دی گئی ہے - جو اپولو دیوتا کا ایک بیٹا تھا -

"بنی انسان کو اپولو نے دو بیٹے عطا کئے - جن میں سے ایک کا نام اسقیولا پیئس
تھا اور دوسرے کا افلاطون - ان میں سے پہلا تو جسم کو چنگا کرنے والا تھا" اور
دوسرا روح کو"

جن لوگوں نے افلاطون کی سوانح عمریاں لکھی ہیں اُنہوں نے روایات پر زیادہ
تر انحصار کیا ہے - اُن کے بیان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ افلاطون ایک بہادر اور
ایک مضبوط اور شہ زور شخص تھا - وہ صداقت کا دل و جان سے پیرو تھا -
اور اگر موقع مل جاتا تو وہ اُس گورنمنٹ سے زیادہ اچھی گورنمنٹ قائم کر لیتا جو
اُس کے زمانہ میں پائی جاتی تھی -

یونان میں جس قدر بڑے بڑے خاندان گذرے ہیں وہ سب اپنے کو دیوتا
کی اولاد مانتے ہیں - اور سمجھتے تھے کہ فلاطون دیوتا نے فلاں خوبصورت نازنین
عورت کو اپنی بیوی بنا لیا تھا - اور اُس سے ہماری نسل چلی ہے اسی سند کی بنا پر
افلاطون کو بھی دیوتا زادہ ہونے کا فخر حاصل ہوا تھا -

اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو افلاطون اپنی عقل و دانش اور اُس نیکی کے
لحاظ سے جو اُس نے بنی انسان کے ساتھ کی فی الحقیقت دیوتا زادہ کہلائے جانے
کا مستحق ہے - یونانیوں کے دیوی اور دیوتاؤں کے قصص کو بالائے طاق رکھ کر
دیکھا جائے تو بھی ہم افلاطون کو نہ صرف دیوتا زادہ اور دیوتا - بلکہ برتر از دیوتا یا
دیوتاؤں کا جد امجد کہہ سکتے ہیں - کیونکہ اُس نے انسان کو خدا کی شناخت کا نور بخشا
اُس کی ہستی کا بتایا -

انھوں نے جس مدرسہ کی بنیاد ڈالی اُس کے طالب علم اپولو کی سالگرہ کے دن افلاطون کی سالگرہ منایا کرتے تھے۔

اس میں بھی شک کو مطلق گنجائش نہیں ہے کہ جن شخصوں کو اس کا اُستاد اور معلم بتایا گیا ہے۔ وہ فی الحقیقت اُسکے اُستاد اور معلم تھے کیونکہ اُن کے نام اس کی تصانیف میں موجود ہیں۔

بعض مصنفوں اور حیات نویسوں نے لکھا کہ جنگ پیلوپونیسس کے آخر میں افلاطون کو بھی میدان میں ہتھیار سجا کر جانا پڑا۔ مگر یہ بات پایہ ثبوت کو نہیں پہونچتی۔ کیونکہ جنگ ٹاناگران کے وقت اُس کی عمر ایک سال کی تھی اور جنگ ڈیلیئم کے وقت ۴ سال کی۔ البتہ اس میں کسی کو بھی شک و شبہ نہیں ہو سکتا کہ وہ جنگ پیلوپونیسس کے اخیر میں ایک بچہ تھا اور اُس کے سامنے یہ جنگ ختم ہوئی تھی۔ اُس کا اُستاد سقراط اس جنگ میں ضرور شریک ہوا تھا۔ اور ڈیلیئم اور اینتھس تھنس کے میدان میں اُس نے مردانگی کے جوہر خوب ہی دکھائے تھے اُس کے فلسفیانہ دماغ اور قابلیت کی نسبت ہم دیوجانس کی تحریر کو قابل یقین نہیں سمجھتے۔ بلکہ افلاطون کے شاگرد ارسطو کے بیان کو مستند اور صحیح مان سکتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ افلاطون لڑکپن ہی سے فلسفیوں کا سا دماغ اور خیالات رکھتا تھا اور حکیم کریٹی لس اور حکیم ہریک لیٹس کے اقوال اور خیالات سے خوب واقف تھا۔

اس میں بھی کسی کو کچھ شک نہیں ہے کہ افلاطون چھوٹی سی عمر ہی سے شعر و شاعری کا شوق رکھتا تھا۔ بحیثیت شاعر کے وہ الفاظ کی برجستگی اور ربط اور طرز کی اور انداز کی خوبصورتی کا شیدا تھا۔ اُس کی جو نظمیں اس وقت یورپ کی مختلف زبانوں میں پائی جاتی ہیں وہ خاصی نظمیں ہیں۔ اور اگر مورخوں اور حیات نویسوں کی اس بات کو تسلیم کر لیا جائے کہ اُس نے جو نظمیں اور اشعار ایام جوانی میں لکھے تھے۔ مگر بعد میں جبکہ اوسے فلسفہ کا شوق ہوا اُس نے جلا دیے تو بھی قیاس کرنا پڑتا ہے کہ وہ ایک زبردست پایہ کا شاعر ہوگا۔

لوگوں کو اس میں بھی شک ہے کہ افلاطون نے فن نقاشی اور فن موسیقی

سیکھا تھا لیکن ارسطو اپنے مکالمہ پولیٹکس میں بیان کرتا ہے کہ افلاطون اور خود وہ اُس کے زمانہ میں دونوں فن تعلیم کا جزو سمجھے جاتے تھے۔ اس سے یقین کیا جا سکتا ہے کہ افلاطون نے ان فنون کو ضرور سیکھا تھا۔

جتنے لوگوں نے افلاطون کی سوانح عمریاں لکھی ہیں اُن کا اس بات پر اتفاق ہے کہ افلاطون نے بہت سے ملکوں کی سیر و سیاحت کی تھی۔ اور یہ بات قرین قیاس ہے کہ جو شخص فلسفہ اور دیگر علوم کا شائق تھا اور جس کی نسبت یہ اقرار کیا اور کہا جاتا ہے کہ وہ ان علوم میں اعلےٰ دستگاہ رکھتا تھا۔ اُس نے مختلف ملکوں کی سیر بغرض تحصیل علوم ضروری کی تھی۔ خود اُس کی تصانیف سے پایا جاتا ہے کہ اُس نے مصر وغیرہ کا سفر کیا۔ حکیم سسرو نے بھی لکھا ہے کہ سقراط کی وفات کے بعد اُس کا شاگرد افلاطون سر اٹلی اور سسلی کے سفر کو گیا تھا۔ اُس نے پہلی مرتبہ سیرائکیوز کا سفر ۳۹۰ اور ۳۸۷ قبل مسیح کے درمیان کیا تھا۔ تیسرا سفر سسلی کا سنہ ۳۶۱ قبل مسیح میں کیا تھا۔ اُس کی تصانیف فیڈو ( ) فیڈرس ( ) ری پبلک ( ) سنہ ۳۸۷ اور سنہ ۳۶۸ قبل مسیح کے درمیان لکھی گئی تھی۔

ناظرین کی مزید دلچسپی کے لئے اگلے صفحہ پر افلاطون کے خاندان کا شجرہ دیا جاتا ہے۔ شکریہ۔

افلاطون کا شجرہ

ڈروپیڈیس جو سولن کا رشتہ دار تھا
کریٹیاس
گلوکن
کیلس کرکس
کریٹیاس سنہ ۴۰۳ قبل مسیح فوت ہوا
کارمانڈس سنہ ۴۰۳ قبل مسیح میں فوت ہوا
پیرکٹیونی (افلاطون کی مائی)

ارسٹنالیس
ارسطون (افلاطون کا باپ)
پری لامپس
اینٹی فون
(ارسطون کی پہلی بیوی)
اینٹی فون (افلاطون کا پہلا بھائی)

ایڈیمان ٹیوس
افلاطون
گلوکن
پوٹونی
اسپٹیوسی پس

افلاطون کی تصانیف

اگرچہ افلاطون کی تصانیف کی تعداد اور نوعیت میں مصنفوں کا باہم اختلاف ہے بعض مصنف اُن کتابوں کو اُس کی طرف منسوب کرتے ہیں جو اُس کی لکھی ہوئی نہیں ہیں اور بعض اُس کی لکھی ہوئی تصانیف کو اُس کی طرف منسوب نہیں کرتے ہیں۔ بعض مصنف اُس کی تصانیف کی تعداد کم بتاتے ہیں اور بعض زیادہ۔

اُس کی تصانیف کی نوعیت کو دیکھا جائے تو اُس میں مصنفوں میں باہم اختلاف ہے۔ بعض اُسے سقراط پر بھی فوقیت دیتے ہیں۔ یہ گویا ارسطو کی تصانیف کی مجموعی نوعیت ہے۔

اگر اُن مضامین اور علوم پر غور کیا جائے جن پر افلاطون نے قلم اُٹھایا اور طبع آزمائی کی۔ تو اس میں تو مصنف نے وہ دماغ لڑایا ہے کہ وہ بایدو شاید ہر بات اور ہر ہر خیال پر ایسی مفصل بحث کی ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ عجیب طریقہ اور عجیب استدلال سے چھان بین کی ہے۔ وہ کتابیں کہ افلاطون کی تصانیف کی مفصل نوعیت پر لکھی گئی ہیں اگر اُن کو ایک جگہ جمع کیا جائے تو ایک معمولی کتبخانہ بن جاتا ہے۔

افلاطون کی وفات کے بعد سے آج تک جن قوموں نے اُس کی تصانیف پر قلم اُٹھایا ہے اُن میں یونانی۔ رومی۔ مصری۔ عرب۔ فارسی۔ ہندی اور یورپ کی تمام قومیں شامل ہیں۔

افلاطون جیسا کہ قصص سے ثابت ہوتا ہے دیوتاؤں کی اولاد میں سے تھا۔ لیکن علمی پہلو سے دیکھو تو وہ علوم کا دیوتا گذرا ہے۔ اُس نے اگلے پچھلے حکماء کی قبر پر لات ماردی۔ اگلوں کا رنگ مٹا دیا۔ اور پچھلوں پر اپنا رنگ جما دیا جس طرح اُسکے بعد کے حکیموں نے اُسے مانا ہے۔ اُسی طرح اُس سے پچھلے حکیم اگر وہ زندہ ہو جاتا تو اُسے ضرور مانتے۔

ہم جیسا کہ اوپر بیان کر چکے ہیں کہ افلاطون سے عالی دماغ کی تصانیف پر رائے قائم کرنا گویا عرش کے تارے توڑنا ہے۔ تاہم ہم اُس کی تصانیف کی مختصر فہرست

پیش کرتے ہیں۔ زیادہ تر مصنف اس فہرست کو مستند مانتے ہیں۔

(۱) ٹیٹرلوجیا

(ا) یوتھیفرو

(ب) اپولوجیا سوکریٹس (معذرت نامہ سقراط)

(نوٹ) سقراط افلاطون کا استاد تھا۔ اُس نے اپنے سے پہلے حکماء اور نیز اپنے ہمعصر حکیموں کے خلاف دیوتا پرستی کو رد کیا اور وحدت کی تعلیم دی۔ اس پر اس کے حاسدوں نے عداوت میں یہ الزام لگایا کہ وہ اُن دیوتاؤں کی پرستش نہیں کرتا جن کی پرستش سارا ملک کرتا ہے۔ اور وہ نوجوانوں کو بداخلاقی کی تعلیم دیتا ہے۔ اگرچہ اس نے اپنے مخالفوں کے الزاموں کی تردید پورے طور پر کر دی لیکن رشک رنگ لایا۔ اور اُسے عدالت سے زہر کا پیالہ پی کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر دینے کا حکم دیا گیا۔ اس نے حق پر موت کو ترجیح دی اور بڑے استقلال کے ساتھ زہر کا پیالہ اور اپنی جان دیدی۔ یہ کتاب میں اُن مکالمات کا مجموعہ جو اس نے اس الزاموں کی تردید میں۔

(ج) کریٹو

(د) فیڈو

(۲) ٹیٹرلوجیا

(ا) کریٹیلس

(ب) تھیٹیٹس

(ج) سوفسٹ۔ اس کتاب میں صوفی مذہب کے اصول بڑے مفصل پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں۔ اور اُن کو علوم عقلی سے ثابت کرنے کے علاوہ مادی علوم سے بھی ثابت کیا گیا ہے۔

(د) پولیٹیکس یہ کتاب علم سیاست مدن پر ہے۔ اس میں اصول حکمرانی بادشاہ کے فرائض۔ رعایا کے ذمہ۔ اور رعایا کے بادشاہ کے ذمے۔ اور دیگر اصول بیان کئے گئے ہیں۔ تقریباً ایشیا۔ مصر اور یورپ کے تمام ممالک کے مدبروں نے علم سیاست مدن کے متعلق اس کتاب سے خوشہ چینی کی ہے۔

اور معقول بحث ہے جو حکیم مینو نے قائم کئے تھے افلاطون نے اُس کے اچھے اصول کو تسلیم کیا۔ اور کمزور اصول میں اصلاح کی۔

(۷) ٹیٹریلوجیا
(ا) ہپّیاس میجر } یہ دونوں کتابیں منطق کی ہیں ایک میں اصول کرالے
(ب) ہپّیاس مائینر } بیان کئے گئے ہیں۔ اور دوسری میں اصول
مفروضے۔
(ج) آئی او
(د) مینیکس زینس

(۸) ٹیٹرے لوجیا
(ا) کلی تو فو
(ب) ایپلک۔اس کتاب میں سلطنت جمہوری کے اصول بیان کرکے اُس کی بُرائی اور بھلائی پر بحث کی گئی ہے۔
(ج) ایٹیمی اس
(د) کریٹیاس

(۹) ٹیٹرے لوجیا
(ا) مائی نیوس۔اس کتاب میں حکیم مائی نیوس کے علوم پر بحث ہے حکیم مائی نیوس نے طبابت میں ایک قاعدہ جاری کیا تھا جس کا نام اُس نے نظامِ جسمانی رکھا۔ اُس نے جسم انسانی کو ایک کل قرار دے کر ثابت کر دیا کہ ہر ثقیل جسم کی کا نتیجہ ہے۔
(ب) لیگس (قانون) یہ افلاطون کی بڑی اعلیٰ درجہ تصنیف ہے۔ اُس میں اُس نے انسان خود بمقابلہ حکومت کے اصول پر بحث کی ہے اور یہ دکھایا کہ ہر شخص پر بادشاہ کے حقوق یکساں ہیں۔ یہ کتاب در اصل اُن تقریروں کا مجموعہ ہے جو اس بارہ میں افلاطون نے کی تھیں۔ اُس میں فصاحت اور شیریں بیانی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ اس کتاب سے ثابت ہوتا ہے کہ تحریری قواعد کے مجموعہ سے عقل مند آدمی بدرجہا بہتر ہے۔ در اصل یہ کتاب افلاطون کی

تھی اور صلح نامہ ایشتال سیڈرس مکمل ہوا تھا اس سفر سے واپس آکر اُس نے ایک بیت العلوم کھولا اور تعلیم دینے لگا۔

اتھینس کے اس قیام میں اُس نے پہلے سنہ ۳۸۵ قبل مسیح میں گارگیاس تصنیف کی۔ اور سنہ ۳۸۴ قبل مسیح میں جس سال کہ حکیم ارسطو پیدا ہوا اور جس نے افلاطون کا نام جنگ میں روشن کیا کریٹی کس تصنیف ہوئی۔

افلاطون نے اسکے بعد ایک اور کتاب لکھی جس کا نام میموسی ام ہے اور جو سنہ ۳۸۴ قبل مسیح ختم ہوئی اتھینس کا سپہ سالار اسماینس قتل کیا گیا تھا۔

اسکے بعد اُس نے فیڈو کو اور فیڈو کے بعد فیڈرس کو سنہ ۳۷۸ قبل مسیح میں تصنیف کیا۔ فیڈرس کے لکھنے کے بعد اُس نے ایپاک کو تصنیف کیا اور اس کتاب کی تصنیف اُس نے سنہ ۳۸۷ قبل مسیح میں شروع کی تھی اور سنہ ۳۶۸ قبل مسیح میں ختم کیا تھا اس کتاب کے تصنیف کرنے کے بعد اُس نے بیت العلوم میں طالب علموں کو تعلیم دینے کا کام بڑی سرگرمی کے ساتھ کیا۔ اور سنہ ۳۶۸ قبل مسیح میں دیو جانس اصغر شاہ سیراکوز کی تخت نشینی کے بعد اُس نے اطالیہ کا دوسرا سفر کیا۔ اُس کی غیر حاضری میں اُس کے مدرسہ میں حکیم ارسطو سنہ ۳۶۷ قبل مسیح میں آکر داخل ہوا تھا۔ ایک سال بعد ارسطو اس سفر سے واپس آیا اور پھر تعلیم کے کام میں لگ گیا۔ اور چار کتابیں اُس وقت تک تصنیف کیں۔ جبکہ وہ اطالیہ کے تیسرے سفر کو گیا اِن کتابوں کے نام یہ ہیں

تھی ٹی ٹس۔ پارمینائڈس۔ سوفسٹس۔ پولٹی کس۔

افلاطون نے اطالیہ کا تیسرا سفر سنہ ۳۶۱ قبل مسیح میں کیا تھا۔ مگر اس سفر سے وہ سنہ ۳۵۶ قبل مسیح میں واپس آگیا۔

تیسرے سفر سے واپس آکر اُس نے مندرجہ کتابیں لکھیں:۔

فلی بس۔ ٹیمی اس۔ کریٹیاس

اسکے بعد اُس نے مستقل طور پر اتھینس میں مقام کیا اور مشہور عالم کتاب "قوانین" کو تصنیف کرتا رہا۔ جب وہ اس کتاب کو تصنیف کر رہا تھا تو اُسے اجل نے آگھیرا اور اُس کا انتقال سنہ ۳۴۷ قبل مسیح میں ہو گیا۔

افلاطون کے بعد اُس کا شاگرد ارسطو اُس کا قائم مقام ہوا اور بیت العلوم

میں لوگوں کو تعلیم دینے لگا۔ اُس نے اُستاد کا نام خوب روشن کیا۔ اور بڑی
کوشش و جانفشانی سے اپنے فرائض ادا کرتا رہا۔

افلاطون بڑا شہ زور شخص تھا اور ایسا مستغنی المزاج تھا جس کی نظیر تاریخ
میں کمتر نظر آتی ہے۔ وہ صوفی مذہب رکھتا تھا اور اُس نے دیوتاؤں کی پرستش
کی پرواہ نہیں کی۔ حالانکہ لوگ اُسے یہ کہہ کر دھمکاتے رہے کہ اگر وہ دیوتا پرستی
نہیں کرے گا تو اُسے بھی زہر کا پیالہ پلایا جائے گا۔

افلاطون شہ زور شخص تھا۔ مگر اُس نے جنگ و جدل سے پرہیز کیا جو کہ
یونانیوں اور خصوصاً طاقتور یونانیوں کا خاصہ تھا نہ اُس نے اپنے زور کو کبھی بیجا
صرف کیا۔

افلاطون خلیق بھی بہت تھا اسی باعث ہر دم اُس کے پاس لوگوں کا مجمع
رہتا تھا اور وہ اُس کی باتوں اور تعلیم سے فائدہ اُٹھاتے رہتے تھے اُس کے پاس
دُور دور سے شائقین علوم آ کر تعلیم حاصل کرتے تھے۔

افلاطون ایک بڑا زبردست مدبر تھا جیسا کہ اُس کی تصانیف سے ثابت ہوتا
ہے لیکن امن کی زندگی پسند کرتا تھا۔ اس لئے اُس نے کبھی ملکی معاملات میں
حصہ لینے کی پرواہ نہیں کی۔

افلاطون نے علم النفس اور علم روح کو بڑی ہی جلا دی۔ وہ خود بھی تزکیہ
نفس اور تصفیہ قلب کا بڑا شائق اور عامل تھا۔

تمام شد

[illegible]

حیاتِ ارسطو

(یعنی)

یونان کے مشہور فلاسفر سکندر اعظم کے وزیر۔ افلاطون کے معزز شاگرد معلم اول حکیم ارسطو کے حالات زندگی جن کے پڑھنے سے ہزاروں بیش بہا نصائح اور قیمتی تجربے حاصل ہوتے ہیں۔ اور گھر بیٹھے آدمی آزمودہ کار بن جاتا ہے۔

مؤلفہ

منور خاں ساغر اکبرآبادی مترجم و لٹریری اسسٹنٹ بائیبل سوسائٹی لاہور

جسکو

بعد حصول جملہ حقوق دائمی از مؤلف

منشی رام اگروال بک مرچنٹ پروپرائیٹر اردو اخبار و مالک اردو اخبار مشین پریس لاہور نے

اپنے

مطبع اردو اخبار لاہور میں چھاپا

قیمت ۶/ چھ آنے

حیات ارسطو

یعنی

مختصر سوانح عمری

حکیم ارسطو سنہ ۳۸۴ قبل مسیح میں اسٹیگیرا میں پیدا ہوا تھا۔ اسٹیگیرا یونانیوں کی ایک نوآبادی تھریس میں واقع تھی +

جرمنی ایک عالم ولیم وان ہمبولٹ کی رائے ہے کہ اسٹیگیرا جو یونان خاص سے بہت فاصلہ پر واقع تھا۔ پس اسمیں پیدا ہونیکے باعث ارسطو کی تحریر میں وہ خوبی شیرینی اور لطف بھی نہیں پائی جاتی جو عام طور پر دوسرے یونانیوں کی تحریر میں موجود ہے +

اس امر میں کسی کو بھی شبہ نہیں ہے کہ ارسطو اس خاندان کا چراغ تھا جو خالص یونانی تھا خود ارسطو کی تحریرات سے کہیں نہیں پایا جاتا۔ کہ یونانی زبان کے سوائے کسی اور زبان سے واقف و آشنا تھا۔

ارسطو کا باپ نکوماخس مقدونیہ کے بادشاہ امائنٹس کے دربار میں ایک طبیب تھا۔ یہ امر یقینی ہے کہ ارسطو اپنے باپ کے ساتھ اکثر اس فرمانروا کے دربار میں جایا کرتا تھا۔ وہاں اسکی شناسائی اور تعارف بادشاہ کے بیٹے فلپ سے ہوگئی جو اسکا ہم عمر تھا +

ارسطو کی صغیرسنی میں مقدونیہ کی سلطنت میں خوشحالی کے آثار بالکل ہی نہیں پائے جاتے تھے۔ بلکہ ایک قسم کی تباہی سے۔ شاہ امائنٹس نے الیرین قوم کے ساتھ ایک جنگ کی جسمیں اُسے شکست فاش نصیب ہوئی۔ اور اسکی طاقت کو بڑا ہی صدمہ پہونچا۔ اس حالت کو دیکھتے ہوئے کسی کو بھی یہ خیال نہیں ہوسکتا تھا۔ کہ تھوڑے ہی دن بعد مقدونیہ مشرق میں اپنی فتوحات کا علم بلند کرکے بہت سی قوموں کو اپنا مطیع بنائیگا +

ارسطو کا باپ اسکیولاپیس کی نسل سے تھا۔ حکیم جالینوس نے لکھا ہے کہ اس نسل کے لوگ اپنی اولاد کو علم جراحی کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ جس طرح کہ اور خاندانوں کے لوگ اپنے لڑکوں کو لکھنے پڑھنے کی تعلیم دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ارسطو نے علم ترکیب اجسام حیوانات نباتات میں بیحد ترقی حاصل کی جس کا پتہ اسکی تصانیف سے ملتا ہے اس نے اس علم کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے +

اگرچہ ارسطو کو علم ترکیب اجسام حیوانات نباتات کی تعلیم اپنے باپ سے ورثہ میں ملی تھی۔ اور ممکن ہے کہ اس نے ابتدا میں اس علم سے دلچسپی رکھی ہو۔ اور چھوٹے چھوٹے حیوانات پر عمل جراحی کی مشق کی ہو۔ لیکن طبعاً اسے فلسفہ سے زیادہ دلچسپی اور انس تھا۔
جب ارسطو ۱۷ سال کا ہوا تو ۳۶۷ قبل مسیح میں اس کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ اسوقت ارسطو کے محافظ و سرپرست پروکسینس Proxenus نے جو اتارنیوس Atarneus کا رہنے والا تھا۔ اسے ایتھنز (مدینۃ الحکما) میں جو علم و فضل کا مسکن تھا۔ اس کی تعلیم کی تکمیل کے لئے روانہ کیا +
ارسطو نے ایتھنز میں پورے بیس سال قیام کیا اور اس مدرسہ میں جس کی بنا حکیم افلاطون نے باغ ایکڈیمس Academus میں قائم کی تھی۔ فلسفہ کی تعلیم حاصل کرتا رہا +
ارسطو کے باپ نے اسقدر جائداد یا روپیہ اپنی وفات پر چھوڑا تھا کہ ارسطو کو فکر معاش سے فراغت حاصل رہی۔ تاہم بھی اس نے حصول علم و دانش میں بڑی سرگرمی اور جوش کا اظہار کیا۔ جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں کمتر ملتی ہے +
ارسطو مدرسہ بھر میں سب سے زیادہ محنتی اور سنجیدہ مزاج طالب علم تھا۔ خود حکیم افلاطون اسے اپنے مدرسہ کا گل کہا کرتا تھا۔ ارسطو بیحد تیز طبیعت اور ذہین طالب علم تھا +
ارسطو کی محنت و جفاکشی کا اندازہ اس سے خوب ہو سکتا ہے کہ جب وہ سوتا تھا تو اپنے ہاتھ میں ایک گھنٹی باندھ لیا کرتا تھا۔ اور ہاتھ کو ایک طشتری میں رکھدیتا تھا۔ جب اسکا ہاتھ اس طشتری سے نیچے کھسک جاتا تو گھنٹی بجنے لگتی تھی۔ جسکے باعث اسکی آنکھ کھلجاتی تھی۔ یہ اس نے محض اس لئے کیا تھا کہ اسے مطالعہ اور تحصیل علم کے لئے زیادہ وقت مل سکے +
ارسطو کے ایام طالب علمی میں یونان میں افلاطون کے فلسفہ کا بڑا زور شور تھا کیونکہ وہ حکیم سقراط کے مسائل کا لب لباب تھا +
ارسطو کی تصانیف سے صاف پتہ لگتا ہے کہ وہ بیس سال تک افلاطون کے مدرسہ میں تحصیل علم کرتا رہا ان ہی تصانیف سے افلاطون کی تقریری تعلیم جو وہ درس کے طور پر دیا کرتا تھا اور نیز اس کے جملے اور خیالات کثرت سے موجود ہیں۔
ارسطو کی تصانیف۔ فلسفہ منطق۔ فلسفہ اخلاق۔ فلسفہ تمدن اور فلسفہ الہیات پر مشتمل ہیں۔ اس نے اپنی تصانیف میں نہ صرف افلاطون اور سقراط کی تعلیم کا لب لباب جمع کر دیا تھا۔ بلکہ تمام قدیم حکما یونان کی تعلیم کا بھی۔

اکثر ارسطو پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ افلاطون کا ایک ناشکر گذار شاگرد تھا۔ لیکن اس کی بنیاد صرف اسقدر ہے کہ اس نے افلاطون کے فلسفانہ خیالات کی تعلیم میں اپنی زور طبیعت اور آزاد مزاجی کا بھی اظہار کیا قدرتی طور پر اسکا میلان طبع ایک اور ہی طرف کو تھا۔ خود زمانہ مابعد کے حکماء کا قول ہے کہ انسان یا تو افلاطونی پیدا ہوتا ہے اور یا ارسطا طالیسی۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اسکی طبیعت یا تو افلاطون کی سی ہوتی ہے اور یا ارسطو کی سی۔ اور اگر یہ بات درست ہے تو ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑیگا کہ ارسطو کی طبیعت قدرتی اور پیدائشی طور پر اپنے استاد افلاطون کی طبیعت سے نہیں ملتی۔ اور اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے یہ بھی ماننا پڑیگا۔ کہ وہ ایک ناشکر گذار طالب علم نہیں تھا۔ حالانکہ حقیقت دونوں کے خیالات اور تعلیم میں پائی جاتی ہے تاہم فرق اتنا ہے کہ ایک نے حقیقت کو ایک بات میں ڈھونڈا۔ اور دوسرے نے دوسری میں +

افلاطون ان باتوں کا دلدادہ تھا جن کا انکشاف دنیا میں ہرگز نہیں ہوسکتا اور جو صرف قوت متخیلہ کے ذریعہ حل ہوسکتی ہیں۔ لیکن اس میں شبہ کو مطلق گنجائش نہیں ہے کہ علم الٰہی کی تعلیم دینے والے فیلسوفوں میں وہ ایک نہایت زبردست اور سب سے پہلا فلسفی ہے۔ اس کی طبیعت میں ایک حد تک مذاق شاعری اور خیالی باتوں کا ذوق وشوق بھی پایا جاتا ہے +

ارسطو کی کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی طبیعت کا خاصہ ان باتوں کے برعکس تھا۔ اس نے شاعری اور قوت خیال کو اپنے سے دور ہی رکھا بلکہ حقیقت کی طرف زیادہ ڈھلا رہا۔ حالانکہ اس نے ان باتوں کو ضرور تسلیم کیا کہ روح غیر فانی ہے۔ خدا کی فطرت کیا ہے۔ لیکن جہانتک ہوسکا وہ ان باتوں سے ذرا کنارہ کش ہی رہا۔ اور ان پر اس نے عاقلانہ مگر حاسدانہ رائے قائم کی +

ارسطو کی خواہش یہ تھی کہ علم کو اس طریقہ میں ترتیب دینا چاہیے کہ وہ ایک عام اور باقاعدہ اصول کی صورت اختیار کرے۔ اس بات کو وہ اور تمام باتوں سے زیادہ ضروری اور مفید سمجھتا تھا۔ اس کی منشا تھی کہ ایسے اصول سے آیندہ زمانہ کے محقق علم سائنس کی بنیاد ڈال سکیں گے +

اس کی طبیعت بالکل سائنس والوں کی سی تھی۔ اسی لئے اس نے اپنے اصول اور تعلیم میں شاعری اور دلکش طرز بیان کو روا نہیں رکھا۔ بلکہ اصل حقیقت کو افلاطون اس حقیقت کا طالب تھا جو سائنس کی حقیقت سے بالاتر تھی مگر ارسطو ایک باقاعدہ اور محدود تجربہ بالمشاہدہ کا مشتاق تھا +

اس اختلاف طبع کو دیکھتے ہوئے حیرت ہوتی ہے کہ دو شخص جنکی طبیعت ایک دوسرے کے خلاف واقع ہوئی تھی۔ کس طرح پر استادی اور شاگردی کے رشتہ میں منسلک رہے اسمیں کچھ شک نہیں ہے کہ ایک عرصہ تک ارسطو کی طبیعت کا اظہار نہیں ہوا۔ اسی باعث خود افلاطون اسے اپنے مدرسہ کی زینت بتاتا رہا۔ خود ارسطو کی ابتدائی فلسفانہ تحریر نہیں ہے۔ جو مکالموں کی صورت میں ظاہر ہوئی تھیں۔ افلاطون کے خیالات کی تقلید پائی جاتی ہے۔ اور وہ ایک مدت تک اسی راستہ پر چلا گیا۔ لیکن اس مدت بعد اسکے قوائے۔ اس کا علم اور اس کے طریقے فلسفہ کو ایک ۔ ورہی طریقہ میں دنیا کے روبرو پیش کرنے کے لئے آمادہ ہوتے رہے ۔

جب ارسطو ان تمام باتوں کو اچھی طرح سمجھ گیا۔ جو افلاطون نے دنیا کے سامنے پیش کی تھیں۔ تو اُسے اسکے خیالات کے ساتھ ہمدردی باقی نہ رہی بلکہ اسکی طبیعت انُ باتوں کے اظہار کے لئے بے چین ہونے لگی۔ جو اس کے خیال میں فرضی اور خیالی تھیں حکیم پروکلس Proclus نے لکھا ہے۔ کہ اس نے ایک موقع پر بڑے زور کے ساتھ کہا تھا۔ کہ وہ افلاطون کے مسئلہ تصور کے بالکل خلاف ہے۔ اور خیالی دنیا وہم کی دنیا ہے ۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ افلاطون آئی ڈیئل ازم Idealism کا معتقد تھا۔ یعنی اس بات کا کہ دنیا محض وہم و خیال اور دھوکا ہے۔ لیکن برعکس اس کے ارسطو ریل ازم Realism کا یعنی اس بات کا کہ دنیا کی حقیقت کوئی فرور ہے۔ دراصل وہ کوئی حقیقی شے ہے نہ کہ دھوکا ۔

افلاطون کی زندگی ہی میں ارسطو نے آزاد مزاجی کا اظہار کر دیا تھا۔ افلاطون نے اپنی تصانیف میں علم کلام کا بڑی حقارت سے ذکر کیا ہے۔ لیکن اس کی رائے کے خلاف ارسطو نے اُسے بڑی محنت اور کوشش کے ساتھ حاصل کیا۔ اس نے علم کلام کو اس اصول پر ڈھالا۔ کہ اس نے سائنس کی شکل اختیار کر لی۔ اسکی رائے یہ تھی کہ علم کلام ایک شہری کے لئے اپنے بچاؤ۔ اور خود حفاظت۔ علم تصوف کے اظہار اور حقیقت کے اظہار کے لئے ایک عمدہ چیز ہے ۔

ارسطو کے زمانہ میں ایتھنز میں سب سے بڑا مدرسہ علم کلام کا مشہور فاضل عیسٰوکریٹیس کا تھا۔ استاد اسوقت کوئی ۸۰ سال عمر کو پہونچ چکا تھا۔ اس کے مدرسے یونان کے کل حصوں سسلی اور پونٹس تک سے شائقین علم پڑھنے آتے تھے حقیقی یا پیاسے طالب علمی کرتے تھے سسلی ہر شخص کوئی ۔۔ اٹھنیکی دیتا تھا وسادڑ کی برابر ہیں۔

۳۴ پونڈیا .. ۲ روپیہ سکہ ہندوستانی کے) اس کے شاگردوں میں سے بہت سے لوگ بڑے مقرر۔ مدبر۔ سپہ سالار۔ مورخ اور فلسفی گذرے ہیں +

جس طرح اور عالموں نے ایسوکریٹس Isocrates کی مخالفت کی تھی اسی طرح ارسطو نے بھی۔ اس نے ایک مدرسہ اس کے مدرسہ کی مخالفت میں جاری کیا تھا۔ اور بعد میں علم کلام کے اوپر ایک رسالہ بھی لکھا تھا +

۳۴۷ قبل مسیح میں افلاطون کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد ہی ارسطو اور ایک ہم مکتب دوست زینوکریٹس دونوں ایتھنز کو خیرباد کہکر ایشیائے کوچک میں مقام اٹارنیوس میں جا رہے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ افلاطون کے بعد افلاطون کے مدرسہ کی تعلیم کا سہرہ افلاطون کے بھتیجے اسپیوسی پس Speusippus کے سر باندھا گیا۔ اور یہ شخص ارسطو سے علم و فضل میں کہیں گھٹ کر تھا +

اٹارنیوس کو قیام گاہ بنانے کیلئے چند اسباب نظر آتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ ارسطو کے محافظ و ولی پروکسی نس کا وطن تھا۔ دوسرے یہ کہ وہاں ہرمیئس Hermeias حکمرانی کرتا تھا۔ جو ایک بڑا روشن خیال شخص تھا اور جو ارسطو اور زینوکریٹس دونوں کو دوست رکھتا تھا۔

ہرمیئس کے حالات بھی عجیب و غریب ہیں کہتے ہیں کہ وہ اٹارنیوس کے سابق فرمانروا یوبولس کا غلام تھا۔ یہ فرمانروا بڑا ہی ستمگر اور ظالم تھا۔ ہرمئس غلام کی حیثیت سے بڑھتے بڑھتے وزیر ہوگیا۔ اور وزیر سے بادشاہ بن بیٹھا۔ اس نے حکمرانی میں فیاضی اور سخاوت کو رواج دیا۔ وہ فلسفانہ مذاق رکھتا تھا۔ اس نے ایتھنز آکر افلاطون کی درس اور تدریس سنی تھیں +

جب ارسطو اور زینوکریٹس ہرمئس کے دربار میں پہونچے تو اس نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور سر آنکھوں پر جگہ دی۔ یہ دونوں وہاں تین سال تک رہے۔ اس نے اپنی بھتیجی پیتیاس Pythias کے ساتھ ارسطو کی شادی کردی +

ارسطو کی زندگی کا یہ زمانہ نہایت خوشگوار تھا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد اُسکے مہربان و مربی کو ایک یونانی افسر نے جو شاہ فارس کا ملازم تھا قتل کردیا۔ ارسطو نے اس کے قتل کے بعد ایک نظم اسکی تعریف میں لکھی تھی جسمیں اُسنے اُسے ہرکولیز کا رتبہ عطا کیا تھا +

ہرمئیس کی وفات کے بعد دونوں دوستوں کو اٹارنیوس کی سکونت ترک کرنی پڑی۔ زینوکریٹس تو ایتھنز چلا آیا۔ مگر ارسطو اپنی بیوی کو لیکر مٹی لینی Mitylene میں جا بسا یہاں اس نے دو تین سال قیام کیا۔ جس کے بعد مقدونیہ کے بادشاہ فلپ

(فیلقوس) نے اسے اپنے بیٹے سکندر کی تعلیم کے لئے مقدونیہ بلا لیا +
ارسطو نے اپنے جلیل القدر شاگرد کو جو بعد میں فاتح عالم ہوا۔ علم کلام۔ یونانی علم ادب اور ریاضی کی تعلیم دی۔ اس کے سوائے اور کچھ حال سکندر کی تعلیم کا معلوم نہیں ہوا کیونکہ اس کا کچھ بھی پتہ نہ تو ارسطو کی تصانیف سے چلتا ہے۔ اور نہ کسی اور جگہ سے البتہ اسکی ذات و صفات کا اسکے شاگرد پر بعید اثر پڑا ہو گا +
سکندر کی طبیعت سائینس یا فلسفہ پسند واقع نہ ہوئی تھی۔ بلکہ دلیر جنگ جو اور عالی حوصلہ وہ ارسطو کی ایام شاگردی میں بھی اپنے باپ کا ہاتھ انتظام امور سلطنت میں بٹاتا رہتا تھا +
مقدونیہ کے قیام میں ارسطو کو بہت فرصت رہتی تھی۔ جسے وہ اپنی تصانیف میں صرف کرتا تھا۔ وہ ۳۳۶ ق قبل مسیح تک وہاں رہا اسی سال فیلقوس قتل کیا گیا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا سکندر اعظم مقدونیہ کا بادشاہ بنایا گیا +
ارسطو نے مقدونیہ کے قیام میں شاہ فیلقوس سے اسٹیگیرا کے ازسرنو آباد کرنے کی اجازت حاصل کی اور اسے آباد کیا۔ اسٹیگیرا کو ۳۴۹ ق قبل مسیح میں جنگ اولن تھیا میں برباد کر دیا گیا۔ اس نے اس شہر کے رہنے والوں کو مختلف مقاموں سے بلایا اور ان کے لئے قوانین مرتب کئے۔ اسکی اس یادگار میں اسٹیگرا میں ہر سال ایک جشن منایا جاتا تھا +
ارسطو فیلقوس کی موت کے ایک سال بعد تک یا تو پیلا میں مقیم رہا اور یا اسٹیگیرا میں۔ لیکن سکندر کی استادی اور اتالیقی سے علیحدہ رہا۔ کیونکہ اس وقت سکندر امور سلطنت کے اہتمام اور انتظام میں اور مشرقی ممالک کے فتح کرنے کی فکر میں سرتاپا غرق تھا +
ارسطو نے اپنی عمر کے پچاسویں سال میں فلسفہ اور سائنس کے متعلق تصانیف ملک میں پیش کیں +
جب ارسطو ایتھنز میں واپس آیا۔ تو اس وقت افلاطون کا جانشین فوت ہو چکا تھا۔ اس کی جگہ افلاطونی مدرسہ کا معلم ارسطو کا دوست زینوکریٹس تھا۔ ارسطو نے اس کے مقابلہ میں ایک مدرسہ قائم کیا۔ اس مدرسہ کے قائم کرنے کی غرض و غایت تھی کہ تحقیقات کی جائے۔ اور جو کچھ بات تحقیقات سے معلوم ہو اسے قاعدہ اور اصول اور ترتیب کا لباس پہنایا جائے +
اس مدرسہ کو اس نے اپنی شہرت بڑھانے اور اپنے خیالات کی اشاعت کے

سے قائم کیا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس نے جتنی تصانیف کیں وہ اس معلمی کے زمانہ
میں کیں۔ اگر یہ بات درست ہے۔ تو جو باتیں یا مضامین اس نے لکھے ان سب
کی تعلیم اس کے مدرسہ میں ضرور دی گئی ہوگی +

ارسطو کی تصانیف سے ایک بات اور بھی معلوم ہوتی ہے۔ اسکی دلی منشا یہ
تھی کہ جسقدر علوم اسکے زمانہ تک ظہور میں آچکے تھے۔ ان کا ایک لغت تیار کیا جائے
اور ہر علم کو قاعدہ کا لباس پہنایا جائے۔ اسی لئے اس نے علم اخلاق۔ علم سیاست
مدن علم کلام۔ علم عروض اور علم الہی کو ایک نئے قالب میں ڈھالنا شروع کیا۔ اور
علم تحقیق علم ترکیب ... تاریخ نباتات اور طبیعی فلسفہ پر نئے اصول بنانے شروع کئے +
اگرچہ بہت سی باتوں کو وہ اس کام کے شروع کرنے سے پہلے ہی مکمل کر چکا تھا۔
تاہم اس زمانہ میں بھی جب ان کا پھیلاؤ پھیل رہا تھا وہ مزید تحقیقاتوں سے باز نہ رہا
مگر اس کام میں اس کے شاگردوں نے اس کا بہت کچھ ہاتھ بٹایا۔ جس کا پتہ اس کی
تصانیف سے چلتا ہے +

ارسطو ایتھنز کا شہری نہ تھا۔ بلکہ وہاں ایک غیر ملک کے رہنے والے یعنی اجنبی
کی حیثیت سے شمار کیا جاتا تھا۔ اسی باعث اس نے وہاں کے معاملات میں جو
پبلک سے تعلق رکھتے تھے کوئی حصہ نہیں لیا +

اس نے دوسری بار ایتھنز میں کوئی ۱۳ سال قیام کیا۔ اس عرصہ بھر وہ اپنے
سکول کی تعلیم اور اپنی تصانیف کی تکمیل میں مصروف رہا۔ اس کی تحریرات سے معلوم
ہوتا ہے کہ یہ زمانہ اس کے لئے امن مگر جفاکشی کا تھا۔ اسے وہ دل سے پسند کرتا تھا +
علاوہ تعلیم اور تصنیف کے اس نے اس قیام میں سکندر اعظم اور انٹی پیٹر Antipater
سے جو اس کی غیر حاضری میں مقدونیہ میں اس کے نائب السلطنت کی حیثیت سے
کام کرتا رہا۔ برابر نامہ و پیغام جاری رکھا۔ اینٹی پیٹر کا بیٹا کیسانڈر Cassander
بھی اس کے مدرسہ کا طالب علم تھا +

ارسطو سے سکندر اعظم بعد میں ناخوش ہوگیا۔ سکندر اعظم اپنی فتوحات ایشیائی
آب وہوا سے بے حد متاثر ہوا۔ یہانتک کہ وہ آزادی کا بالکل مخالف ہوگیا جو یونانیوں
کا ذاتی جوہر سمجھا جاتا تھا۔ اسے یہ بھی گوارا نہ ہوتا تھا کہ کوئی شخص اسکی رائے میں کسی
قسم کا دخل دے۔ اسی باعث اس نے انٹی پیٹر سے جھگڑا کیا اور کینس تھینز Callisthenes
ارسطو کے فصیح البیان مقرر کو قتل کرا دیا۔ یہانتک کہ ارسطو سے اس کی آزاد مزاجی کے
باعث سخت ناخوش ہوگیا +

ارسطو ایتھنز میں سکندر اعظم کا منظور نظر اور مقبول ہو کر گیا تھا۔ سکندر کی طرف سے ایک جماعت ایتھنز کا انتظام کیا کرتی تھی۔ جس کا سب سے بڑا حامی ارسطو سمجھا جاتا تھا۔ سکندر اعظم کے مظالم اسکی طرف منسوب کئے جاتے تھے۔ جو بذات خود ارسطو کو پسند نہ تھے۔

۳۲۴ء قبل مسیح میں سکندر اعظم نے ایک فرمان یونان کے شہروں کے نام جاری کیا اور ایک نقیب بھیجا کہ وہ شہر بشہر اسکا اعلان کر دے۔ اس نے یہ فرمان اولمپک کھیلوں کے جشن کے موقعہ پر پڑھوانا پسند کیا۔ اس فرمان کا منشا یہ تھا کہ جو لوگ یونان سے جلاوطن کر دیئے گئے ہیں وہ سب واپس بلائے جائیں جس شہر کے باشندے اس حکم کی نافرمانی کرینگے۔ ان کے شہر کو لشکر کشی کر کے تباہ و برباد کر دیا جائیگا +

یہ فرمان یونانیوں کی طبیعت اور مزاج کے بالکل خلاف تھا۔ ایسے ارسطو کا داماد ایتھنز لیکر گیا تھا۔ لوگ اس کے باعث نہ صرف سکندر اعظم ہی سے ناخوش ہو گئے بلکہ ارسطو سے بھی۔ یہانتک کہ وہ اُسے اپنا دشمن و بدخواہ سمجھنے لگے +

۳۲۳ء قبل مسیح میں جبکہ یونان کی تمام ریاستیں بڑے فکر و اندیشہ کیساتھ سکندر اعظم کی مہمات اور فوج کشیوں کو دیکھ رہی تھیں اس وقت انہیں یکایک یہ خبر ملی۔ کہ سکندر اعظم بخار میں مبتلا ہو کر بابل کے مقام فوت ہو گیا +

سکندر اعظم کی وفات کے بعد ہی ارسطو کے رتبہ میں فرق آگیا۔ جو جماعت کہ مقدونیہ کے منتظموں کی جماعت کے خلاف تھی۔ اس نے زور باندھا۔ سکندر اعظم کے حامی ایتھنز کو چھوڑ کر دوسرے مقامات کو بھاگ گئے +

اسوقت ارسطو دشمنوں کے بیچ میں اس طرح محصور تھا جس طرح کہ زبان بتیس دانتوں کے بیچ میں ہوتی ہے۔ اس کے دشمنوں میں تین قسم کے لوگ شامل تھے +

(۱) علیشو کریٹس کے دوست جس سے ارسطو نے مقابلہ کیا تھا +

(۲) افلاطون کے پیرو جو ارسطو کو اس وجہ سے برا جانتے تھے۔ کہ اس نے افلاطون کی رائے کی مخالفت کی تھی +

(۳) وہ لوگ جو مقدونیہ والوں کی اس جماعت سے ناخوش تھے جس کے ہاتھ میں ایتھنز کا انتظام تھا۔ اور جس کا ارسطو حامی سمجھا جاتا تھا۔

بدگمانیاں جو مدت سے دبی پڑی تھیں۔ اور اس وقت جبکہ ارسطو کے سر پر سکندر اعظم کا ہاتھ تھا سر نہیں اٹھا سکتی تھیں۔ انہوں نے سکندر اعظم کی وفات کے بعد سرکشی اختیار کی۔ اس کے دشمنوں نے اسے نقصان پہونچانا چاہا۔ اور اس کے خلاف ایک الزام قائم کیا گیا +

ذکر ہے کہ یہ الزام یوریمیڈن [illegible] امام اور ایفورس [illegible] نے جو ڈیموکریٹس کا شاگرد تھا مرتب کیا تھا۔ یہ الزام ذیل کی باتوں کی بنیاد پر لگایا اور تشکیل کیا تھا

(۱) اس نظم سے جو ارسطو نے ہرمیئس کی تعریف میں لکھی تھی۔ اس نظم میں ارسطو نے اپنے ممدوح کو دیوتاؤں کا رتبہ عطا کیا تھا +

(۲) ہرمیئس کے اس بت کے باعث جو ارسطو نے ڈیلفی کے مندر میں اس کی یادگار کے لئے نصب کیا تھا۔

(۳) اس کی تصانیف سے جو یونانیوں کے مذہب کے خلاف تھیں +

اگرچہ یہ الزام فی الحقیقت ایک خفیف الزام تھا۔ اس میں سچائی نام کو نہ تھی بلکہ وہ ہر حالت میں نظر انداز کئے جانے کے قابل تھا۔ لیکن اس کا فیصلہ ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں تھا جو ارسطو کے مخالفوں کے ہم خیال تھے۔ اگر یہ الزام کسی نہایت ہر دل عزیز یا پسندیدہ شخص کے اوپر بھی لگایا جاتا تو اس کی بھی بریت کی امید نہیں ہو سکتی تھی — چہ جائیکہ ارسطو کی جس کے خلاف ایتھنز کا سارا شہر ڈٹا ہوا تھا +

اگرچہ ارسطو فیاض مزاج اور دوستی پسند تھا۔ لیکن عوام الناس سے وہ الگ تھلگ ہی رہتا تھا کیونکہ اُسے مطالعہ اور تصانیف ہی سے فرصت نہیں ہوتی تھی۔ ایک اور بات بھی اس کی کنارہ کشی کی یہ تھی کہ عالی دماغ عوام الناس سے نہیں ملتے جلتے۔ اس لئے ارسطو وہاں ہر دل عزیز بھی نہ تھا +

یونان میں قاعدہ تھا کہ اگر کسی قسم کا الزام کسی شخص پر لگایا جاتا تو اُسے اس کے فیصل ہونے سے پہلے اس شہر کو چھوڑنا پڑتا تھا۔ ارسطو نے بھی اس قاعدہ کے مطابق ایتھنز کو چھوڑ دیا اور کالکس [illegible] کو چلا گیا۔ اور یوں جلا وطنی اختیار کر کے اہل ایتھنز کی مزید دست برد سے بچ رہا +

کالکس وہی شہر تھا۔ جہاں کسی زمانہ میں ارسطو کے اجداد رہا کرتے تھے۔ ارسطو کی وہاں کچھ جائداد بھی موجود تھی۔ یہ جگہ اس کی حفاظت کے لئے موزون بھی تھی کیونکہ اُس وقت وہاں مقدونیہ کی کچھ فوج رہتی تھی۔ وہاں اُس نے صرف تھوڑے ہی عرصہ تک قیام کرنا چاہا +

ارسطو خوب اچھی طرح واقف تھا کہ مقدونیہ کی سپاہ تھوڑے ہی عرصہ بعد اہل ایتھنز کی سرکشی اڑا دیگی۔ چونکہ اُسے جلد واپس جانے کی توقع تھی۔ اس لئے اس نے اپنا کتب خانہ اور مدرسہ تھیوفریس ٹس [illegible] کی سپرد کر دیا۔ اور خود

کالکس چلا آیا تھا ۔

ارسطو کا ارادہ تھا کہ جونہی ایتھنز میں امن وامان ہو جائے تو واپس چلا جائے اور
پھر اپنی تصانیف کے شغل میں مصروف ہو جائے ۔ اس کی یہ آرزو پوری ہوئی لیکن
ایک سال نہ گزرنے پایا تھا کہ وہ بیمار ہو گیا اور ۳۲۲ قبل مسیح میں کالکس کے مقام
اس دار فانی سے اٹھ گیا ۔

ارسطو نے ۶۳ سال کی عمر میں انتقال کیا تھا ۔

کہتے ہیں کہ اس نے اپنی زندگی کا خاتمہ زہر کھا کر کر لیا تھا ۔ مگر یہ بات سراسر لغو اور
غلط ہے ۔ کیونکہ اس کے اوپر کوئی ایسی مصائب نہ پڑی تھیں جن سے اسے زہر
کھانے اور اپنی جان سے عاری آنے کی ضرورت پڑی ہو ۔

معتبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ اس کی موت کا باعث بدہضمی تھی ۔ اور یہ سبب
قرین قیاس ہے ۔ کیونکہ وہ تصانیف میں بیحد مستغرق رہتا تھا ۔ ممکن ہے کہ اس کے
باعث وہ بدہضمی کے مرض میں مبتلا ہو گیا ہو ۔

ارسطو نے ایک وصیت بھی لکھی تھی ۔ اس میں اس قدر جائداد کا ذکر ہے جس
کی قیمت اس زمانہ میں ۔۔۔۔ روپیہ قرار دی جاتی ہے ۔ اس وصیت میں اس نے
نکانو ۔ [illegible] کو اپنی بیٹی کے ساتھ شادی کرنے کی ہدایت کی تھی ۔

ارسطو کے ایک بیٹا بھی تھا جس کا نام نکوماخس [illegible]
تھا ۔ یہ دوسری بیوی سے پیدا ہوا تھا جو اسٹیگیرا کی رہنے والی تھی ۔ اور جس
کا نام ہرپلیس تھا ۔

وصیت میں یہ بھی لکھا تھا کہ نکانور اس کے بیٹے نکوماخس کا سرپرست رہے
اور وہ اس کی دوسری بیوی ہرپلیس کو نان و نفقہ دیا کرے ۔

وصیت میں تیسری ہدایت یہ تھی کہ فلاں فلاں غلاموں کو اس اس قدر روپیہ
دیکر آزاد کر دیا جائے ۔ اور جو غلام نابالغ ہیں ۔ ان کی پرورش کی جائے ۔ مگر جب وقت وہ
بالغ ہو جائیں ۔ اور آزاد ہونا چاہیں تو انہیں آزاد کر دیا جائے ۔

وصیت میں چوتھی ہدایت یہ تھی ۔ کہ اس کی پہلی بیوی کی ہڈیاں اس کی قبر کے
پاس دفن کی جائیں ۔ اور زیوس دیوتا اور ایتھنی دیوی کے چار عمدہ بت نصب کئے
جائیں ۔

ارسطو پر لوگوں نے چند الزام لگائے ہیں ۔ مگر وہ پایہ ثبوت کو نہیں پہنچے ۔ اور
اس میں تو کسی کو بھی شبہ نہیں ہے ۔ کہ اس نے ایک بڑی عزت کی زندگی بسر کی اور

اس کا چال چلن داغ و دھبے سے مبرا رہا۔ مزید برآں جب ہم اس بات پر نظر ڈالتے ہیں کہ اس نے ایسے ایسے مفید کام کیے جن کو لوگ آج تک صدیاں گذرنے پر بھی تسلیم کرتے اور ان کے ثناخواں ہیں۔ تو ہمیں لامحالہ یہی کہنا پڑتا ہے کہ وہ بنی نوع انسان کا شفیق اور مہربان اور ہمدرد تھا +

نوعیت تصانیف

ارسطو کی تصانیف کی ایک فہرست اس وقت موجود ہے۔ جسے اسکندریہ کے کتب خانہ کے ناظم نے تیار کیا تھا۔ اور جس میں ان تمام کتابوں کے نام درج ہیں جو اس کتب خانہ میں موجود تھیں۔ اس فہرست میں ارسطو کی تصانیف سے ۱۴۶ کتابیں پائی جاتی ہیں لیکن حیرت کا مقام ہے کہ جو کتابیں ارسطو کی آج کل پائی جاتی ہیں وہ ان کتابوں سے مختلف ہیں۔ جو اس فہرست میں درج ہیں۔

کتب خانہ اسکندریہ کی فہرست میں جسقدر کتابیں ارسطو کی ہیں وہ سب قریب قریب ضائع اور گم ہو چکی ہیں صرف چند ایک پائی جاتی ہیں۔ اور وہ ضرب الامثال یا انتخاب کی صورت ہیں جنہیں مختلف مصنفوں نے اپنی تصانیف میں درج کیا ہے۔ یہ بات ہر طرح پر ثابت ہوتی ہے کہ وہ کتابیں جن کا ذکر کتب خانہ اسکندریہ کی فہرست میں ہے اور ہی تھیں۔ اور ان چالیس کتابوں سے جو آجکل یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ اور ارسطو سے منسوب کی جاتی ہیں بالکل مختلف تھیں +

قیاس کی بناء پر یہ رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ کتب خانہ اسکندریہ کی فہرست میں جو ارسطو کی وفات کے ۱۰۰ سال بعد مرتب کی گئی تھی۔ فہرست بنانے والوں نے ارسطو کی صحیح تصانیف کے نام درج کئے ہوں گے۔ اور چونکہ آجکل وہ کتابیں دستیاب نہیں ہوتیں۔ اسلئے یہی خیال کیا جاتا ہے کہ ارسطو کی تمام تصانیف ضائع ہو چکی ہیں۔ اور جو کتابیں اس وقت یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہیں وہ اس کی اصلی تصانیف نہیں ہیں +

خیر کچھ ہی سہی اب ہم اُن ہی کتابوں کو جو آجکل دستیاب ہو تی ہیں۔ اور ارسطو کی طرف منسوب کی جاتی ہیں اس کی اصلی تصانیف تسلیم کرتے ہیں۔ اور انہی کی نسبت علماء سلف و حال کی رائیوں اور خیالوں کا اعادہ اور تذکرہ کرتے ہیں +

جیسا کہ ہم آگے بیان کر چکے ہیں۔ ارسطو کی زندگی تین حصوں میں منقسم ہے +

(۱) اس کی ایتھنز کی پہلی سکونت جو ۱۷ سال سے ۳۷ سال تک کا زمانہ ہے +

(۲) اس کی سکونت جو ایتھنز کے باہر رہی مثلاً اٹارنیوس - سنی لیوی - پیلا - اسٹیگیرا اس میں اس کی عمر کا وہ زمانہ ہے جو ۳۷ سال سے لیکر ۵۰ سال تک رہا +

(۳) اس کی ایتھنز میں دوسری سکونت جو ۵۰ سال کی عمر سے لیکر ۶۲ سال تک ہے +

ہم ان تینوں حصوں کو تین دور کے نام سے یاد کرینگے - یعنی پہلا دور - دوسرا دور - تیسرا دور +

پہلے دور کی تصانیف وہ ہیں جو اس نے تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد لکھی تھیں ان میں سب مکالمے ہی مکالمے ہیں - اور افلاطون کے مکالمے سے بالکل ہی مختلف ہیں - ان میں علم کلام کی چاشنی پائی جاتی ہے - اور وہ عوام الناس کے پڑھنے کے قابل ہیں - ان میں ارسطو نے افلاطون کے مسئلہ تصور پر یعنی یہ کہ دنیا محض دھوکا اور وہم و خیال ہے - اعتراض کیا ہے - فلسفہ پر قلم اٹھایا ہے - اس سے لوگوں کو آشنا بنانے کی کوشش کی ہے - علم تمدن کی مختلف باتوں کو لوگوں کے دل و دماغ کے سامنے پیش کیا ہے - اخلاقی نیکی پر رائے قائم کی ہے +

دوسرے دور کی تصانیف میں جو اس نے مدرسہ سے علیحدہ ہو کر لکھی تھیں - اور ایتھنز سے جدا رہ کر مکمل کی تھیں - اس دور میں اسے اطمینان - آرام و آسائش اور امن چین نصیب رہا - اور مختلف علوم پر غور و خوض کرنے کا اچھا موقع ملتا رہا - اس دور میں اس کی دماغی قوائے کا ارتقاع اور نشو و نما اچھی طرح ہوگیا - اس نے فلسفہ پر کامل غور و خوض کرکے اسے سائنس کا ہراول یا پیش خیمہ بنا لیا - اور جب وہ ایتھنز واپس آیا - تو اس نے عوام الناس کے روبرو پیش کیا - اور ایک مدرسہ کے ذریعہ ان کی بڑی تندہی کے ساتھ اور کھلم کھلا تعلیم دینے اور اشاعت کرنے لگا - اس دور میں اس نے یا تو بہت سی کتابیں تصنیف کیں - اور یا ان کے لئے مصالحہ فراہم کیا +

تیسرا دور وہ ہے جس میں اس کی عقل و خرد اور قوائے دماغی بالکل پختہ ہو چکے تھے - اس دور میں اس نے سائنس اور فلسفہ کا ایک لغات جسے دائرۃ المعارف کہتے ہیں تیار کرنا شروع کیا - اس دور کی تصانیف میں سے بہت سے رسالہ نامکمل ہیں اور ان کی نظر ثانی بھی نہیں ہوئی ہے - اس کی دو وجہ نظر آتی ہیں - ایک یہ کہ اس کی رائے دن بدن بلندی پر چڑھتی جاتی تھی - دوسرے یہ کہ ایک رسالہ میں رکاوٹ واقع ہوتے ہی وہ دوسرا رسالہ تیار کر دیتا تھا +

ارسطو کی وفات کے بعد اس کی آخری تصانیف کے جسقدر مسودے باقی تھے -

اور نیز اس کا کتب خانہ بھی سب اس کے جانشین تھیو فریس ٹس کے قبضہ میں آئے۔
بعد وفات اس کے شاگردوں نے نامکمل رسالوں کو مکمل کرنے کی کوشش کی اور
جن کی ترتیب نہیں ہوئی تھی۔ انہیں ترتیب بھی دیا۔ لیکن اشاعت کا کام بہت کم
کیا۔ اس زمانہ میں قلمی نسخوں کے تیار کرنے کا کام ہی اشاعت سمجھا جاتا تھا۔ اور ارسطو
کی آخری تصانیف کے قلمی نسخے بہت ہی کم تیار کئے گئے تھے +

تھیو فریس ٹس کی وفات کے بعد جو ارسطو کی وفات کے ۳۵ سال بعد واقع ہوئی
ارسطو کے تصانیف اور کتب خانہ تھیو فریس ٹس کے عزیز شاگرد نیلیوس Neleus
کے قبضہ میں چلی گئیں۔ یہ شخص تمام کتابوں کو اپنے وطن سیپ سس Scepsis
کو لے گیا۔ اور اس طرح ارسطو کی تصانیف یورپ سے باہر چلی گئیں۔ اور شاید اسی وجہ سے
اس کی اصلی تصانیف پھر یورپ کو واپس نہ جا سکی ہوں +

ارسطو کی اصلی تصانیف کے دستیاب نہ ہونے کی ایک اور معقول وجہ یہ بتائی
ہے۔ کہ جب نیلیوس اس کا کتب خانہ اپنے وطن کو لے گیا تو پرگامس کے بادشاہوں
نے لوگوں کی کتابیں زبردستی لیکر اپنے کتب خانوں میں رکھنی شروع کیں۔ اس خوف
سے نیلیوس نے تمام کتابیں زمین کے اندر ایک تہ خانہ میں دفن کر دیں۔ جہاں
۱۵۰ سال تک پڑی رہیں اور کسی نے ان کی خبر نہ لی +

جب پرگامس خاندان کے بادشاہوں کا دور ختم ہو گیا۔ تو یہ کتابیں پھر اکھاڑیں۔ اور
ارسطو کے ایک معتقد اپیلی کون Apellicon کو فروخت کر دی گئیں۔ القصہ وہ
۱۷۰ سال کے بعد پھر یورپ کو واپس لائی گئیں۔ کیونکہ ان کا خریدار ایتھنز کا رہنے والا تھا
اگرچہ کچھ ان میں کیڑے لگ گئے تھے۔ اور نمی سے بھی وہ خراب ہو گئی تھیں۔ تاہم اس
وقت بھی ارسطو کی بہترین تصانیف تاریکی سے نکل کر روشنی میں آ گئی تھیں۔ یہ ۱۰۰ء
قبل مسیح کا واقعہ ہے +

۸۶ء قبل مسیح میں ایتھنز پر روم کے بادشاہ سیلا Sulla کا قبضہ ہو گیا۔ یہ
بادشاہ اپیلی کون کا کتب خانہ روم کو لے گیا۔ اور وہاں ان کی ترتیب اور درستی پر دو
مشہور فلسفی با فاضل شخص مقرر کئے گئے۔ ایک ٹائرے نیئن Tyrannion
جو سسرو فلسفی کا دوست تھا۔ اور دوسرا اینڈرو نیکس Andronicus جو جزیرہ
رہوڈس کا رہنے والا تھا +

ان دونوں فاضلوں نے بڑی ہی جانفشانی کے ساتھ ان کو ترتیب دیکر ان کے متعدد
قلمی نسخے تیار کرائے۔ اور اس طرح ارسطو کی تصانیف کی اشاعت کی گئی +

ہم تھوڑی دیر کے لئے کتب خانہ اسکندریہ کی طرف ناظرین کو توجہ دلاتے ہیں۔ اگرچہ ارسطو کی تصانیف کے تمام مسودے ۲۸۳ء قبل مسیح میں ایشیا کوچک میں لائے گئے جہاں [illegible] تہ خانے میں پڑے رہے۔ تاہم ہم ان کتابوں کے نام لکھتے ہیں جو ۲۲۰ء قبل مسیح میں کتب خانہ اسکندریہ میں لکھی گئی تھیں۔

اس کا جواب محض قیاسی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس فہرست میں جتنے نام ہیں ان میں بعض نام اس کے ان مکالموں کے ہیں جو اس نے ایتھنز کی پہلی قیام کے زمانہ میں لکھے تھے۔ اسٹرابو مورخ لکھتا ہے۔ کہ جس وقت ارسطو کی وصیت کے مطابق اس کا کتب خانہ تھیوفراسٹس کے قبضہ میں آیا۔ تو اس وقت اس میں اس کی صرف مشہور کتابیں باقی رہ گئی تھیں۔ اس کے مکالموں کی اشاعت ہو چکی تھی۔ اور ممکن ہے کہ ان کے مکالموں کی نقل کتب خانہ اسکندریہ تک پہونچی ہو۔ باقی کتابیں محض اس کے نام کی خاطر قبول کر لی گئی ہوں۔ باقی کتابوں میں اس کی ان تصانیف کا خلاصہ ہو جو ایشیائے کوچک میں دبی پڑی تھیں۔ یا اس کے وہ اقوال اور باتیں۔ اور خیالات جو اس کے شاگردوں کو یاد رہ گئے ہوں۔ اور جنہیں انہوں نے قلمبند کر کے اس کے نام سے لوگوں کو دیدیا ہو۔ مختصر یہ خیال ہے کہ وہ ایک عالی دماغ اور روشن خیال فلسفی کی فکر کا نتیجہ ہیں۔ اور لوگوں کے ہاتھوں میں پڑ جانے سے وہ معرض ہلاکت سے بچ رہیں گی۔ ان وجوہات پر نظر ڈالتے ہوئے تو یہی درست معلوم ہوتا ہے کہ جو تصانیف ارسطو کی آجکل یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہیں اور جن کی نقلیں دنیا بھر میں شائع ہو رہی ہیں۔ وہی اصلی تصانیف ہیں +

ارسطو کی جو تصانیف ہم تک پہونچی۔ ان کے پہونچنے کے دو سبب پائے جاتے ہیں

(۱) یہ کہ کتب خانہ روم میں ان کی متعدد نقلیں کرائی گئیں۔ جو دیگر کتب خانوں اور شائقین علوم کے ہاتھوں تک پہونچ گئیں +

(۲) یہ کہ اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد مسیحی کلیسیا کے لوگوں اور بزرگوں نے ان کتابوں کی قدردانی کی۔ اور انہیں حفاظت کے ساتھ اپنے قبضہ میں رکھا +

ارسطو نے سائنس کی تین قسمیں قرار دی ہیں۔ تجربی۔ توضیحی۔ اور قیاسی۔ تجربی سائنس انسان اور انسانی افعال سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا ذکر اس نے اپنی دو تصانیف میں کیا ہے۔ یعنی ایتھکس [illegible] اور پولیٹکس [illegible] ہیں +

توضیحی سائنس فنون اور قوانین سے تعلق رکھتی ہے۔ اور وہ ان کے زیر اثر رہتی ہے اس شاخ کی طرف اس نے بہت کم کوشش کی ہے۔ مگر جو کچھ بھی کی

وہ قابل قدر ہے اس کا ذکر اس رسالہ میں ہے جو اس نے فن نظم کے اوپر لکھا تھا۔ اور جو نامکمل رہ گیا تھا ۔

قیاسی سائینس تین بڑی شاخوں پر منقسم ہے۔ ریاضی۔ الٰہیات۔ اور علم طبعی۔ جن کو دوسرے معنوں میں فلسفہ اول اور علم النفس کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ ریاضی کے متعلق اس نے کوئی تصنیف نہیں کی۔ حالانکہ وہ اسے ایک دلچسپ علم بتاتا ہے اور لکھتا ہے۔ اس سے دماغی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اس کی نسبت اس کی رائے ایسی معلوم ہوتی ہے کہ گویا اس کے زمانہ میں اس کی تکمیل ہو چکی تھی۔ شاید اس لئے اس نے اس پر زیادہ توجہ نہ دی ہو ۔

اگر اس کی عمر افلاطون کے برابر ہوتی۔ تو وہ ضرور فلسفہ ریاضی پر قلم اٹھاتا۔ علم طبعی کی ارسطو نے دو قسم لکھی ہیں۔ اور اس کے متعلق اس قدر خامہ فرسائی کی ہے جس کے نتیجہ نے ۱۲۲۴ صفحوں کا مسودہ گھیر لیا ہے۔ گویا اس کی نصف تصانیف اسی ہی شاخ پر ہیں ۔

اس شاخ میں علم طبعی علم ہیئت۔ علم ترکیب اجسام حیوانات و نباتات اور علم خواص الاشیا کے متعلق رسالے ہیں۔ جن میں مختلف علوم کے متعلق درجہ بدرجہ تبدیل اور تشریح کی گئی ہے۔ اور قاعدہ کے ساتھ۔ اور واقعات کو خواہ وہ نفس الامری اور خواہ فرضی سائینس کے خیالات کے موافق ترتیب دیا گیا ہے ۔

علم الٰہی پر ارسطو نے ۱۴ کتابیں تصنیف کی ہیں جو اس کی کل تصانیف کے ایک دسویں حصے کے برابر ہیں۔ یہ ان رسالوں میں سے مرتب کی گئی ہیں جو نامکمل رہ گئے تھے۔ ان تصانیف کے علاوہ ارسطو نے کچھ ایسے رسالے بھی تصنیف کئے ہیں۔ جو اصل میں فلسفہ میں نہیں تھے۔ مگر ان میں طریقہ فکر اور طریق گفتگو کا بیان ہے۔ ان کو منطق کے رسایل کہنا بیجا نہ ہوگا۔ یہ اس کی کل تصانیف کا ایک ساتواں جز ہیں ۔

ارسطو کی کل تصانیف کا مجموعہ جو اس نے ۲۰ سال کی مسلسل محنت اور جانکنی سے لکھی تھیں۔ کوئی ۳۰ ہزار صفحوں پر ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کثیر التصانیف شخص تھا۔ مگر اس کی تعریف و توصیف نہ صرف اس کی کثرت تصانیف پر موقوف ہے، بلکہ خصوص مضامین پر اس کی دسترس پر۔ اور اس کی وسعت پر۔ ارسطو کی تصانیف میں جدت بہت پائی جاتی ہے ۔

ارسطو فلسفہ منطق کا بانی ہے۔ مزید برآں وہ کوئی نصف درجن دیگر علوم خاص کا ماہر اور منکشف کرنے والا ہے۔ جن کے متعلق وہ صدیوں تک سند مانا جاتا رہا ۔

ارسطو کی سی عزت فی زمانہ حاصل کرنا دور دشوار بات ہے۔ خدا نے یہ بات اسی کا حصہ کیا تھا +

ارسطو کے گہرے خیالات اور بلند پروازی کے سب ہی قائل ہیں جس کا ثبوت اچھی طرح پر اور نہایت عمدہ طریقہ میں اس کی مختلف تصانیف سے بخوبی ہوتا ہے +

تصانیف منطق

ارسطو نے اپنی منطق کی تصانیف کا نام آرگے نن Organon رکھا تھا۔ اس لفظ کے معنی آلہ کے ہیں۔ اور اس لفظ سے انگلستان کے مشہور فیلسوف اور منطقی لارڈ بیکن نے اپنی تصانیف کا نام نودم آرگے نم Novum Organum رکھا تھا۔ ان تصانیف میں اس نے زمانہ حال کی سائنس کے اصول اور طریق بیان کئے تھے

ارسطو کے آرگے نن میں چھ رسالہ ہیں۔ جو مندرجہ ذیل مضامین پر مشتمل ہیں تفصیل توضیح تشریح اول، تشریح دوم۔ مدعا مغالطہ +

ان میں سے اول دو مضمون پر جو رسالہ ہے وہ کوئی ۸۰ صفحوں کا ہے۔ لیکن اسی کی سب سے زیادہ قدر کی گئی۔ اور قرون وسطیٰ میں اس کی بہت سی تشریحیں لکھی گئیں اور ارسطو کے ہزاروں معتقدوں نے افلاطون کے معتقدوں سے جو بحث اور مباحثہ صدیوں تک جاری رکھا اس میں ان ہی رسالوں سے مدد لی +

ارسطو نے اپنے رسالہ ٹوپکس Topics یعنی مدعا میں تفصیل کی نو اقسام بیان کی ہیں۔ اور وہ لکھتا ہے کہ جب کسی چیز یا شے کا بیان کیا جاتا ہے تو اس کی نسبت وہ ان ہی نو اقسام میں سے کسی ایک خاص یا زیادہ اقسام میں سے ہوگا۔ اور وہ یہ ہیں۔ صفات۔ مقدار۔ تعلق۔ مقام۔ وقوع۔ زمانہ وقوع۔ فعل۔ جذبہ۔ انداز۔ خصلت یا خواص یا عادات +

مگر ارسطو نے خود "شے" کو بھی ایک مدعا قرار دیا تھا۔ اور اس طرح اس کے ہاں مدعا کی دس اقسام ہوتی ہیں +

ارسطو کی یہ دس اقسام مدعا تمام عالم کی اشیا پر حاوی نہیں آ سکتی ہیں۔ کیونکہ اُن میں سے بعض ایسی ہیں جو صرف انسان ہی کی ذات پر عائد آتی ہیں +

منطق کا دوسرا رسالہ توضیح کے متعلق ہے یعنی اس میں مسائل کا بیان ہے۔ یا یہ کہ اس میں ان کے اثبات و نفی کا ذکر ہے +

زمانہ حال کی یعنی جدید منطق کے تین حصے ہیں۔ مبتدا یا خبر۔ مسایل۔ قضیات

ان تینوں کے قائم مقام ارسطو کے ہاں تفصیل توضیح اور تشریح ہیں +

اس رسالہ کی خوبی جس کا اعتراف فی زمانہ بھی کیا جاتا ہے یہ ہے۔ کہ جو باتیں اس میں درج ہیں وہ ارسطو کے زمانہ میں نئی سمجھی جاتی تھیں۔ اور جن سے بہت سی دقتیں رفع اور مشکلات حل ہوجاتی تھیں۔ اور ان میں سے زمانہ حال کے منطقی مصنفوں نے بہت کچھ اخذ کیا ہے +

مذکورہ بالا دونوں رسالوں کی نسبت شک کیا جاتا ہے کہ وہ ارسطو کی تصنیف سے نہیں ہیں نسبت سے لوگ انہیں اسکی تصنیف نہیں بتاتے ہیں تاہم بہت سے بتاتے ہیں +

اگر مجموعی حیثیت سے دیکھا تو عوام الناس کا خیال یہ ہے کہ ارسطو نے منطق کے علم کو درجہ تکمیل کو پہونچا دیا۔ لیکن اگر ذرا غور سے کیا جائے تو صاف طور پر عیاں ہوجاتا ہے کہ ارسطو نے جو کچھ منطق کے نام سے لکھا وہ دراصل منطق تھا ہی نہیں۔ بلکہ مباحثہ کرنے کا ڈھنگ تھا جسے انگریزی میں ڈائے لیک ٹک Dialectic کہتے ہیں۔ اور جس کے لئے صحیح لفظ "علم معقول" ہے۔

علم معقول کچھ یونان کے فیلسوفوں کا ہی حصہ نہ تھا۔ بلکہ اس کا اس زمانہ میں عام لوگوں میں رواج تھا اور خاص کر ایتھنس میں۔ اور افلاطون کے مکالموں سے صاف ظاہر ہے کہ علم معقول کا رواج پانچویں صدی قبل مسیح سے لیکر ارسطو کے زمانہ تک بہت ہی زیادہ تھا اور یہ طریق تحقیق حق کے لئے نہیں بلکہ زیادہ تر فریق مخالف سے بازی لے جانے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا +

اگرچہ یونان میں علم معقول کا رواج ارسطو سے کئی صدی پہلے سے چلا آتا تھا۔ تاہم اس وقت تک کسی نے بھی اُسے درجہ تکمیل کو نہیں پہونچایا اور نہ قلمبند کیا تھا یہ بات صرف ارسطو ہی نے محسوس کی کہ علم معقول کے قواعد و ضوابط اور اصول سائنس کے سانچے میں ڈھالے جائیں +

علم معقول کی نسبت ارسطو کی رائے یہ ہے کہ علم معقول نہیں ہاؤں کے لئے کارآمد ہے دماغ کی ریاضت کے لئے گفتگو کرنے کے لئے [illegible] کے متعلق سوال کرنے و جواب دینے کے لئے +

علم معقول کو کسی طرح بھی سائنس کا شعبہ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ وہ ایک قسم کا عذر استدلال ہے۔ [illegible] باتوں [illegible] یقینی نہیں [illegible] سے منطق میں کچھ بھی نہیں لکھا البتہ علم معقول کو شکل [illegible] ہے کہ اس نے [illegible] تھوڑے [illegible] ضرور رکھدیا۔ علم معقول کی [illegible] مسئلہ [illegible] اور بہر حقیقت یہ اس نے نفسی بات پیدا کردکھائی [illegible] اُسے [illegible]

اس مسئلہ کے انکشاف یا دریافت کی نسبت خود ارسطو نے یہ لکھا ہے کہ میں
نے کوئی ایسی بات دریافت یا منکشف نہیں کی جو مجھ سے پہلے معرض بیان میں
آچکی تھی۔ بلکہ اُسے میں نے خود اپنی دماغی تحقیقات سے پیدا کیا ہے +

اس کے بعد اس نے مدعا پر رسالہ لکھے۔ مدعا سے یا تو اپنے بچاؤ یا دوسرے کے
قائل کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔ اور اس کے متعلق اُس نے چار باتیں اصول کے طور پر
بتائی ہیں کہ (۱) متکلم کو بہت سے بڑے آدمیوں کے بہت سے اقوال اور ضرب الامثال
یاد ہونی چاہئیں۔ (۲) مختلف مطالب کو جو اصطلاحات کے تحت میں بیان کئے جاتے
ہیں اچھی طرح سمجھا جائے۔ اس اختلافات کو گرفت کرنا (۳) مشابہ باتوں پر لحاظ رکھنا
ان باتوں پر عمل کرنے سے متکلم کو اپنی گفتگو کی زینت بڑھانے کا موقع ملتا ہے +

مسئلہ قضیات سے ارسطو نے نہ صرف علم معقول کی تکمیل کر دی۔ بلکہ اس نے
علم منطق کا مستقل خیمہ کھڑا کر دیا +

تشریح کے متعلق جو کچھ بھی ارسطو نے لکھا ہے وہ سُنی سنائی بات نہیں ہے
بلکہ ایک ایسی مستقل نعمت ہے جیسے کہ حکیم اقلیدس کا علم ہندسہ جسکی قدر و قیمت
کبھی بھی کم نہ ہوگی۔ اگرچہ اس نے اس شعبہ کو بھی درجہ تکمیل کا لباس نہیں پہنایا۔
تاہم اس کے متعلق اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ مکمل ہے۔

لفظ قضیات سے ارسطو کی مراد یہ تھی۔ دو باتوں سے ایک تیسری بات بطور
نتیجہ کے پیدا کیجائے اگرچہ اس لفظ کا وجود پہلے سے تھا۔ لیکن جس معنی میں
ارسطو نے استعمال کیا وہ پہلے اس معنی میں استعمال نہیں کیا جاتا تھا +

تشریح اول کے متعلق اُس نے جو کچھ لکھا ہے۔ اس میں صرف قضیات ہی
کا ذکر ہے اور اُسی سے بحث کی گئی +

ارسطو کی رائے تھی۔ کہ فطرت کی تمام باتیں اور مظاہر صرف قضیات ہی
کے ذریعہ حل اور بیان کی جاسکتی ہیں مگر یہ بات آجکل تسلیم نہیں کی جاتی۔ کیونکہ جب
تک مسموعات نفس الامری تحقیقات کے ذریعہ پایہ ثبوت کو نہ پہونچ جائیں۔ تب تک وہ
حل یا بیان نہیں کئے جاسکتے اسلئے ہر منطقی انکو حل اور بیان بھی نہیں کر سکتا +

ارسطو نے قضیات کے متعلق استقرا پر بڑا زور دیا ہے۔ استقرا اور حقیقت نتیجہ
نکالنے کیلئے ایک بڑی اچھی چیز ہے مگر تمام موقعوں پر [illegible] باتوں میں اُس سے صحیح
نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا۔ مثلاً ایک دوا ہے جو ہیضہ کی دو تین صورتوں میں نافع ثابت
ہوئی ہو۔ تو کیا یہ نتیجہ نکالنا درست ہوگا کہ وہ ہیضہ کی تمام صورتوں میں نافع ہوگی۔ لیکن
صحیح نتیجہ تو اس کا وقت نکلتا ہے جب کہ اس کی تصدیق بھی ہو چکی ہو قضیات کے

متعلق ارسطو کی تحقیقات میں صرف اس بات کی کمی پائی جاتی ہے جسکا ابھی ابھی بیان ہوچکا ہے +

تشریح دوئم میں ارسطو نے منطق کی سائنس پر قلم اٹھایا ہے اور ظاہر کیا ہے۔ کہ قضیات دلیل کا آلہ ہے۔ اس نے یہ بات ظاہر کی کہ سائنس کے ذریعہ تمام باتوں کو ثابت کیا جاسکتا ہے +

اس تشریح میں اس نے قدرت کی نسبت یہ کہا کہ قدرت سے متواتر اور مسلسل واقعات کی بھرمار ہوتی ہے۔ مثلاً جب بارش ہوتی ہے تو اس سے ایک قسم کا بخار اٹھتا ہے اور جب بخار اٹھتا ہے۔ تو اس سے ابر پیدا ہوتا ہے۔ اور جب ابر پیدا ہوتا ہے تو اس سے بارش پیدا ہوتی ہے اور قدرت میں یہ سلسلہ جاری رہتا ہے گویا ایک نسخہ کسی علت کا معلول ہے۔ اور اسی طرح اس معلول کا بھی ایک نتیجہ ہے +

ارسطو کے زمانہ میں اتھنز میں معقول دالوں کا ایک پیشہ تھا۔ اور بحث ومباحثہ میں ان سے مدد لیجاتی تھی۔ وہ حق بات کو ظاہر کرنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ بلکہ لوگوں کو مغالطہ دینے کی۔ اور ان لوگوں کو صوفی کہتے تھے یا صوف طائی +

علم کلام اور فن شاعری کے متعلق رسایل

ہم یہ تو لکھ چکے ہیں۔ کہ جب ارسطو نوجوان ہی تھا۔ تو اس نے عیشوکریٹس کے مقابلہ میں اتھنز میں علم کلام کا مدرسہ کھولا تھا۔ اور یہ اسوقت کا ذکر ہے جبکہ اس نے پہلی بار اتھنز میں قیام کیا تھا۔ اس نے اتھنز کے دوسرے قیام میں ایک ایسا مدرسہ کھولا جسمیں نہ صرف علم کلام ہی کی تعلیم دیجاتی تھی۔ بلکہ فلسفہ اور تمامی علوم کی بھی +

منطق کے رسائل کے لکھنے کے بعد ارسطو نے علم کلام میں رسالے لکھے۔ اور یہ رسالے بیس سال کے غور وخوض کے بعد لکھے گئے تھے +

ارسطو سے پہلے ہی یونان میں بہت سے رسالے علم کلام کے متعلق شائع ہو چکے تھے جن میں سے ہم تک صرف ایک نہایت اچھا رسالہ پہنچا ہے۔ اور وہ بھی ان کتابوں میں ملا جو ارسطو کے کتبخانہ میں تھیں وہ حکیم اناکسمینیس [illegible] نے لکھا تھا۔

علم کلام کی تعریف ارسطو نے یوں کی کہ "وہ ایک ایسا فن ہے جس سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ کسی مضمون یا بات سے تحریک کے کون کونسے عناصر تعلق رکھتے ہیں" +

ارسطو نے اس تحریک کے تین اسباب قرار دیئے ہیں (۱) مقرر کا ذاتی کریکٹر (۲) وہ کس انداز سے اپنے سامعین کو مخاطب کرے (۳) وہ کون کونسے دلائل پیش کر سکتا

ہے۔ اگر غور اور انصاف سے دیکھا جائے تو کیا زمانہ قدیم میں اور کیا زمانہ حال میں تقریر
کا فن انہی تین باتوں پر مبنی رہا ہے +

ارسطو نے علم کلام کے بارہ میں یہ رائے قائم کی ہے وہ منطق اور علم فلسفۂ اخلاق
سے مرکب ہے۔ اس لئے مقرر کیلئے نہایت ضروری ہے کہ وہ سامعین کے دلپر
اثر کرنے کیلئے انسانی فطرت اور اس کے جذبات کا ماہر بنے +

ارسطو نے علم کلام کے متعلق ایک اور بات کہی ہے جس کے ذریعہ مقرر
اپنی تقریر کو زیادہ اثر پذیر بنا سکتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اس کے دلائل قوی اور
سائنس اور عقل کے مطابق ہوں۔ نہ فصاحت اور قضیات پر مبنی ہوں۔ گویا اس
کی تقریر ایسی ہو کہ سامعین کے دل میں کوئی بات پیدا کر دے۔ جس کے باعث
انکی طبیعت کسی نتیجہ نکالنے کی طرف راغب ہو سکے +

ارسطو نے فن تقریر کے تین حصے کئے اور ان تینوں کے متعلق ہدایات
کی ہیں۔ کہ مقرر کو اپنی تقریر میں ہر قسم کی تقریر کے متعلق کس کس بات کا خیال
اور لحاظ رکھنا چاہئے اور سامعین کے روبرو کن کن باتوں کو پیش کرنا چاہیے +

جو تقریریں غور و خوض پر مبنی ہیں ان میں مقرر کو ان پانچ باتوں کا لحاظ رکھنا
چاہئے جیسا کہ مدبر سلطنت کا فرض ہوتا ہے۔ اس سے اس کی مراد یہ تھی کہ جو
تقریریں امور مملکت کے متعلق ہوں ان میں مقرر کو مفصلہ ذیل باتوں کا لحاظ
رکھنا چاہیئے۔ اخراجات۔ غیر ملک کے ساتھ تعلقات۔ ذرائع حفاظت۔ اشیاء درآمد
اشیاء برآمد۔ طریق قوانین ایسی تقریروں کو خوبتر بنانے کے لئے مدبروں کو تاریخ
اور سیاحوں کے کارناموں کا مطالعہ کرنا چاہیئے +

جن تقریروں میں اظہار نمائیش مدنظر ہو۔ یعنی کسی کی تعریف و توصیف کرنی
ہو یا اظہار تاسف اسکے لئے مقرر کو نیکی اور انسانی خوبیوں کا ماہر ہونا چاہیے +

جن تقریروں میں مقرر کو کسی کی وکالت مدنظر ہو ان کیلئے مندرجہ ذیل باتوں سے
واقف ہونا نہایت ضروری ہے (۱) انسانی افعال کی اغراض۔ مسرت اور مسرت کے باعث
رجحان طبیعت چنانچہ باعث اکثر انصاف کا خون کیا جاتا ہے۔ مختلف قسم کے حقوق اور
قوانین میں امتیاز یا فرق۔ جرم کے درجوں پر رائے زنی۔ قوانین کاغذات اور شہادت
مزید برآں مقرر کو انسانی جذبات حفظ مراتب۔ اور مزاجدانی سے بھی واقف ہونا چاہیئے
اسی باعث ارسطو نے علم کلام کے دوسرے رسالہ میں مندرجہ ذیل باتوں کا ذکر
کیا ہے۔ غصہ نرمی دوستی۔ نفرت۔ خوف۔ شرم۔ شکر گذاری۔ رحم۔ غیظ و غضب
ناراضگی حسد۔ رقابت۔ لڑکپن جوانی بڑھاپا۔ رتبہ۔ دولت اور طاقت +

ارسطو نے خود تقریر کے تین حصے کئے ہیں جو یہ ہیں۔ بیان۔ ثبوت۔ خاتمہ اس کے سوائے اس نے ایک نہایت عمدہ نصیحت مقرر کی ہے۔ وہ یہ ہے کہ جب مخالف یا سننے والے مذاق اڑائیں۔ تو انہیں ذرا تیزی اور سرگرمی سے خاموش کرے۔ لیکن جب وہ سرگرمی اور تیزی دکھائیں۔ تو مذاق اور ظرافت سے چپ کر لیا جائے +

ارسطو نے جو کتاب فن شاعری پر لکھی ہے وہ نہایت ہی دلچسپ ہے۔ لیکن اس میں اس نے شاعری کو اس نگاہ سے نہیں دیکھا ہے جس نگاہ سے کہ وہ زمانہ حال میں دیکھی جاتی ہے۔ بلکہ نصیحت دینے کی نگاہ سے +

چونکہ ارسطو بذات خود شاعری کا دلدادہ نہیں ہے۔ اس لئے اس نے اسے نقالی کے لفظ سے یاد کیا جسمیں۔ گانے ناچنے اور نقل او تارنے سے کام لیا جاتا ہے +

مزید برآں فن شعر کی نسبت ایک اور نہایت نایاب بات یہ کہی۔ کہ شاعری یا تو عقلمندوں کا حصہ۔ یا دیوانوں کا۔ اور اس میں شک بھی نہیں۔ کیونکہ شعر گوئی کوئی آسان کام نہیں ہے وہ یا تو مجذوبوں کا کام ہے۔ جنکا بہرہ کھل جاتا ہے۔ اور یا عقلمندوں جنکی عقل و سمجھ کسی بات کو نہایت دلکش پیرایہ میں پیش کرتی ہے +

ارسطو نے نظم یا شعر کی بھی تین قسمیں کی ہیں۔ رزمیہ۔ مرثیہ۔ اور دل خوش کن مرثیہ سے مراد اس نظم سے لی ہے جسمیں کسی ایسے واقعہ کا ذکر ہو جس کا انجام افسوسناک ہو۔ دل خوش کن سے مراد وہ نظم ہے جسمیں کسی ایسے معرکہ کا بیان ہو جسکا انجام مسرت انگیز ہو۔ آخری قسم میں اس نے قصیدہ۔ مدح۔ حمد۔ تعریف اور ظرافت وغیرہ سب کو لپیٹ لیا ہے +

ارسطو کا یہ کہنا کہ نظم یا تو عقلمندوں کا حصہ ہے یا دیوانوں کا آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ شاعری کی غرض و غایت جہانتک بھی غور سے دیکھا جائے یہ ہے کہ اس سے لوگوں کو کوئی سبق آموز بات ہاتھ لگے۔ نہ کہ صرف ہنسنا ہنسانا۔ یہ بات صرف اسی ہی حالت میں پیدا ہو سکتی ہے۔ جبکہ شاعر یا تو صاحب عقل ہو اور یا دیوانہ +

علم اخلاق کے متعلق تصانیف

ارسطو نے جو تصانیف علم اخلاق پر کی ہیں ان کے مجموعہ کا نام اس نے اپنے بیٹے نکوماخس کے نام پر نکوماخسی علم اخلاق رکھا ہے۔ اس نے علم اخلاق کے متعلق نیکی اور بدی کے اوپر بھی ایک جامع رسالہ لکھا ہے +

ارسطو نے علم اخلاق کی بنیاد ان دو باتوں پر قائم کی ہے کہ انسان کا فرض کیا ہے اور ان کی بھلائی کس بات میں ہے؟

یونان میں علام حکمت کا کام کیا کرتے تھے۔ اور شہری شرفاء [illegible] بڑے لوگ

اہل یونان کا رتبہ بہت اعلیٰ ہے۔ جیسا کہ نہ صرف اہل مشرق نے تسلیم کیا۔ بلکہ اہل
مغرب یعنی یورپ۔ افریقہ اور امریکہ نے بھی۔ علوم اور خصوصاً علوم عقلی۔ مثلاً فلسفہ
الٰہیات۔ علم النفس جن کا تجربہ اور مشاہدہ ناممکن ہے۔ اُن کے دنیا میں پھیلانے
والے اور بالآخر نئے علوم کی جس کا انکشاف ظہور ہمارے زمانہ میں ہوا یا اس سے کچھ مدت
پہلے یا آئندہ ہوگا بنیاد ڈالنے والے اہل یونان ہی تھے۔ حالانکہ ان سے پہلے بھی روئے
زمین پر ایسی قوموں کا وجود ثابت ہوتا ہے۔ جو فی الواقع علوم کی بنیاد ڈالنے والی تھیں۔
لیکن جسقدر فروغ اور شہرت علوم کو اہل یونان کی طفیل حاصل ہوئی ویسی خود موجدوں
کے ہاتھ سے نہیں۔ اسلئے یہی تسلیم کیا گیا۔ کیا جاتا اور کیا جائیگا کہ اہل یونان ہی نے
علوم کو تاریکی سے نکالکر روشنی کی رونمائی کرائی۔ جس سے کہ بنی نوع انسان اس وقت تک
فیضیاب ہوتے رہینگے جب تک کہ دنیا قائم ہے۔ یہی باقی قومیں جنہوں نے اہل یونان
کے زوال کے بعد عروج حاصل کیا وہ اہل یونان کی خوشہ چین سمجھی جاتی ہیں +

اہل یونان کی خصوصیات میں سے ایک خاصہ جو سب سے زیادہ لطیف ہے یہ ہے کہ وہ
خوبصورتی کے عاشق تھے خوبصورتی سے عموماً مراد مستورات کا حسن وجمال لیا جاتا ہے:
لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ عورتوں کے حسن وجمال کے مشتاق اور شیدائی نہیں تھے
بلکہ فی نفسہ اور صحیح معنوں میں "خوبصورتی" کے سچے قدردان تھے۔ وہ موجودات ایزدی
اور صنعت انسانی کی ہر چیز میں خوبصورتی کے جویان اور اسکے مدنظر رکھنے والے تھے۔
اس لئے وہ عمدہ عمدہ عمارتیں بناتے تھے۔ اور ان میں فن تعمیر کے تمام دقائق کو حل کر
دیا کرتے تھے۔ سلاح جنگ میں نفاست اور سبکی کا خیال مدنظر رکھتے تھے۔ انسان کے جسمانی
اعضا کے تناسب کو ملحوظ خاطر رکھتے تھے۔ بتوں کی تراش خراش میں ایسی باریک بینی
سے خوبصورتی کو دکھاتے تھے کہ باید و شاید۔ یہانتک کہ نقل واصل میں کوئی فرق باقی نہیں
رکھتے تھے۔ وہ صانع قدرت کی صناعی کا ہو بہو چربہ اور خاکہ اوتار دیتے تھے +

افلاطون کے شاگردوں میں خوبصورتی کی جو جامع صنعت ارسطو نے بیان کی ہے
وہ کسی نے بھی نہیں کی۔ وہ اُسے عقلی مسرت سے تو ضرور کمتر بتاتا ہے۔ وگرنہ تمام
چیزوں سے اعلیٰ تر اور اپنے خیال کی تائید میں متعدد مثالیں پیش کرتا ہے۔ جو اصل
ہونے سے بہتر اور افضل ہیں +

افلاطون نے نیکی کے پانچ درجے قائم کئے تھے۔ ہمت۔ اعتدال۔ انصاف۔
عقل اور تقدس۔ مگر ارسطو نے اس میں بہت سی صفات کا اضافہ کیا ہے۔ اور حسب
ذیل درجے قائم کئے ہیں۔ ہمت۔ اعتدال۔ سخاوت۔ عالی حوصلگی۔ فیاضی۔ غیرت۔
دوستی۔ لطافت۔ عقل۔ سچائی۔ [illegible]

ارسطو نے ان صفات کے متعلق جن کا اوپر بیان ہو چکا ہے بہت خامہ فرسائی کی ہے
اور اُس میں ایسی ایسی نایاب باتیں بنی نوع انسان پر ظاہر کیں - جو اپنا نظیر آپ ہی ہیں
اور جنکی قیمت میں سارا جہان کم اترتا ہے - اگرچہ اُس نے ان باتوں کے بیان میں افلاطون
سے اختلاف کیا - اور کئی جگہ خود بھی اپنے خیال کے زور میں ٹھوکر کھائی ہے - لیکن
قطع نظر ان لغزشوں کے اُسکی بیان کی ہوئی باتیں فی الحقیقت نایاب ہیں - اور وہ
ہر زمانہ میں لوگوں کا دستور العمل بنی رہی ہیں - اور اسی طرح آیندہ زمانہ میں بھی بنی رہینگی -
جیسا کہ خود ان باتوں کی خوبی اور وقعت سے ثابت ہوتا اور توقع ہوتی ہے +

فلسفہ اخلاق میں جو باتیں اس نے مروت کے ضمن میں لکھی ہیں - ان سے بہتر
آج کسی طباع اور فلسفی نے نہیں لکھیں - کیونکہ اُن ہی پر اس کے بعد کے طباعوں
اور فیلسوفوں نے اپنے خیال کی بندش کی بنیاد ڈالی ہے - اور انہی کی رفاقت میں عالم
خیال اور مملکت حکمت میں قدم مارتے اور سیر کرتے پھرتے ہیں +

فی زمانہ علوم جدیدہ کا دور دورہ ہے اور یورپ کے طباع فلسفی عالم خیال اور
عالم تصور میں بندھے پھرتے ہیں اور عجیب و غریب موشگافیاں کر رہے ہیں - جنکے مطالعہ
سے عقل انسانی بدرجہ کمال ہیں بھی دنگ رہ جاتی ہے - مگر اس زمانہ میں "مسرت" کے مضمون
کو جو ارسطو نے لکھا ہے اور بے نظیر لکھا ہے سب ہی تو تسلیم کرتے ہیں +

مسرت یا وجدان قلبی پر افلاطون نے بھی بڑی زبردست رائے قائم کی تھی - مگر ارسطو
نے اسکی رائے کو طفلانہ ثابت کر دیا - اور یہ بتا دیا کہ مسرت کے معنی اور مفہوم وہ باتیں نہیں
ہیں جو زندگی کو طول دیتی اور خوشتر بناتی ہیں - بلکہ خود زندگی ہے اور اسکا اصلی خاصہ ہے +

مسرت جیسا کہ افلاطون اور دیگر حکماے کا خیال تھا وہ چیزیں نہیں ہیں - جو
لوازمہ زندگی ہیں - بلکہ وہ تو کچھ اور ہی بات ہے - جیسا کہ ارسطو نے بتایا ہے - ان کی ابتدا
اور انتہا دونوں زندگی ہی میں موجود ہیں - اور اسکے علاوہ تمام خیالات باطل ہیں +

علم سیاست مدن پر تصانیف

علم اخلاق کے بعد ارسطو نے علم سیاست مدن پر طبع آزمائی کی ہے - اور جو کچھ لکھا ہے
اسمیں علم اخلاق اور علم سیاست مدن کو ایک دوسرے کا لازم و ملزوم قرار دیا ہے +

علم سیاست مدن کے متعلق اُس نے لکھا ہے کہ اُسے بلا علم اخلاق کے انسان کسی
طرح بھی حاصل نہیں کر سکتا - اور خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ وہ انسان کی سوسائٹی
دوستوں کی رفاقت سے الگ تھلگ ہے - بلکہ اس نے تو یہاں تک کہدیا ہے کہ اخلاق اور
علم سیاست مدن دونوں گوشہ نشینی سے حاصل ہو ہی نہیں سکتے ہیں +

ارسطو لکھتا ہے کہ انسان فطرتی طور پر ایک تمدنی مخلوق ہے۔ اور اگر وہ انسان سے
بھٹک کر رہے تو انسان ہی نہیں نہ تو وہ دیوتا ہو سکتا ہے۔ ورنہ حیوان مطلق۔
اس سے صاف ظاہر ہے کہ انسان کو تمدنی لائف کا کیڑا سمجھو۔ چاہے انسان کیسا ہی
مہذب ہو۔ مگر جب تک کہ سوشل لائف میں حصہ نہ لے گا۔ تب تک اس کی خوبی ظاہر
نہیں ہو سکتی ہے +

ارسطو نے سیاست مدن کے تذکرہ میں [illegible] کے متعلق بہت سی باتیں
لکھی ہیں۔ اور ان میں انسانی فطرت اور اس کے چال چلن اور عادات و اطوار کی بہت
سی تجربی باتیں بیان کی ہیں۔ جو بہت سے ملکوں اور بہت سے زمانوں پر حاوی ہیں
اور صادق ہوتی ہیں +

ارسطو نے تعلیم کا علم سیاست مدن کے حاصل کرنے کا ایک زبردست آلہ قرار دیا
ہے مگر افسوس کہ یہ رسالہ مکمل نہیں ہے۔ اور کئی وجہ سے چاہے وہ کوئی کیوں نہ ہوں اور
جیسے ہی کیوں نہ ہو اس نے اسے ادھورا چھوڑ دیا ہے +

ارسطو نے "سلطنت" کی تعریف ان الفاظ میں کی کہ "اسکے باشندے حسب ذیل
فراخ دل سخی۔ جمدل مستقل مزاج۔ دور اندیش اور فن حرب سے واقف ہوں۔ کیونکہ
ان صفات کے ہونے سے کوئی سلطنت دیرپا نہیں ہو سکتی ہے مزید برآن لوگوں میں
سی باتوں کے دریافت کرنے ذرائع آمدنی بڑھانے کی بھی سوجھ بوجھ ہونی چاہئے

علم سیاست مدن میں ارسطو کا پایہ اپنے استاد افلاطون سے بڑھکر چڑھکر ہے
کیونکہ افلاطون کے اصول کو لوگوں نے اسقدر نہیں پسند کیا جسقدر کہ ارسطو کے اصول
کو۔ کیونکہ وہ خیالی باتوں کی طرف نہیں گیا۔ بلکہ حقیقی کی طرف۔ اور یہ اصول اس نے
ایسے قائم کئے جن سے مختلف قسم کی سلطنتوں کا انتظام و انصرام ہو سکے +

ارسطو نے سلطنت کی تین قسمیں قرار دی ہیں (۱) شخصی حکومت بادشاہی حکومت
جس کا فرمانروا صرف ایک شخص ہوتا ہے (۲) جمہوری سلطنت جسکی حکمرانی ملک کے
بہت سے چیدہ اشخاص کے ہاتھوں میں ہوتی ہے (۳) مخلوط حکومت جس میں
شخصی جمہوری ظالم کی سلطنت وغیرہ کے عنصر پائے جاتے ہیں +

ارسطو کی رائے تھی کہ سلطنت میں انقلاب اس وجہ سے واقع نہیں ہوتا کہ لوگوں
کو کسی چیز کے حاصل ہونیکی توقع ہوتی ہے۔ بلکہ اس وجہ سے کہ انکے حقوق قائم رہیں +

ارسطو نے جمہوری سلطنت کو بہتر بتایا ہے۔ لیکن اس نے لوکل لائف یا ریپرے
زینٹیٹو گورنمنٹ کا ذکر تک نہیں کیا۔ شاید وہ اس قسم کی حکومت کے وجود کو ضروری نہیں
سمجھتا تھا۔ ان کی ضرورت کو اس نے جمہوری سلطنت کے ہاتھوں ہی پورا کرلیا ہے

کا خیال رکھا۔ وہ یہی یقین کر لیا کہ صرف جمہوری سلطنت سے تمام کام چل سکتا ہے
ارسطو فطرتاً ایک بڑا فلسفی تھا۔ اُسے علم سیاست مدن سے کوئی دلچسپی نہیں
تھی۔ یہی باعث وہ ان جھگڑوں سے دور رہا۔ جس سے اُس کے ملک کی بھلائی
ہو سکتی تھی جس کے باعث وہ محب وطن کہلا سکتا تھا۔ اور جن کے پیچھے ڈیوس
تھنیز [illegible] نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ صرف کر دیا +

نیچرل فلاسفی پر تصانیف

اول مضامین پر طبع آزمائی کرنیکے بعد جنکے متعلق ہم ذکر کر چکے ہیں۔ ارسطو نے
اپنی طبیعت کو استقرائی فلسفہ یا سائنس کی طرف پھیر دیا۔ اور ایسے اہم سوالات
حل کرنے میں مشغول ہو گیا جن میں معمولی فلسفی ہار کھا کر اور تھک کر بیٹھ رہتے ہیں
مثلاً نیچر۔ کائنات۔ خدا +
اس علم کے متعلق اس نے جو تصانیف کی ہیں وہ تین ضمن میں رکھی جا سکتی
ہیں نیچرل فلاسفی۔ الٰہیات۔ علم حیات +
فلسفہ میں اعلےٰ اصول یہ ہے کہ کسی چیز کو قبل از ثبوت ثابت شدہ اور مسلمہ
مان لینا۔ لیکن ارسطو نے اس بات کو نہیں مانا +
سب سے پہلے اس نے وجود پر بحث کی ہے اور جس طرح اسکے متقدمین نے
اس باب میں دماغ پہونچایا اس نے بھی +
وجود کی نسبت ایک اعتراض ہے کہ اسکی ابتدا کس شے میں سے ہوتی ہے
آیا کسی وجود میں سے یا عدم میں سے +
نیچر کی تعریف میں یوں لکھا ہے کہ " وہ حرکت اور بے حرکتی کا ایک اصول اور
خاصہ ہے جو ہر شے میں موجود ہے۔ خواہ ہم اسے تبدیلی کہیں خواہ فنا۔ کوئی ترقی
اور خواہ حرکت ارادی +
ارسطو نے جس کے قول کی تائید بہت سے فلسفیوں نے بھی کی ہے لکھا ہے کہ
نیچر ایک ایسی شے ہے جیسی کہ گھڑی۔ اگر کسی کو اتفاق سے ایک گھڑی ملجائے تو اس سے
وہ یہی نتیجہ نکالیگا کہ اسکا بنانیوالا بھی کوئی نہ کوئی ضرور ہے۔ اسی طرح موجودات کے
مشاہدہ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ بھی کسی برتر ذات کے مظاہر ہیں +
ارسطو حادثہ یا اتفاق کا قائل نہیں تھا۔ اسکی رائے تھی۔ کہ کوئی شے کبھی بھی
اتفاق سے یعنی یکایک وجود میں نہیں آگئی۔ بلکہ وہ کسی ایسی شے کا نتیجہ ہے جو
ان کے فہم و ادراک سے باہر ہے۔ اور جسے انسانی آنکھ دیکھ نہیں سکتی اور انسانی

حواس جیسے محسوس اور معلوم نہیں کر سکتے ہیں +
افلاطون کی رائے تھی کہ زمین ایک محور پر گھومتی رہتی ہے جس سے دن اور رات
کا ظہور ہوتا ہے +
ساموس کے رہنے والے حکیم ایرس ٹارخس کی رائے تھی۔ کہ زمین میں دو حرکتیں
ہیں۔ ایک اپنے محور پر کی اور دوسرے آفتاب کے گرد۔ مگر ارسطو نے ان دونوں سے
اختلاف کیا۔ اور کہا کہ زمین حرکت نہیں کرتی۔ اور اگر کرتی ہے تو دیگر سیاروں کی
کشش کے زور سے اور یہ کشش جس وقت زائل ہوگی اُسی وقت زمین کی حرکت
بھی جاتی رہیگی +
اگرچہ زمین کی حرکت کے بارہ میں تو ارسطو نے غلطی کی ہے۔ لیکن اس کی شکل
کی بابت اسکا جو خیال تھا۔ بہت صحیح اور درست نکلا۔ اُس نے اسکی شکل بیضوی
بتائی ہے۔ اس نے یہ بھی رائے قائم کی جسامت کے لحاظ سے وہ دیگر سیاروں سے
چھوٹی ہے۔ اس کا یہ خیال بھی درست تھا۔ کہ سمندر جو یورپ کے چاروں طرف ہے ایک
ہی ہے +
ارسطو کے اس خیال کی بدولت تو کرسٹوفر کولمبس کو جرأت ہوئی تھی۔ اور وہ یہ کہنے
لگا تھا کہ زمین گول ہے۔ اور اسی خیال پر پختہ ہو کر اس نے اسپین سے ساحل ہندوستان
کی تلاش میں چلنے کا ارادہ کیا تھا۔ اُس نے اسی خیال کے باعث اپنی سیاحت کے بعد وسطی
امریکہ کے جزائر کا نام ویسٹ انڈیز رکھا۔ اور وہاں کے باشندوں کا نام انڈینس۔
زمین کے طول و عرض کی نسبت بھی ارسطو کا خیال غلط نکلا۔ اُس نے اس کے
محیط کو ۴۰ ہزار میل قرار دیا تھا۔ مگر درحقیقت ہے وہ ۲۴۸۵۷ میل۔ جیسا کہ زمانہ حال کی
تحقیقات سے ثابت ہوا ہے +
حکیم فیثا غورث کے معتقدوں کا خیال تھا کہ دُمدار ستارے از قسم سیارہ ہیں۔
مگر ارسطو کی رائے یہ تھی۔ کہ وہ از قسم سیارہ نہیں ہیں۔ بلکہ ٹوٹنے والے تاروں میں
سے ہیں اور ان کا وجود نایاب اسلئے ہے کہ وہ اس مادہ سے بنتے ہیں جو ستاروں سے
خارج ہوتا ہے اور جو کہکشاں کے بنانے میں زیادہ مدد دیتا ہے +
ارسطو نے زمانہ۔ خلا اور حرکت پر بھی قلم اٹھایا اور طبع آزمائی کی ہے حرکت کے باب
میں اُس نے غلطی کھائی ہے۔ کہ اجسام فلکی اور زمین کی گردش ایک دوسرے سے نہیں
ملتی ہیں۔ اور نہ اجسام فلکی گردش کرتے اور زمینی اجسام میں خود ایک حرکت موجود ہے
وہ نہ اوپر کو جاتے ہیں۔ اور نہ نیچے کو آجاتے ہیں +
اگرچہ ارسطو نے علوم طبعی میں بہت سی جگہ ٹھوکریں کھائی ہیں۔ تاہم اس نے

بڑا کام کیا وہ یہ کہ اس نے سائنس کا ایک مصارف بنایا اور اُسے اس نے متقدمین کی
ضرب الامثال اور خیالات کی مدد سے پورا کیا۔ اور اپنی سمجھ کے موافق انکو ترتیب دیا۔ اتنے جو
کچھ بھی معلوم ہے وہ محض اُن چیزوں یا باتوں کی مدد سے جو اُسے دستیاب ہو سکی تھیں +
ارسطو کے زمانہ میں وہ آلات موجود نہیں تھے جن سے کسی بات کا مشاہدہ ہو سکتا
ہے یا جن کے ذریعہ اکثر مسائل ثابت کئے جاسکتے ہیں۔ اسکے زمانہ میں خوردبین۔ دوربین
مقناطیس الحرارت۔ مقیاس الہوا۔ اسپیکٹروسکوپ وغیرہ نہ تھے۔ اس لئے اگر اس سے
کسی بات کا اندازہ کرنے۔ جانچنے۔ مشاہدہ یا تجربہ کرنے اور پایہ ثبوت کو پہونچانے میں غلطی
ہوتی تو وہ قابل عفو ہے۔ اُس نے جو کچھ بھی لکھا وہ حیرت افزا ہے +
ارسطو نے علم کیمیا پر قلم بالکل ہی نہیں اُٹھایا۔ کیونکہ اس باب میں اُس نے جو کچھ
بھی طبع آزمائی کی ہے وہ عدم کے برابر ہے۔ دراصل یہ علم یونان سے نہیں چلا۔ اگر
اسکی ابتدا وہاں سے ہوئی ہوتی۔ تو ارسطو اوس سے ضرور واقف ہوتا۔ اس کی ابتدا
فی الواقع ملک مصر سے ہوئی تھی۔ ارسطو نے صرف چار عناصر مانے ہیں۔ آتش۔ آب
ہوا۔ خاک اور انکی خصوصیات یوں بیان کی ہیں کہ آگ گرم و خشک ہے۔ ہوا گرم
وتر ہے۔ پانی سرد وتر ہے۔ خاک سرد و خشک ہے +
اس باب میں ارسطو مورد الزام قرار نہیں دیا جاسکتا۔ کیونکہ جو کچھ بھی اس نے
لکھا ہے۔ وہ اس تحقیق کا نتیجہ ہے۔ جو یونان میں کہیں سے آگئی تھی۔ اور وہ بھی نہایت
غیر مکمل طریقہ میں +

علم حیات پر تصانیف۔

علم حیات کے متعلق ارسطو کی یہ رائے ہے کہ کل موجودات ایزدی ایک ہی سلسلہ
میں منسلک ہیں۔ انکی ابتدا غیر مرئی اشیا سے ہوئی۔ اور رفتہ رفتہ اس نے مرئی صورت
اختیار کر کے نباتات کی شکل میں ظہور کیا۔ اور پھر حیوانات اور پھر انسان کی شکل میں +
ارسطو کی یہ رائے نکتہ چینی اور اعتراض سے خالی نہیں ہے کیونکہ ایسا سیدھا
سادھا اصول زمانہ حال کی تحقیقات سے بالکل ہی رد ہو جاتا ہے +
اہل یونان کے ہاں حیات کیلئے دو لفظ پائے جاتے تھے۔ ایک زوئی۔ دوسرا بیوس
زوئی زندگی حیات کیلئے استعمال کیا جاتا تھا۔ اور بیوس افعال کے لئے لفظ علم حیات
جسے انگریزی زبان میں بیالوجی کہتے ہیں شاید ان ہی دونوں لفظ سے مشتق ہے +
بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ارسطو نے جو کچھ بھی علم حیات کے متعلق رائے قائم کی
اور جو کچھ تصانیف زمانہ کیلئے چھوڑیں وہ اس تحقیقات کا نتیجہ ہیں جو اس نے سکندر اعظم

کی استادی اور اتالیقی کے زمانہ میں کی تھیں۔ کیونکہ وہاں اُسے شکاریوں اور [illegible]
بہت سابقہ رہا۔ جنگی صحبت اور اشغال سے اس نے علم حیات متعلق بہت سامان
جمع کر لیا +
علم حیات میں اُس نے ایک رسالہ حیوانات کے اعضا پر لکھا ہے اور اُس میں
لیفات عروق۔ شریان اعصاب اور عضلات کا ذکر کیا ہے +
ارسطو نے ایک رسالہ روح کے متعلق بھی علم حیات کے سلسلہ میں لکھا تھا۔
اور اس میں روحی خواص کے ضمن میں۔ جذبہ۔ حافظہ۔ خواب۔ تصور۔ بیداری۔ موت
حیات۔ جوانی اور پیری کا ذکر کیا ہے +
کہتے ہیں کہ ارسطو نے علم ادویہ میں بھی ایک رسالہ لکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن کہیں
سے بھی یہ پتہ نہیں لگتا کہ اس نے کوئی اس قسم کا رسالہ کبھی لکھا بھی تھا +
اس نے ایک رسالہ حیوانات کی حرکات پر بھی لکھا تھا۔ اور اس میں یہ ذکر ہے کہ
کس طرح مختلف اعضا اس فعل کو پورا کرتے ہیں +
ارسطو نے تعلیم حیوانات بھی لکھی ہے۔ مگر وہ دراصل تاریخ نہیں ہے بلکہ حیوانوں
کے حصے ہیں۔ جو اُسنے غیر تعلیم یافتہ لوگوں سے سنے۔ مثلاً مچھووں۔ ملاحوں سپنج نکالنے والو
چڑیماروں شکاریوں۔ گلہ بانوں۔ شہد کی مکھی پالنے والوں وغیرہ وغیرہ سے اسلئے انہیں تاریخ
نہیں کیا جاسکتا۔
اُس نے اس تاریخ میں جن صورتوں کا ذکر کیا ہے اُنکی تفصیل حسب ذیل ہے:۔
دودھ پلانیوالے حیوان ۷۰۔ پرند ۱۵۰۔ رینگنے والے جانور ۲۰۔ مچھلیاں ۱۱۶ مزید برآں
۴۲ اور جانوروں کا ذکر بھی کیا ہے +
ارسطو نے سائنٹس کے طریقہ میں ان جانوروں کی ترتیب اور درجہ بندی نہیں کی ہے
بلکہ ان تمام لفظوں میں جوان کے خواص میں داخل ہیں۔ مثلاً چلنے والے۔ رینگنے والے۔ اڑنے
والے۔ تیرنے والے مگر اسکی اس کتاب سے اسکے بعد کے فلاسفیوں نے علم حیوانات کی بنیاد ڈالی ہے +
افسوس ہے کہ جسطرح ارسطو کی اور تصانیف غیر مکمل ہیں۔ اسی طرح یہ رسالہ بھی غیر مکمل رہ گیا +

علم النفس پر تصانیف

اس علم کے متعلق جو تصانیف ارسطو نے کی ہیں۔ وہ نہ تو انسانی روح کے افعال
و خواص پر مبنی ہیں۔ اور نہ طبعی اور جسمانی حالت پر۔ بلکہ ادراک۔ حافظہ عقل اور انکے اس تعلق
پر جو خارجی اشیا کے ساتھ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس علم میں جو تصانیف ہیں انکی تعداد ۱۳ ہے +
اگرچہ علم النفس ایک نہایت دشوار۔ خشک۔ روکھا اور بے مزہ مضمون ہے

لیکن ارسطو نے اُسے جو لباس پہنایا وہ خواہ علم کی حیثیت سے اچھا ہو یا نہ ہو مگر دینے بیحد دلکش تھا۔ اور اسپر جرمنی کے فیلسوفوں نے زیادہ تر اپنے فلسفہ کی بنیاد ڈالی ہے +

اس تصنیف کا لب لباب یہ ہے کہ فیلسوفوں نے ایک مادی علت دریافت کر کے اُسکے ذریعہ سے۔ طاقت تشکل اور خاتمہ یا آخری علت بھی دریافت کر لی +

ارسطو کی رائے ہے۔ کہ مادہ بغیر کسی شے کا وجود قائم نہیں رہتا +

علم النفس کے ضمن میں جہاں ارسطو نے مادہ کے متعلق طول طویل بحث کی ہے اور جسے ہم محض اس خیال سے قلم انداز کئے دیتے ہیں۔ کہ وہ عام مذاق کے مطابق نہیں اور نہ اس مختصر سوانحعمری کا مقصود یہ ہے کہ ان علوم پر مفصل بحث کی جائے جو ارسطو نے سیکھے یا جن پر طبع آزمائی کی یا جن کے لئے اس نے بنیاد ڈالی۔ بلکہ محض یہ دکھانا ہے۔ کہ اس نے اپنی عمر میں کتنا کام کیا اور کیا کیا کام کئے۔ ہاں اس نے حواس خمسہ پر بھی ایک رسالہ لکھا ہے +

اس رسالہ میں اُس نے یہ دکھایا ہے کہ روح جس میں قوت حس بدرجہ غایت ہے وہ حواس خمسہ کی مدد سے تمام اشیاء کا حال۔ خواص اور ماہیت دریافت کر لیتی ہے +

ارسطو نے لکھا ہے کہ حواس تک کسی شے کو پہونچانے کیلئے ایک حامل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور ہر حس کا ایک حامل ضرور ہے ورنہ وہ حس کسی شے سے آشنا نہیں ہو سکتی ہے۔ مثلاً قوت باصرہ کا حامل پانی ہے۔ قوت سامعہ کی حامل ہوا ہے۔ قوت شامہ کی حامل آگ ہے۔ قوت لامسہ اور قوت ذائقہ کی حامل خاک ہے +

خاتمہ

حکیم سسرو کے زمانہ میں یعنی مسیح کی پیدائش سے کچھ ہی مدت پہلے ارسطو کی تصانیف سے لوگ یہانتک کہ فلسفی بھی بہت ہی کم واقف تھے۔ لیکن انڈرونیکس کی کوشش سے وہ پیدائش مسیح سے دنیا کے سامنے لائی گئیں۔ مگر ان کی شہرت ارسطو کی وفات کے کوئی ۲½ صدی بعد ہوئی +

اس کی تصانیف کو نہ صرف یونانیوں ہی نے پسند کیا بلکہ دیگر قوموں نے اپنے مذہب کی اشاعت کا موید بتایا۔ یونانیوں میں تو بہت سے لوگوں نے اسکی تصانیف پر تقریظ اور شرح لکھیں +

چھٹی صدی عیسوی میں ارسطو کی تصانیف کا ترجمہ لاطینی زبان میں کیا گیا مگر صرف ان رسالوں کا جنکے مجموعہ کو تشریح اور تفصیل کہتے ہیں۔ اگرچہ مسیحی مذہب کے بعض علما نے اس کی تصانیف کو منکر خدا ہونے کی تعلیم دینے والی سمجھ کر خارج کر دیا۔ تاہم منطق

اور الٰہیات کو اپنی تعلیم سے علیحدہ نہیں کیا +

مگر آٹھویں صدی عیسوی میں ارسطو کی تصانیف کا ستارہ چمکا - اور سپانیہ کے عربوں کی کوشش سے - کیونکہ انہوں نے اسکی تصانیف کا ترجمہ اپنی زبان میں کر لیا تھا اسکے بعد خلیفہ مامون رشید کے عہد میں کوئی ۸۱۰ء کے قریب بغداد - قاہرہ اور قرطبہ کے عرب نے اسکی تصانیف کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالا - اور آرمنی - سریانیہ - شام قسطنطنیہ اور مصر سے لاکر زبان عربی میں ترجمہ کیا - خلیفہ مامون رشید نے اپنی رعایا کو ان کی تعلیم کی کے لئے ہدایت کی +

اہل عرب کی کوشش سے یہ کتابیں ظہور میں آئیں - اور کوئی دو صدی تک ان کا چرچا رہا - لیکن مغلوں نے ان کو پھر تاریکی کی غار میں ڈالدیا +

ابن رشید نے جو ۱۱۲۶ء میں پیدا ہوا - اور ۱۱۹۸ء میں فوت ہوگیا - ارسطو کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا - اور ان پر تفاسیر لکھیں - اور اسی کی کوشش کے نتیجہ نے اہل یورپ کو علم سے مالامال کر دیا - کیونکہ عرب سے یہودیوں نے یہ علوم سیکھے اور انسے عیسائیوں نے تیرھویں صدی میں مسلمانوں اور عیسائیوں میں صلیبی جنگ ہوئی جس کے باعث قسطنطنیہ وغیرہ سے ارسطو کی یونانی زبان کی تصانیف یورپ میں لائی گئیں - اور سینٹ ٹامس اکوئی نس نے ان پر تفاسیر لکھیں +

ارسطو نے تمام دنیا سے زیادہ انسانوں کو سائینس کی تعلیم دی ہے - اسوقت ہزاروں لفظ سائنس میں ایسے نظر آتے ہیں جو ارسطو نے اصطلاحات کے طور پر اختراع کئے تھے حکیم ارسطو نے بنی نوع انسان کو اپنی ذات فیض برکات سے بیحد نفع پہونچایا - جس کے صلہ میں اسکا نیک نام ابتک یادگار ہے - ابتک انسان اُسے عزت و ادب کے ساتھ یاد کرتے ہیں - اور جبتک دنیا قائم ہے اسکا نام برقرار رہیگا - کیسا اچھا ہو کہ ناظرین میں سے ہر ایک خلق خدا کو نفع پہونچانے میں دریغ نہ کرے تاکہ اسکا نام بھی نیکی کیساتھ آیندہ نسلوں میں لیا جائے +

ارسطو علم کا بڑا شایق تھا - اس نے اس علم کی خاطر ملکی معاملات سے حذر کیا - اور کبھی بھی عزت کیلئے جستجو نہیں کی - لیکن اسکی نفع رسانی کی علامت کے باعث نہ صرف زندگی ہی میں بڑی سے بڑی عزت نصیب ہی بلکہ مرنیکے بعد بھی اگرچہ وہ اسوقت ہم میں موجود نہیں - تاہم ہمارے دلوں میں سمایا ہوا ہے +

ارسطو بڑا ہی جفاکش اور محنتی تھا وہ ایک کام کو ختم نہ کرنے پاتا تھا کہ دوسرے کو شروع کر دیتا تھا اس نے اسقدر کتابیں لکھی ہیں کہ بہت کم لوگوں نے لکھی ہونگی - اگر اسکی عمر زیادہ وفا کرتی تو وہ اور بہت سی باتیں بنی نوع انسان کے فائدہ کیلئے چھوڑتا - کاش ہر انسان ہی جفاکش اور محنتی بنے - فقط

تمام شد

کارخانہ مشہور عالم جنتری شائع ہو کر انعامی سسٹم دوسال سے جاری ہے

کارخانہ کی راستبازی اور پبلک کی قدردانی سے ملک کے ہر ایک حصہ میں ایک لاکھ ٹکٹ فروخت ہو چکا ہے

شرائط

اوّل۔ آپ کارخانہ کے ٹکٹ اپنے شہر کے کسی احباب سے خرید فرماویں بصورت نہ ملنے کے آپ براہ راست کارخانہ میں موازی آٹھ آنے علاوہ محصول بھیجکر چار ٹکٹ منگالیں ❖

دوم۔ پھر ان چاروں ٹکٹوں کو دیگر احباب کے ہاتھ موازی دس دس آنے پر فروخت کر کے مبلغ چالیس آنے وصول کر لیں۔ اسمیں موازی آٹھ آنے تو آپ اپنے خود رکھ لیں اور باقی مبلغ (۳۲) جمع رکھیں۔ پھر آپ اپنے چاروں خریداروں کے نام ٹکٹوں پر معہ مفصل پتہ کے لکھکر کارخانہ میں واپس بھیجدیں۔ اور مندرجہ اشیاء تصویردار میں سے ایک چیز جو پسند خاطر ہو تجویز فرماویں ❖

سوم۔ جس وقت آپکا آرڈر پہنچیگا۔ کارخانہ فوراً انعامی اشیاء حسب الارشاد بذریعہ وی۔پی معہ (۱۶) عدد ٹکٹ کے مبلغ (۳۲) کی آپ کی خدمت میں بھیجدیگا (یہ دو روپیہ صرف اُن (۱۶) ٹکٹوں کی قیمت ہے جو آپ اپنے خریداروں کے لئے منگاتے ہیں جن کی قیمت دو روپیہ آپکے پاس جمع ہے) مگر محصولڈاک انعامی اشیاء کا علاوہ دو روپیہ کے زائد چارج کیا جائیگا جو آپ کو اپنی گرہ سے دینا پڑیگا۔ پس وی پی وصول کر کے انعامی اشیاء آپ خود رکھ لیں اور اپنے چاروں خریداروں کو چار چار ٹکٹ معہ اُن کے ناموں کے سارٹیفکٹ کے دیدیں۔ پھر وہ صاحب بھی اسی طرح یکے بعد دیگرے فروخت کا سلسلہ جاری رکھکر جو چیز چاہیں مفت منگالیں ❖

پتہ۔ سردھاری لعل منجم و جفار سیالکوٹی مصنف مشہور عالم جنتری و مالک کارخانہ آنند کو لاہور

اُردو اخبار

سوشل معاملات میں پر آزادی سے بحث کرکے متانت کو ہاتھ سے نہ چھوڑنا
ہی ہمارا اصلی مقصد ہے۔ بلا لحاظ مذہب وملت ہر شخص کو چاہیے کہ ہندستانی
ہمارا ناپسند کرے۔ ایک ہی نظر سے دیکھتا ہے۔ اسکی صلح کل پالیسی کو پبلک میں
تسلیم کیا جا چکا ہے اور ہندوستان بھر کے اردو اخبارات میں اسے ہی یہ امتیاز خاص
طور پر حاصل ہے کہ آغاز سے آجتک اس نے اپنے اصول کو ہاتھ سے نہیں دیا
ہے اور ہر قوم اور مذہب کے اشخاص جس نظر سے اسے دیکھا ہے۔ وہ ہمارے لیے
فخر کے قابل ہے۔ اسکی بے تعصبی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ تھوڑے
ہی عرصہ میں پبلک کے ایک بڑے حصے نے اسے قدردانی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔
جو ایک خاص گروہ کی حمایت کرنیوالے اردو پرچوں کو خواب میں بھی میسر نہیں
ہوسکتی ہیں۔ مضامین کی خوبی۔ کاغذ کی عمدگی۔ لکھائی اور چھپائی کی نفاست دیکھنے
ہی کے قابل ہے۔ مہینہ میں چار دفعہ شائع ہوتا ہے ان سب خوبیوں پر قیمت
صرف دو روپیہ سالانہ بمعہ محصول ڈاک۔ لطف یہ کہ ایک روپیہ کی کتابیں بھی ساتھ ہی
انعام میں دیجاتی ہیں۔ نمونہ کا پرچہ طلب کرنے پر مفت ارسال خدمت کیا جائیگا
اگر کوئی شخص یکمشت سال بھر کی قیمت ادا نہ کرسکتا ہو۔ تو کم از کم ۸ر تین ماہ
کے لیے اردو اخبار اپنے نام پر جاری کرا سکتا ہے۔

نام اور پتہ مفصل اور صاف حروف میں لکھنا چاہیے۔ جن صاحبوں کے پتے ایک دفعہ
دفتر اردو اخبار میں پہنچ جائینگے۔ انہیں وقتاً فوقتاً نوطبع اشتہارات
اور نئے سال کی جنتری بھی مفت ملتی رہیگی۔

مینجر اُردو اخبار لاہور

اسلام

حضرات یہ دلچسپ رسالہ حضرت نبی کریم علیہ الصلاۃ والتسلیم کی سوانح عمری ہے جسکے دلچسپ ابواب اور شائستہ
مضامین دیکھنے کے قابل ہین اسکی تمام روایتین حدیث نبوی سے ماخوذ اور مستند و معتبر کتب سیر اور عربی کی مشہور
کتاب تاریخ الکامل اور آثار الاول سے منقول ہین۔ اب تک اس عنوان کی کئی کتابین بڑی بڑی قیمت
والی ہماری نظر سے گذرین لیکن باوجود اس قدر قیمت خرچ کرنیکے بھی معزز ناظرین سچی روایتین دیکھ سکے اور
درحقیقت شعرا کے مبالغے واعظین کا رطب ویابس ہین اختلاط مولف کی کوتاہ نظری عربی زبان سے ناواقفیت
وغیرہ امور مضامین کا مباحث ہونے دیا اس وجہ سے ہمنے یہ رسالہ اپنی مشہور حمایل ۲۲+۲۹ کی تقطیع کے موافق
کاغذ پر عام ناظرین کی دلچسپی کے خیال سے کچھ ناول کا طرز ملحوظ رکھکر اسکو طبع کرایا ہے۔ الحمدللہ پہلا حصہ
۲۴۰ صفحہ پر ختم ہوگیا جس مین چاہ زمزم کے نمودار ہونے کے وقت سے لیکر آنحضرت صلعم کے مکہ معظمہ سے ہجرت
کرنے اور مدینہ منورہ مین حضرت ابوایوب انصاری رحمۃ اللہ علیہ کے مکان پر قیام تک کا حال مثلاً بی بی ہاجرہ
کا لق ودق میدان مین آنا قبیلہ جرہم کا وہان آباد ہونا حضرت اسمعیل کا سردار بننا۔ خانہ کعبہ کی تعمیر اپنے
باپ ابراہیم خلیل اللہ کے ہاتھ سے ذبح ہونا۔ اولاد اسمعیل سے حکومت کا جانا پھر عرصہ کے بعد جرہمی سلطنت
پران کا قبضہ ہونا۔ اصحاب فیل کی مکہ معظمہ پر چڑھائی اور بذلت ورسوائی واپس ہونا۔ عبدالمطلب کا
اپنے باپ ہاشم کی ریاست پر حیرتناک انداز سے قابض ہونا اور دوبارہ چاہ زمزم کھودنا۔ اپنے بیٹے عبداللہ
کا اللہ کے نام پر ذبح کرنا۔ آنحضرت صلعم کی ولادت اور عقیقہ اسکے آگے سنہ بسنہ احوال ایام رضاعت
کے حالات۔ طفولیت کے واقعات شق الصدر کا تذکرہ ملک شام کا سفر۔ عبدالمطلب کا انتقال
جوانی کا زمانہ۔ ابوطالب کی کفالت۔ خدیجۃ الکبریٰ سے نکاح۔ خلعت نبوت کا ملنا تبلیغ اسلام
کفار کی ایذا دہی۔ غم کا برس۔ ابوطالب اور ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ کا یکے بعد دیگرے
انتقال۔ شعب ابوطالب کا قیام۔ تین سال کی کلفت اور رہائی۔ حبشہ کی جانب مصیبت زدہ
مسلمانوں کی ہجرت۔ آنحضرت صلعم کی معراج اور اسلام کا یثرب مین پھیلنا۔ بیعت عقبہ اولے وثانیہ۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فیثاغورث

یہ عالی مرتبہ اور گران پایہ حکیم ان فخر روزگار اور ہمیشہ زندہ رہنے والے یونانی فلسفیون مین سے ہے جو یونان کے دور اولین مین تہے۔ سقراط سے ایک سو سال پیشتر اور حضرت ختم المرسلین کے ظہور عالم سے تقریبًا ۱۱۴۰ سال قبل اس فاضل حکیم نے عرصہ عالم مین قدم رکہا فیثاغورث جزیرہ ساموس مین جو ساحل یونان کے مغربی جانب ہے پیدا ہوا تہا۔ یونان مین اس حکیم کا نام مختلف لغوی اختلاف سے مشہور تہا بعض فوثاغورث اور بعض فوثاغورث کہتے تہے مگر سب سے زیادہ فیثاغورث نام مشہور تہا۔

فیثاغورث کے باپ کا نام مینسارچوس تہا اور مقام صور مین رہتا تہا۔ اس حکیم کی مان ساموس کی شریف زادی تہی جسکا نام پوتالیس تہا۔ جو اجقانوس نامی ایک مرفع الحال شخص کی بیٹی تہی۔ مینسارچوس کے تین لڑکے تہے جسمین سب سے چہوٹا فیثاغورث تہا۔ اتفاقًا تین قومین جو تیمیون پیقرون اور سقورون کہلاتی تہین شہر صور پر حملہ آور ہوئین اور یہی تینون قومین صور کی مالک بن گئین۔ تسلط ہونے پر ان قومون نے اصلی باشندون کو جلاوطن کرنا شروع کیا جن مین بیچارہ مینسارچوس بہی معہ اپنی بیوی بچون کے گہر سے بے گہر کیا گیا۔

حکیم فیثاغورث کا باپ اس طرح جلاوطن ہو کے شہر ساموس مین جہان اوسکی سسرال تہی پہونچا۔ اس زمانہ مین اس شہر کا حاکم اندروفلوس نامی تہا جو بہت رحم دل تہا اسنے مینسارچوس پر بڑی مہربانی کی اور اپنے دربار کے مصاحبین مین شامل کر لیا مینسارچوس اپنی قابلیت کی وجہ سے نہایت قابو یافتہ ہو گیا اور حکمران سے یہان تک ربط ضبط بڑہا کہ حکمران نے فیثاغورث کو متبنٰے بنا لیا۔ راوی نے اس فاضل حکیم کو جسکے تم حالات قدیم لکہے ہین بطور خود تعلیم دلائی۔ اندروفلوس نے فیثاغورث کو اخلاق۔ ادب زبان اور علم موسیقی کی تعلیم کے بعد شہر قلبطون کے مشہور حکیم کے پاس علم سند سے تعلیم

علم ہیئات اور نجوم کی تعلیم کے لئے بہیجدیا۔
فیثاغورث کو جب ان تمام علوم مین جسکو اوسنے اندروفلوس کی نگرانی مین حاصل کئے تھے پوری
دستگاہ ہوگئی تو اب اسنے خود اپنی معلومات کو وسیع کرنے کے لئے سفر کی تیاری کی اور اپنے عزیز و
اقارب کو چھوڑ کے علاقہ سوریا کے شہر ویلیون مین جہان حکیم فاراقودس آلہی رہتا تہا چلا
گیا اور اس فاضل حکیم کی شاگردی کا شرف حاصل کیا جب حکیم فاراقودس آلہی کا بہی انتقال ہوگیا
ہمارے علم کے متلاشی کو شہر ویلیون سے بہی رخصت ہونا پڑا اور جگہہ جگہہ کی سیر کرتا ہوا مصر پہونچا
مصر مین آج کل سہ قسم کے خط مروج تھے ایک عام خط تہا۔ اور ایک خط بادشاہون کے لئے مخصوص تہا
تیسری قسم مین وہ خط شمار کیا جاتا تہا جسے سوائے کاہنون اور مذہبی پیشواؤن کے اور کوئی نہ جانتا تہا
فیثاغورث نے مصر مین رہ کے ان تینون قسم کے خطون مین مہارت تامہ حاصل کی اور جب مصر کے
سیر سے فارغ ہوگیا تو شام کی طرف کوچ کیا اور سریانی زبان کے علماء سے استفادہ حاصل کرکے
ارض بابل چلا گیا۔ آج کل یہان کلدانیون اور جلدانیون کا دور دورہ تہا جو ستارہ شناسی
اور ہیئات مین اپنا جواب نہ رکہتے تہے۔ فیثاغورث علم ہیئت خود ہی بخوبی واقف تہا مگر ارض
بابل مین رہ کے اسکا تجربہ اسقدر وسیع ہوگیا کہ کلدانی اور جلدانی ہی اسکے آگے کوئی چیز نہ تہے
ارض بابل مصر شام وغیرہ مین پہرتے پہراتے جب فیثاغورث اپنے وطن ساموس مین واپس
آیا تو اسے معلوم ہوا کہ مصر کے کاہن رموز خداشناسی مین اپنا جواب نہین رکہتے لیکن اس علم کو کاہن
لوگ کسی کو تعلیم نہین کرتے۔ فیثاغورث کو رموز خداشناسی کی تعلیم کا شوق تو پیدا ہوگیا مگر دقت
یہ واقع ہوئی کہ کاہن لوگ کسی کو یہ علم سکہاتے نہ تہے۔ آخر بہت غور فکر کے بعد فیثاغورس نے یہ
تدبیر سوچی کہ بڑی کوششون سے فولوقراطیس سے جو ساموس مین مذہبی پیشوا اور سب سے بڑا پجاری
تہا سفارشی خط لکہوا لیا اور خط لیکے مصر پہونچا۔ مصر کے کاہن اس خط کی تعمیل کرنے پر مجبور ہوگئے اور
فیثاغورس کو اپنے علم کی تعلیم دینے پر راضی ہوگئے کاہنون نے فیثاغورث سے اپنی معلومات کو بہت
کچھہ پوشیدہ رکہنا چاہا مگر ہمارے فاضل حکیم نے اپنی ذہانت سے خود وہ باتین نکال لین جسکا [illegible]

پوشیدہ رکھنا چاہا تھا اور آخر کار بڑی دقت سے رموز خداشناسی کی تعلیم سے فارغ ہو گئے
وطن چلا آیا۔ مصر سے واپس آکے فیثاغورث نے ساموس مین اک دار العلوم قایم کیا اور علم
علم ہندسہ اور حکمت کی تعلیم دینی شروع کر دی۔
علم الٰہی اور معرفت شناسی کا نام فیثاغورث نے فلسفہ کہا تھا اس سے قبل فلسفہ کے لفظ کو کوئی
نہ جانتا تھا۔ اس حساب سے یہ کہنا بالکل ٹھیک ہوگا کہ دنیا مین سب سے پہلا فلسفی فیثاغورث ہوا ہے
خدا کی نسبت اس حکیم کے خیال متصوفین جیسے تھے اور فنا کر انبذقلیس حکیم الٰہی یونانی کے
اصول کا پیرو تھا علم ہندسہ فیثاغورث نے ہی پہلے پہل یونان مین جاری کیا ہے وہ مصر سے
سیکھ کے آیا تھا علم موسیقی کو اگرچہ اس نے غیر قومون سے حاصل کیا مگر یونانی نغمون اور اوس
زبان کی علم موسیقی کی حیثیت سے اسے موجد کا رتبہ حاصل ہے۔ غالباً یہ اسی حکیم کا ایجاد کیا ہوا
مسئلہ ہے کہ علم موسیقی بہ لحاظ اپنی زیر و بم و ترتیب و توالی اصوات کے علم ہندسہ کا ماتحت اور ریاضی
مین شامل ہے۔
فیثاغورث بقاء نفس کا بھی قائل تھا اور ساتھ ہی اسکے دیگر فلسفیان قدیم کی طرح تناسخ کا بھی
معتقد تھا سب سے اہم مسئلہ جو آجکل مشہور ہے اور جسکی وجہ سے فیثاغورث کی عقل و دانائی کی تعریف
کرنی چاہیے نظام فلکی ہے جسمین اوس نے یہ رائے قایم کی تھی کہ آفتاب ایک مرکزی مقام پر قایم ہے اور
تمام سیارے معہ زمین کے اوسکے گرد گھومتے ہین۔ مگر یہ نظام فلکی جسکے سمجھنے کے لئے عقل و غور کی ضرورت
تھی اوس زمانہ مین مقبول نہ ہوا اور برخلاف اسکے بطلیموس حکیم کی رائے جو زمین کو ساکن اور
آفتاب کو متحرک بتلاتا تھا مان لی گئی۔ قرون وسطیٰ تک بطلیموس کی رائے سے سب نے اتفاق
کیا مگر علماء اسلام مین سے ابو یاسر نے بطلیموس کی رائے کی مخالفت کی مگر افسوس ہے کہ اس قابل
کی رائے کو کسی نے نہ مانا۔ لیکن علماء یورپ کی جدید تحقیقات نے ثابت کر دیا فیثاغورث کی
رائے جو ابتداء مین قایم ہو چکی تھی بہت ٹھیک ہے۔
ساموس مین فیثاغورث کے درس و تدریس کو بہت زمانہ نہ گزرا تھا کہ وطن کا رئیس

ٹرا مقتدا ودین فوتوقراطیس کا انتقال ہوگیا اور چونکہ فیثاغورث سے زیادہ کوئی عالم
فاضل عابد-زاہد نہ تہا لہذا سبنے اتفاق کرکے فیثاغورث کو فوتوقراطیس کی جگہہ اپنا
پیشوا مقرر کرلیا فیثاغورث کو مذہبی امام مقرر ہوئے ابہی تہوڑے دن گزرے تہے اوسی خیال
آیا کہ اس قسم کی پابندی اک حکیم کی شان کے بالکل خلاف ہے اس خیال کے پیدا ہوتے ہی-
فیثاغورث اپنے عہدہ سے قطعی بیزار ہوگیا اور وطن کو چہوڑکے ملک اٹالیہ کی طرف
چلاگیا اور وہان کے شہر قروطونیا مین پہونچ کے درس وتدریس کا کام جاری کردیا-یہان
اس نامور حکیم کی اسقدر شہرت ہوئی کہ سواحل افریقہ اور علاقہ بربر تک کے لوگ اسے دیکہنے
آتے تہے حکمران اور بادشاہ اس کی وقعت کرتے تہے-مگر افسوس ہے کہ اس شہرت نے
ہی اس فاضل حکیم کو موت کا مزہ چکہایا-جسکا واقعہ اسطرح پر ہے کہ-
ایک دن فیثاغورث وعظ کررہا تہا کہ قروطونیا کا ایک رئیس جسکا نام قولون تہا اسکے
وعظ مین شامل ہوا مگر جلسہ وعظ مین بہی اس رئیس نے اپنی رئیسانہ تکبر اور امیرانہ نخوت سے کام لیا
وہ جلسہ مین اک ممتاز جگہہ پر بیٹہا ہوا تہا-اسپر بہی ہر ایک شخص کو حقارت کی نگاہون سے دیکہتا
تہا اور سکی زبان حال صاف کہہ رہی تہی کہ مین رئیس ہون اور مجمع کے آدمی میرے سامنے
کچہہ حقیقت نہین رکہتے-فیثاغورث نہ خود تکبر کو پسند کرتا تہا اور نہ وہ جلسہ وعظ مین کسیکو
مغرورانہ حالت مین دیکہنا چاہتا تہا قولون کے اس غرور پر فیثاغورث نے اوسی بری
طرح آڑے ہاتون لیا اور یہان تک اوسے شرمندہ کیا کہ اوسے کچہہ جواب نہ بن پڑا اور
اوٹہہ کے چلاگیا-
قولون اس جلسے سے اوٹہہ کے چلا تو گیا مگر اُسے فیثاغورث سے سخت رنج ہوگیا اور اب وہ
اس فکر مین ہوگیا کہ جسطرح ہوسکے اوسکو یہان سے نکلوا دیا جائے یا قتل کرادیا جائے-
اوس نے تمام لوگون مین یہ مشہور کردیا کہ فیثاغورث بددین اور کافر ہے وہ پوشیدہ
ہمارے دیوتاؤن کو بُرا کہتا ہے وعظ مین لوگون کو اپنے عقائد سے توبہ کرنے کی نصیحت

کرتا ہے۔ اس خبر کے مشہور ہوتے ہی تمام لوگ اس بڈہے حکیم کی جان کے دشمن ہو گئے۔
اس زمانہ مین جبکہ دشمنی کی آگ خوب بھڑک رہی ہتی۔ ایک دن فیثاغورث ایک مکان مین
وعظ کہہ رہا ہتا کہ لوگون کو خبر ہوگئی اور شہر کے مخالفون کی ایک بہت بڑی جماعت نے
اوس مکان کا محاصرہ کرلیا اور بیگناہ حکیم کے صدہا شاگردون کو مار ڈالا۔

خوش نصیبی سے فیثاغورث اس ہنگامہ سے بچ کے بہاگ نکلا۔ اور قروطونیا سے
جان بچا کے فالودنیا مین چلا گیا۔ جب اس جگہہ بہی اسکے دشمنون نے اسکا پیچھا نہ چھوڑا
تو ناچار فیثاغورث کو بہاگ کے میطالونطیون نامی شہر مین جانا پڑا۔ مخالفت کی آگ
چارون طرف لگ چکی ہتی یہ فاضل حکیم اپنے عالم ضعیفی مین ٹہوکرین کہاتا ہوا جہان ہی پہونچتا
ہتا اسکے جان کے خواہان موجود ہو جاتے تہے کہتے ہین کہ جب فیثاغورس میطالونطیون
مین پہونچا تو لوگون نے یہان بہی اسکو پناہ ندی اور مکان کو چارون طرف سے گہیر لیا
آخر کار اس نے یہ سوچا کہ دشمن عبادت خانہ مین مجہے نستاوین گے ہیکل استان مین جو ایک بڑا مندر
ہتا جا چہپا۔ مگر اس بے گناہ پر کسی نے ترس نہ کہایا اور چالیس روز تک محض اس حکیم اور اوس کے
شاگردون کو قتل کرنے کے لئے ہیکل کا محاصرہ کیا گیا اور جب چالیس دن مین بہی فیثاغورث
اور اوسکے شاگردون نے اُس ہیکل سے باہر قدم نہ رکہا تو مجبور مخالفین نے اس ہیکل مین آگ
دیدی جہان فیثاغورث اور اوسکے رفیق شاگرد جلکے رہ گئے۔

لکہتے ہین کہ فیثاغورث بابل کے بادشاہ کورس کے عہد مین جوان تہا۔ فیثاغورث ۲۰ برس
تک وطن مین رہا پہر ملک انطالیہ مین چلا گیا جہان مختلف علوم کے تعلیم دیتا رہا۔ حضرت رسالت
پناہی سے [illegible] سال قبل قروطونیا کے لوگون کے ہاتہ سے شہید ہوا۔

بقراط

بقراط دنیا مین سب سے پہلا شخص ہے جس نے علم طب کی باقاعدہ بنیاد ڈالی۔ اس سے پہلے چند
مخصوص امراض کا علاج اسکے خاندان کے لوگ کیا کرتے تہے۔ اور یہ علاج بقراط کے خاندان

مین ہمدرد تہا بقراط کے باپ کا نام ایرقلیدس بتایا جاتا ہے بقراط حضرت مسیح سے ۴۶۰ سال
قبل مقام قوس مین پیدا ہوا تہا جالینوس کا بیان ہے کہ طب کے علاوہ بقراط علم ہیئت اور
نجوم مین بہی اعلیٰ دستگاہ رکہتا تہا۔ بیماریون کی تشریح اور انکی وجہ بیان کرنی اسی حکیم کا
کام تہا اس سے پہلے ان تمام باتون پر تاریکی چہائی ہوئی تہی۔ سب سے پہلا وہ شخص جسنے امراض
جسمانی کا استقراء و استنباط اور انکا علاج بتلایا حکیم بقراط ہی تہا۔

بقراط نے اپنی تمام زندگی علم طب کے اصول بنانے اور تجربہ اور مشاہدات کے بموجب تشخیص امراض
اور ادویہ کا اثر تحریر کرنے مین صرف کی۔ بقراط کی تاریخ وفات ۳۶۱ سال قبل حضرت مسیح
بتلائی جاتی ہے جو فالج کی بیماری سے واقعہ ہوئی۔

بقراط کے مقام دفن مین مورخین کا بہت بڑا اختلاف تہا۔ مگر اکثر مورخین کا اتفاق اسپر ہے کہ
بقراط کی قبر یونان کے صوبہ تہسلی کے صدر مقام لاریسہ مین ہے حال مین ملکہ معظمہ قیصر ہند کی
وفات پر مقام لاریسہ مین ایک بازار بطور یادگار تعمیر کیا گیا ہے جہان سے ایک پرانی قبر
برآمد ہوئی ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ قبر بقراط کی ہے۔ اس قبر کی خاص نگرانی کا انتظام کردیا
گیا ہے اور یقین ہے کہ اس فاضل اور علم طب کے بانی کا خاکی نشان کچہہ صدیون تک یہان
نظر آتا رہیگا۔

افلاطون

افلاطون حضرت عیسے سے ۴۲۸ برس پہلے پیدا ہوا تہا اور اسکا ظہور دنیا کی پیدائش کے
۳۵۷۴ برس بعد شمار کیا جاتا ہے افلاطون کے والدین بڑے دولتمند نہ تہے بلکہ معمولی طور سے
شریفانہ زندگی بسر کرتے تہے اوس زمانہ مین یونانیون کا قاعدہ تہا کہ جب رعایا مین کسی کے لڑکا پیدا
ہوتا تہا تو اکثر لوگ اسکے قوائے جسمانی اور دماغی قابلیت کا اندازہ کرکے حکم لگاتے تہے اور
چونکہ جنگی قوانین کی پابندی لازمی تہی اور اسیطرح تعلیم علوم نے بہی حد سے زیادہ ترقی کرلی
تہی اسلئے اگر اکثر اپنے اندازہ سے لڑکے مین جنگی یا دماغی قابلیت کا اثر پاتے تو اوسے

چھوڑ دیتے تھے نہیں تو اوسکے ماں باپ سے جبراً چھین کے لڑکے کو فنا کر دیا جاتا تھا۔
دستور کے موافق افلاطون کا بھی ڈاکٹروں نے ملاحظہ کیا اور جب ہر طرح سے اسے ہونہار
دیکھا تو اسکے ماں باپ کے سپرد کر دیا گیا۔ اور یونانی طریقہ سے افلاطون پرورش پانے لگا۔
دس برس کی عمر میں افلاطون کو مکتب میں بٹھایا گیا۔ افلاطون میں ذہنی قابلیت موجود تھی
تھوڑے ہی عرصہ میں مکتب کے دوسرے لڑکوں پر سبقت حاصل کر لی۔ یہانتک کہ استاد نے
اسکو ایسا ذہین دیکھہ کے اسکے خاص طور سے نگرانی شروع کی اور اوسکے خورد ونوش کا خرچ بھی
اپنے ذمہ لے لیا۔ اور اسطرح افلاطون کی متوسط درجہ کی زندگی بسر کرنے والی والدین کو افلاطون
کی تعلیم اور خورد ونوش کی طرف سے اطمینان ہوگیا۔

افلاطون نے تھوڑے دنوں میں نجوم۔ مصوری اور علم موسیقی میں اعلیٰ دستگاہ
حاصل کر لی۔ جب افلاطون کی عمر ۲۵ برس کی ہوئی تو اوسے اپنا وطن چھوڑنا پڑا۔ سبب یہ ہوا
کہ حاکم وقت یہ چاہتا تھا کہ افلاطون انتظام سلطنت میں میرا ہاتھہ بٹاوے اور مشاغل علمی سے
[illegible]سی چیز کو اچھا نہ سمجھتا تھا۔ آخرکار حاکم کے ظلم اور سختی سے تنگ آکے بمقام مغارا۔ اقلیدس
کے پاس چلا گیا۔ مگر جب یہاں بھی بادشاہ کے دست تظلم سے اوسے نجات نہ ملی تو بھاگ کے
بمقام سیرین پہونچا اور یہاں اوسنے تھوڈورس سے جو بڑا نامی ریاضی دان تھا علم
ریاضی کو حاصل کیا۔

جب افلاطون سیرین میں رہتے رہتے اکتا گیا تو مصر کی جانب روانہ ہوا مصر میں پہونچا ہی
تھا کہ یہودی مادریوں سے جو اسکی شہرت پہلے سُن چکے تھے مناظرہ شروع ہوگیا۔ اور جب مادریوں
کی افلاطون کے آگے کچھہ نہ چلی تو وہ اسکے دشمن بن گئے جس سے افلاطون کو مصر بھی چھوڑنا
پڑا اور بھاگ کے گریشیا میگنا میں جو اطالیا کا ایک حصہ ہے چلا گیا۔ جہاں فیلولاس
[illegible]ٹاس ہیر نیم ۳ بڑے مشہور حکیم رہتے تھے جنھوں نے حکیم فیثاغورس کے نام کو زندہ
رکھا تھا۔ گریشیا میں افلاطون ہمیشہ علمی مجالس میں شریک ہوتا رہتا تھا اور زیادہ تر

ان حکیمون کے درس تدریس کا طریقہ دیکہا کرتا تہا یہان کے قیام مین افلاطون کو ہزارہا
تجربے ہوئے جنسے اوسکو خدا کی لازوال قوتون اور کبریائی پر پورا یقین ہوگیا اس سے پہلے وہ
نہ کسی معجزہ کو مانتا تہا نہ اوسے خدا کے وجود پر اعتقاد تہا-
کریٹیا کے رہنے سے جب افلاطون کا جی گہبرا گیا تو جزیرہ سسلی چلا گیا اور ادہر ادہر سیر کرتا
رہا اپنے عمر کے آخری حصہ مین اپنے وطن مقام اتینہس مین واپس چلا آیا اتینہس مین ابہی
تک عایا پر وہی ظلم ہوتے تہے جنکے خوف سے افلاطون نے سفر اختیار کیا تہا اسلئے اوسنے
بجائے اتینہس مین رہنے کے یکی ڈیمی نامی قصبہ مین رہنا اختیار کیا اور سلسلہ تعلیم شروع کردیا
افلاطون نے ۳ فلسفیون کے مشترکہ اصول سے ایک نتیجہ نکال کے اوسے اپنا مذہب بنا لیا تہا
زیادہ تر ہر قلیٹس حکیم کی تقلید کرتا تہا اور بعض مسئلہ مین حکیم فیثاغورث کی رائے سے اتفاق
تہا- اسکا مذہب یہ تہا کہ دنیا کی ہر شے اپنی ضد سے پیدا ہوئی ہے- روح فانی نہین- فرشتونکا
وجود ہے ہر ایک انسان اپنے اعمال کے مطابق سزا جزا کا مستحق ہے- افلاطون تناسخ کے مسئلہ
کو نہین مانتا تہا-

افلاطون جسطرح اور علوم کو جانتا تہا اسی طرح منطق مین بہی اعلی دستگاہ رکہتا تہا- افلاطون
اک زبردست شاعر بہی تہا مگر اسکے اشعار ایسے پیچیدہ ہین کہ عام فہم کا آدمی اونہین سمجہ نہین سکتا تہا
افلاطون کی معاشرت بالکل سادہ تہی نہایت سادہ کہانا کہاتا اور سادہ کپڑے پہنا کرتا تہا
اوسے اپنی صحت کا سب سے زیادہ خیال رہتا تہا افلاطون نے ۲ عورتون سے شادی کی مگر
اوسکی آخری عمر مین اوسکی ایک بیوی بہی زندہ نہ رہی جس عورت سے اوسنے مصر مین شادی
کی تہی وہ قوم کی یہودن تہی کہتے ہین کہ یہ لڑکی گانے مین اپنا جواب نہ رکہتی تہی افلاطون کو
اس عورت کی وجہ سے علم موسیقی مین اور بہی مہارت ہوگئی تہی- اوسکی دوسری بیوی کو نیچرل
سائنس مین کمال حاصل تہا جس سے بڑی مدد ملتی تہی- ۳ لڑکے ہوئے اک تو پڑہ بڑہا کے دہریہ
ہوگیا اور دو لڑکے بالکل جاہل ہے-

شاگرد بہت تھے مگر سہ شاگردون سے جنکا نام اسپیوسی پس - چلیڈن اور ارسطو
تہا اوسے بہت محبت تہی اور تینون شاگردون نے افلاطون سے جو کچھ حاصل کیا وہ بہت شاگرد کو
نصیب نہین ہوا -

فردوسی

فردوسی کا اصلی نام ابو القاسم منصور ہے مگر اسکا تخلص ایسا مشہور ہو گیا ہے کہ بہت کم آدمی ایسے
ہین جو اسکے اصلی نام سے واقف ہون فردوسی طوس کے اک مقام تبادایہ نامی مین ۳۲۹ ہجری
مطابق ۹۴۱ ع پیدا ہوا تہا - اس کا باپ مولانا احمد بن مولانا فخر الدین الفردوسی بہت بڑا
زمیندار تہا - اور طوس کے قریب جوار مین اسکے بہت سے گاؤن تہے - فردوسی عربی علم
مین اعلے دستگاہ رکہتا تہا - علاوہ عربی کے فارسی زبان پہلوی مین بہی مہارت تامہ حاصل
تہی - فردوسی کو بچپن ہی سے شعر و شاعری کی طرف دلچسپی تہی اور وہ ابتدا ہی سے
اسکی طرف رغبت رکہتا تہا - فردوسی کی تصانیف مین سب سے مشہور شاہنامہ ہے
جسمین تاریخ ایرانیون کی جذبات دل اور خیالات کا سچا خاکا اوتارا ہے اور اس سے کیکاؤن
پیشدادی نسل کی ایک فطری حالت معلوم ہوتی ہے -

پانچوین صدی عیسوی مین سب سے پہلے ان واقعات کو ایک ارمنی موسی نامی نے ترتیب دیا تہا
یہ شخص خورانی کا رہنے والا نہایت ہی قابل شخص تہا نوشیروان جو رسول مقبول صلی اللہ
علیہ وسلم کے زمانہ مین بادشاہ تہا اوسکے حکم سے نوشیروان کے خاندانی حالات جمع ہو کر
سرکاری کتب خانہ مین محفوظ ہو چکے تہے ساسانی خاندان کی آخری بادشا یزدجرد کے زمانہ
مین اس دفتر پر نظر ثانی کی گئی اور مزید حالات قلم بند کئے گئے اور دہقان دانشور نے اوسکو
ساتہ اس کو نئی طرح ترتیب دیا اور اس کتاب کا نام خدینامہ رکہا تہا - جو یزدجرد کی سلطنت
کی تباہ اور برباد ہونے پر مسلمانون کے ہاتہ لگا دوسری صدی ہجری مین عبداللہ ابن مقفع
نے اس خدینامہ کا فارسی سے عربی مین ترجمہ کیا - یہ بہت بڑا فاضل ایرانی تہا - دیتا جو

مسلمان ہوگیا تہا۔

جب ایرانی النسل شہزادہ یعقوب ابن لیث نے خلافت بغداد کی حکومت سے سبکدوش ہوکر اپنی علیحدہ بادشاہت ایران مین قایم کی تو اوسکے حکم سے شاہان قدیم کے خیالات جمع کئے گئے اور یعقوب کا شاہنامہ سنہ [illegible] ہجری نبوی مین مرتب ہوا یعقوب کے خاندان کی تباہ ہوجانے کے بعد سامانی خاندان نے عروج پایا اور رئیس خاندان نے بہی پچہلے کارنامون کو عزت کی نگاہون سے دیکہا چنانچہ ایک نہایت فصیح اور بلیغ شاعر جسکا نام دقیقی تہا یہ کام اوسکے سپرد کیا گیا یہ شخص مذہبًا گبر تہا اس نے شاہنامہ کو نظم مین لکہنا شروع کیا تہا کہ کسی نے اوسے قتل کر ڈالا اور یہ کل کام ادہورا رہگیا۔

سامانیون کے خاندان کی بربادی کے بعد محمود غزنوی نے جسکا خاندان ٣٨٨ھ سے ٤٢١ھ تک حکمران رہا۔ ایرانی علم و ادب کو نیا جامہ پہنایا۔ محمود کو شوق پیدا ہوا کہ ایران کے گذشتہ شاہون کے کارنامہ جدید صورت سے نظم مین ترتیب دئے جائین۔ محمود نے اس اہم کام کے انجام دینے کے لئے کچہہ تو اپنے ہمعصر بادشاہون کے ذریعہ سے اور زیادہ تر دہقان کی تحریرات کے امداد سے بہت کچہہ مواد جمع کرلیا تہا مگر ایسے شخص کی تلاش ہی جو زبان پہلوی سے بہی واقفیت رکہتا ہو۔

فردوسی بجائے خود قدیم پہلوی زبان اور تمام دیرینہ دفاتر کا کافی علم رکہتا تہا اور محمود کے دربار مین حاضر ہونے سے پہلے ہی اس نے ایک حصہ نظم مین ترتیب دے لیا تہا۔ جب اس نے دقیقی کے قتل کا حال سنا تو اسے محمود کے دربار مین باریاب ہونے کا شوق ہوا۔ مگر محمود کے دربار مین پہونچنے کا کوئی ذریعہ فردوسی کے پاس نہ تہا۔

جب محمود تخت نشین ہوا فردوسی غزنی پہونچا اور اپنے ایک دوست کی وساطت سے محمود کے دربار مین باریاب ہوگیا فردوسی نے جسکا نام ابوالقاسم منصور تہا اپنا تخلص فردوسی خود نہین رکہا تہا نہ اسکے متعلق کوئی تاریخی شہادت پیش کی جاسکتی ہے کہ اسے

جیسے کہ ابتدا مین کرتا تہا—

جب شاہنامہ تیار ہوگیا تو فردوسی نے آیاز کے معرفت بادشاہ کی خدمت مین پیش کردیا—
محمود شاہنامہ کو دیکہکر بہت خوش ہوا اور فوراً ساٹہہ ہزار اشرفیان (فردوسی کے شاہنامہ
مین ۶۰۰۰۰ اشعار ہین) اپنے وعدہ کے موافق فردوسی کو دیدینے کا حکم حسن میمندی وزیر خزانہ
کو دیدیا مگر اس بدبخت نے اس موقعہ پر اپنی دشمنی سے کام لیا اور بادشاہ کو یہ دہوکا دیا کہ
فردوسی کو اسقدر روپیہ نہ دیا جائے ورنہ شادی مرگ ہو جائے گا۔
بات موقعہ کی تہی بادشاہ کی ہی سمجہہ مین آگئی اور اوس نے آیاز کے ہاتہہ ساٹہہ ہزار درہم فردوسی
کے پاس بہجدیے- فردوسی کو جب یہ معلوم ہوا کہ بادشاہ کی جانب سے وعدہ خلافی ہوئی تو
اوسنے ساٹہہ ہزار درہم کہڑے کہڑے تقسیم کردے کچہہ حمام والے کو جہان وہ غسل کر رہا تہا—
دیدیئے اور بیس ہزار درہم آیاز کی نذر کئے اور باقی روپیہ ایک قہوہ کے پیالے پر انعام
دیدیا اور بادشاہ سے کہلا بہیجا کہ تجہے وعدہ خلافی کسی طرح جائز نہ تہی- بادشاہ
حسن میمندی پر بہت خفا ہوا- مگر حسن حرفون کا بنا ہوا تہا اوسنے کچہہ ایسی باتین بنائین
کہ بادشاہ اولٹا فردوسی سے بگڑ گیا اور غصہ مین آکر حکم دیدیا کہ کل صبح فردوسی کو ہاتہی
سے کچلوا دیا جائے- فردوسی نے جب یہ خبر سنی بہت گہبرایا صبح کو سلطانی باغ مین جاکر
بادشاہ کی منت سماجت کرکے اپنا قصور معاف کرالیا—

فردوسی کا قصور تو معاف ہوگیا مگر اوسے خوف ہوا کہ ایک نہ ایک دن جانکی خیر معلوم
نہین ہوتی اور اس خیال سے اوسنے غزنی کو چہوڑنے کا پورا ارادہ کرلیا- اور ایک مہری
لفافہ جسمین ہجو یہ اشعار تہے- آیاز کو دیا کہ بادشاہ کے روبرو پیش کردینا فردوسی کے
کہنے کی بموجب آیاز نے ۲۰ روز کے بعد وہ لفافہ محمود کو دیا جو دیکہتے ہی آگ بگولا ہوگیا
اور فردوسی کا گرفتاری کا حکم جاری کردیا فردوسی پہلے ہی غزنی سے نکل چکا تہا—
فردوسی اس طرح سے بہاگ کے مازندران پہونچا جہان مالوس شہزادہ جردان نے فردوسی کی بہت

قابلیت رکہتا تہا۔ اور مسلمانون مین سب سے پہلا شخص ہے جس نے ریاضی مین نئی نئی ایجادین
کین اور اس شریف علم کو ترقی دی محمد بن موسی خلیفۃ المامون کے زمانہ مین تہا اس نے
خلیفۃ المامون کے حکم سے اصول جبر مقابلہ مین ایک جامع اور مستقل کتاب تحریر کی۔ یہ نسخہ
سنہ ۸۳۰ء مین لکہا گیا تہا اس نسخہ کا لاطینی مین پہلے ترجمہ ہو گیا تہا مگر اب اوس ترجمہ
کا پتہ نہین لگتا۔ البتہ خاص عربی زبان کا ایک نسخہ یورپ کی خوش قسمتی سے ہاتہ آگیا جو
نہایت حفاظت سے آکسفورڈ کے کتب خانہ مین رکہا ہوا ہے۔ اس کتاب کے دیکہنے سے معلوم
ہوتا ہے کہ بیشک مسلمانون مین سب سے پہلے جبر مقابلہ پر یہی کتاب تصنیف ہوئی اس کتاب
مین غیر زبان کی دوسری کتابون سے ہی مدد لی گئی ہے۔ اور یہ بہی معلوم ہوتا ہے کہ
محمد بن موسی علم ہیئت اور اہل ہند کے تعداد و شمار سے بہی واقفیت تامہ رکہتا تہا کیونکہ ہندو
ریاضی کی بہت بڑی ماہر گذرے ہین اور انہین جبر مقابلہ کا بہی اچہا علم تہا کوئی عجب
نہین کہ محمد بن موسی نے یونانیون سے زیادہ ہندون سے جبر مقابلہ کے اصول اخذ کئے
ہون۔ محمد بن موسی کے پہلے جبر مقابلہ اور ریاضی مین مختلف تحقیقاتین اور نئی نئی ایجادین
ہو چکین تہین اور یونانیون نے اس علم کی خوب چہان بین کرلی تہی۔ اگرچہ اس زمانہ کے
یورپی تحقیقات سے یہ معلوم ہوا ہے کہ جبر مقابلہ کے موجد یونانی نہین ہین مگر کچہ ہو
یونانیون نے اس علم کو ترقی ضرور دی مگر مسلمانون کے ہاتہ سے اندلس فتح ہو جانے پر
ہندسہ حروف اور اعشاریہ کے مشہور ایجاد کا عربون کے سر سہرہ رہا اور یہ ہے خاص معلم
رہے تہے مسلمانان علم ریاضی مین اوسوقت ترقی کر رہے تہے جب تمام یورپ جہالت
تاریکی مین پہنسا ہوا تہا۔

مسلمانون مین ان جدید ایجاد اور نئے نئے اختراعات کا بانی ہمارا فاضل محمد بن موسی تہا
افسوس ہے کہ اس علامہ کی تاریخ پیدائش اور وفات کا صحیح صحیح پتہ نہین چلتا۔

لیکن گرو نانک ۱۴۶۹ء میں پیدا ہوا تھا ۱۵۳۸ء مین اسکی وفات ہوگئی - گرو نانک کو کبیر کی
شاعری مین اسکا پیرو سمجھنا چاہئے -
کبیر کی تصانیف تعداد مین زیادہ ہین - کبیر کی مت والون کے پاس اسکی پوری تصانیف
موجود ہین تعجب کی بات یہ ہے کہ کبیر حالانکہ ایکا مسلمان تہا مگر اوسکے معتقدین مین سے
ہندو زیادہ ہین اور اوسے مثل دیوتا کے سمجھتے مین کبیر کی مشہور تصانیف یہ ہین ساکہین
سبد ہیں اور ریختہ عام طور سے لوگ ان کتابون کو پسندیدہ نظرون سے دیکھتے مین
ان کے علاوہ بہت سی کتابین کبیر کی تصنیف بیان کی جاتی ہین مگر دراصل وہ اوسکی
نہین ہین - مثلاً بیجک بہاگو داس کی لکہی ہوئی ہے سکہ نداہان - سرت گوپال
کی تصنیف سے ہے کبیر کو ہندو بہی مثل دیوتا کے سمجھتے ہین - مگر اوسکے مذہبی اصول کے وارث
زیادہ تر سکھ ہین جو اوسکا نام تعظیم سے لیتے ہین - کبیر کے بعض شاگرد مذہبی پیشوا بہی گزرے ہین
مثلاً داود ایک بڑے مت کا بانی ہے جو اسوقت راجپوتانہ مین پہیلا ہوا ہے - داود نے
زیادہ تر اپنے گرو کبیر کے اصول کی تعلیم کی ہے اور آج تعجب سے دیکھا جاتا ہے کہ اسکے مریدون
کی تعداد ہزارون لاکہون تک پہنچی ہوئی ہے . . . گرنتھ مین جو کبیر کی تصانیف سے ہے
شیخ فرید پاک پٹن کے ملفوظات بہی موجود ہین جو ہندوستان کے بڑے نامور صوفی گزرے
ہین - کبیر کی وفات کا زمانہ قریب قریب سنہ ۱۵۱۸ء ہے -

سورداس

سورداس رامانند کے شاگردون مین سے ایک تہا - اور کبیر سے دوسرے درجہ شمار کیا جاتا ہے
اس کا زمانہ قریب سنہ ۱۵۵۰ء کا تہا سورداس نامی ایک شخص دیوتا کی صورت مین کتاب بہگتا
مالا مین بیان ہوا ہے - اسوجہ سے کہ سورداس کی واقعات زندگی پر پردہ پڑا ہوا ہے -
تحقیق کے ساتہہ نہین کہا جاسکتا کہ یہ سورداس کون تہا اگر یہ شخص وہی ہے جسکا ذکر
بہگتا مالا مین کیا گیا ہے تو قوم کا برہمن تہا - اور شہنشاہ اکبر کی سلطنت مین سندیلہ

خسرو پرویز ساسانی خاندان کے ایک شاہزادہ کے عشق و محبت کا بیان ہے جو ایک
ارمینیا کی شہزادی شیرین نامی پر فریفتہ ہوگیا تھا اور فرہاد سنگتراش جیسے ایک شخص
شخص کی رقابت نے بہت ہی بے چین کر دیا تھا خسرو نے اس رقیب کو بڑی چالاکی سے نیچا
دکھایا ۔

خسرو اور شیرین کی داستان کو۔ تمام عجمی اور ہندی شعراء نے کم و بیش اپنی نظموں میں باندھا
ہے۔ نعمت خان عالی نے بھی اسی قصہ کے متعلق اک کتاب حسن و عشق نامی تصنیف کی
ہے جسمیں اکثر مقامات پر قرآن مجید کی آیتوں سے استدلال کیا گیا ہے۔ داستان
خسرو شیرین کے دیکھنے اور نظامی کے پچھلے حالات زندگی پر نظر ڈالنے سے اک تعجب سا معلوم
ہوتا ہے کہ اک ایسے خدا پرست نے غیر مذہب آتش پرست کی عشق کا افسانہ لکھنے کو کیوں پسند
کیا مگر ہمیں فاضل شاعر کو تصنیف کے وقت اپنی زور طبع کو دکھلانا منظور تھا جسے مذہبی
خیالات نہ روک سکے۔

انسانی جذبات غم اور خوشی یاس اور امید کا کامل نقشہ اتارنے میں اول فردوسی پھر
فخر الدین اسعد جرجانی اور اسکے بعد نظامی ہوا ہے۔ خسرو شیرین ابو جعفر محمد پہلوان والیٔ
آذربائیجان کے زمانہ میں نظامی نے تصنیف کی تھی۔ ابو جعفر کے بعد جب وسکا بھائی
تخت نشین ہوا تو اوس نے نظامی پر بیحد مہربانی فرمائی اور مال و دولت سے سرفراز کیا
مگر باینہمہ نظامی نے دربار کی کشمکش میں اپنی زندگی گزارنی پسند نہیں کی اور وہ اجازت
لیکے اپنی جگہہ واپس چلا آیا اور گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنی شروع کی۔ گوشہ نشینی کے
زمانہ میں نظامی نے اپنا دیوان مرتب کیا جس میں غزلوں اور قصائد کے اشعار کی تعداد
... ۲ تھی۔ مگر افسوس ہے کہ یہ قصاید اور غزلیں ضایع ہو گئی صرف چند قصاید دیکھے
گئے ہیں جنسے نظامی کی لیاقت کا پتہ چلتا ہے۔

حاکم شیروان کی فرمائش سے نظامی نے لیلی و مجنون کو تصنیف کیا اور فردوسی کے شاہنامے

[illegible] و ایک اعلیٰ درجہ کا فلسفی تسلیم کر لیا ہے اور لکھا ہے کہ اسکو ہر شعر مین فلسفہ
[illegible]ٹ کے بہرا ہوا ہے-

مولانا جلال الدین رومی

[ا]نکا اصلی نام محمد بن محمد حسین البلخی ہے لیکن آپ مولانا جلال الدین رومی کے نام
[سے مش]ہور ہین- مولانا گروہ صوفیہ مین بڑے نامور شاعر ہوئے ہین- اپ ۶ ربیع الاول
ہجری مطابق ۳۰ ستمبر ۱۲۰۷ء مقام بلخ پیدا ہوئے تہے-
[قص]بہ خراسان مین آپ کا خاندان عزت اور دولتمندی کے لحاظ سے بڑا نامور تہا-
[یہ] پتہ نہین چلا کہ آپکے جد امجد کس زمانہ سے یہان آکے آباد ہوگئے تہے- انکا سلسلہ
حضرت ابوبکر صدیق سے ملتا ہے اور ایک طرف سے آپ شاہی خاندان
سے ہین کیونکہ خوارزم شاہ سلطان علاؤالدین بن تکش کی بیٹی ملکہ جہان کی شادی
دادا سے ہوی تہی آپکے والد کا نام محمد بہاءالدین تہا جو اعلے درجہ کے طبیب تہے اور
آپکے والد بزرگوار نے ۱۲۱۲ء مین معہ اپنے خاندان کے بلخ سے ہجرت کی ہے انکی
[illegible] سال کی تہی-
[illegible]حہ تک مولانا رومی کے والد ملاتیہ مین قیام پذیر رہے اور پہر از نجان (ارمینا)
[illegible]ئے یہان تہوڑے دن گزرے تہے کہ ایشیائی کوچک کے شہر لارندہ مین آپ اکے
[illegible] کالج کے پروفیسر کرکے بلائے گئے- بہاؤالدین نے اپنی سعادتمند بیٹے کی تعلیم
محنت سے کی جس سے مولانا روم بچپن مین ہی ظاہری اور باطنی علوم ماہر ہوگئے
[مولان]ا روم کی شادی لالہ شرف الدین سمرقندی کی خوبصورت بیٹی جواہر خاتون سے ہوئی
اور بہ سبب اسکے کہ کیقباد شاہ ایشیائی کوچک نے آپکے والد کو اپنے دربار مین طلب
تہا اور یہین انکا خاندان رہنے لگا اس وجہ سے مولانا کے نام کے ساتہ لفظ رومی
[illegible]انہ ہوگیا یہان تک کہ آپ کا تخلص ہی رومی ہوگیا-

جب ۱۲۳۱ء مین آپکے والد کا انتقال ہوگیا تو آپ اس حادثہ کے چند ماہ بعد علا
دمشق مین تکمیل تحصیل علم کے لئے چلے آئے اور یہان پورے طور پر مختلف علوم تحصیل
پیدا کرکے چار مختلف کالجون کے پروفیسر بن گئے علوم باطنی کا اصلی مذاق آپکی ذ
روز ازل سے ودیعت کیا گیا تہا اس لئے کامل نو سال برہان الدین حسینی ترمذی
پاس رہے جو آپکے والد کے اول درجہ کے شاگردون مین سے تہے اسکے بعد شمس الدین
سے فیض صحبت حاصل کیا - جو پہرتے پہرتے ایشیائی کوچک مین چلے آئے تہے -
شمس تبریز کی حالت بہت ترقی کر گئی تہی اور آپکو مسلمانون کے مذہبی حصن کا مطلق خیال
رہا تہا شمس تبریز کے کلیات مین صدہا اشعار ایسے ہین جنسے راسخ الاعتقاد مسلمان اُنکے
بابت اچھے خیالات نہین رکھہ سکتا جیساکہ یہ شعر مشہور ہے -

آدم نبود و من بدم حوا نبود و من بودم

او خود نبود و من بدم من عاشق دیرینہ ام

شمس تبریز کی حالت یہان تک بڑہ گئی کہ جوش محبت مین شریعت کا لحاظ نہ رہا اور
شہر مین فساد ہوگیا اونکا گہر لوگون نے گہیر لیا۔ شمس تبریز کے معتقد خوب خوب لڑے او
ہنگامہ مین مولانا روم کے بڑے صاحبزادے علاء الدین بہی شاہزادون مین قتل
گئے اور شمس تبریز کو بہی خونی نتیجہ بہگتنا پڑا اور حاکم وقت کے حکم سے اونکی کہال کہ
اور پہر دار پر چڑہا دئے گئے شمس تبریز کا آخری شعر جو انکی زبان سے نکلا اوس سے اونکی
جوش کا پتہ چلتا ہے جس نے اونکو شریعت کے دائرہ سے باہر کر دیا تہا -

سر جدا کر دار تنم شوخے کہ با ما یار بود

قصہ کوتاہ گشت ورنہ درد سر بسیار بود

شمس تبریز کی نسبت عام طور پر مسلمانون مین مختلف روایتین مشہور ہین اور بعض
مین اونکا مزار بہی موجود ہے --

جب مولانا نے اپنی روحانی اوستاد کی یہ خوبی قسمت دیکھی اور اپنے دلبند کی نعش کو پارہ پارہ پایا آپ کا دل بیٹھ گیا اور غم کا نیزہ کلیجہ کے پار ہوگیا- آخر آپنے ایک ایسی فقیری مذہب کی بنیاد ڈالی جسکا درجہ رحم اور انکساری مین بہت بڑا ہوا ہے جنہین دنیا کے معاملات سے کچھہ تعلق نہین شب و روز خدا کی عبادت مین لگا رہنا یہ اونکا اصول مذہب ہے- اور اس قسم کے لوگ سلطنت ترکی مین بہت ہین- انکا سب سے پہلا جانشین حسن ہوا ہے جو حسن الدین کے نام سے مشہور ہے ۱۲۷۳ء مین یہ شخص مولانا کے خاص معتمدون مین تہا- مولانا نے حسن الدین کی فرمایش کی موجب فرید الدین عطار کی مثنوی کے مقابلہ مین مثنوی لکھی جو بڑی مقبول ہوئی اور وہ اعظون صوفیون کے جلسون مین خاص طور سے پڑہی جاتی ہے اور عام لوگ بہی اسکو دلچسپی سے پڑہتے ہین- مولانا کی مفصل سوانحعمری شمس الدین احمد کی کتاب مناقب العارفین مین درج ہے جسکے ایک حصہ کا ترجمہ ۱۸۸۱ء مین بزبان انگریزی ہوگیا ہے-

مثنوی کی تصنیف کے بعد پانچوین جمادی الثانی ۶۷۲ہجری مطابق ۱۷ دسمبر ۱۲۷۳ء مین آپ کی وفات ہوگئی-

محمد بن جابر

محمد بن جابر مسلمان نہ تہا بلکہ یہ مذہب صابی کا پیرو تہا محمد بن جابر قصبہ بطن مین پیدا ہوا تہا اور اس وجہ سے البطانی کہلاتا تہا اور عموماً یورپ مین اسی نام سے مشہور رہے خلیفہ معتقدر کے زمانہ حکمرانی مین جابر شام کا گورنر مقرر کیا گیا- اس نامور شخص کی تاریخ پیدایش کا صحیح پتا نہین چلتا مگر اسمین شک نہین کہ اپنے خلیفہ المامون سے پچاس برس بعد یعنے قریب ۸۸۰ء مین اسنے شہرت پائی- مثل اکثر ریاضی دانون کی اوسنے خاصکر علم ہیئت پر محنت کی اور بڑے ہی جوش اور علمی ذوق شوق کے ساتھہ اس مطالعہ کو جاری رکہا اسکے تمام مشاہدات یا تو انطاکیہ مین واقعہ ہوئے یا رقہ مین اسنے علم ہیئت مین بہت کچھہ اصلاحین کین اور اپنی جدید تحقیقات سے کام لیا یہی باعث ہے کہ جابر علماء ہیئت مین ممتاز گنا جاتا ہے

محمد بن جابر کا اندازہ ثوابت کی حرکات کے متعلق بہ نسبت قدما کے زیادہ تر صحیح تھا۔
بطلیموس کے خیال کے بموجب ثوابت ایک صدی مین ایک درجہ اور منجمین عرب کا اندازہ ہے
ستر سال مین ایک درجہ طے کرتے ہین مگر محمد بن جابر کی جدید تحقیقات کے بموجب ثوابت
۶۶ سال مین ایک درجہ طے کرتے ہین جابر نے کرہ آفتاب کی پیمایش کی جس سے زیادہ
صحیح پیمایش نہین ہوسکتی اسکے حساب سے کرہ آفتاب ۳۴۶۵ حصون مین منقسم ہے اور
نصف قطر آفتاب (۱۰۰۰۰) ہے اور یہ حساب بعض جدید ماہران علم ہیئت کے اندازہ
کے بالکل مطابق ہے۔ جس کتاب مین محمد بن جابر کی تمام تحقیقاتین موجود ہین اوسکا
نام زیج صیبی ہے جسکا ترجمہ لاطینی زبان مین ہوا ہے۔ یہ کتاب پہلے بار نورم برگ
مین طبع ہوئی تہی اور خیال ہے کہ ڈیکن کتب خانہ یورپ وما مین یہ کتاب موجود ہے
لایینڈ نے محمد بن جابر کو دنیا کے بیالیس نامور ہیئت دانون مین شمار کیا ہے۔
ابو الفرج کی تحریر کے موافق محمد بن جابر کا سنہ ۳۱۷ ہجری مطابق سنہ ۹۲۹ء مین انتقال ہوا

ابو نصر محمد بن محمد

ابو البشر متی النسطوری جو بغداد مین فلسفہ ارسطاطالیس کا لکچر دیتا تہا اور جس نے
ارسطو کی کتابون کے شرح لکھے ہین اوسکے شاگردون مین ابو نصر محمد ایک مشہور عرب
فلاسفر گزرا ہے جو زیادہ تر الفارابی کے نام سے مشہور ہے کیونکہ وہ ترکستان کے
ایک شہر فاراب کا رہنے والا تہا بعد مین اوس نے بغداد مین فلسفہ کا مطالعہ کیا
آخر دمشق کے دربار ہمدانی مین ۳۳۹ ہجری مین اوسکی زندگی کا خاتمہ ہوا۔
فارابی مین سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اوس نے ارسطو کے فلسفہ کو عربون کے لئے آسان
کر دیا اگرچہ فارابی کی تحقیقات کی بنیاد تمام ارسطو کے فلسفہ کی بموجب ہے مگر اوس نے
اپنی تحقیقات اور ارسطو کی فلسفہ مین افلاطونی تعلیم کو بہی دخل دیدیا تہا۔ اُسکی
انتہائی یہ کوشش رہی کہ اسلام کی اصول کو فلسفہ کے مطابق کیا جائے۔ اور اسی وجہ سے

اسکا طرز فلسفہ تضاد و تخالف سے ایسا پر ہے جیسا اوس کے بیشتر کے فلسفہ دانون کا تہا جنہون
اپنی تحقیقات کی بنیاد قرآن پر رکہی تہی۔

اسوقت تک عربون نے یونانی فلسفہ کو زیادہ تر اوسکی ظاہری حیثیت اور بحث مباحثہ کی
غرض سے پڑہا تہا اور فلسفہ کی اصلی خوبیون کی طرف توجہہ نہین کی تہی اسی وجہ سے بڑے
بڑے مسائل جن پر علماء کے بحث مباحثہ ہوتے رہے وہ حل نہین ہوئے۔ اہل تشیع کا
مسئلہ امامت اور اوسکے ساتہہ ہی مسئلہ فطرۃ اضطراری جو ہند کے تہوسوفی (تصوف)
سے اخذ کیا گیا ہے۔ معتزلیون کی توحید اور کثرت صفات قرآن کی غیر تخلیق ہونے سے
انکار۔ جنپر عباسیون سے بڑے زور شور سے مباحثہ رہے یہ سب مسائل کو ارسطو کی منطق
نے باقاعدہ اور مضبوط بنا دیا۔

جبر و اختیار کے مسئلہ مین جنپر بڑے بڑے معرکہ ہوچکے ہین اور جس مسئلہ مین ایک فریق کا یہہ
اعتقاد ہے کہ انسانی معاملات مین خدا کسی قسم کی مداخلت نہین کرتا اور دوسرا فریق
کہتا ہے کہ انسان کا ارادہ اور قوت اپنے اختیار مین نہین ہے۔ ابو الحسن الاشعری جو
اسلام مین طریقہ فلسفہ کا بانی ہوا ہے حکم بنا اور اس نے اونہین اصول فلسفہ کی بموجب جو
ابی کی جدید تحقیقات کا نتیجہ تہا۔ معتزلیون کے اصول اور فلسفہ کے جواب دئے غالباً
اس شخص کا اثر تہا کہ ایشیائی عربون مین ابی سینا کے زمانہ تک فلسفانہ تحقیقات
بالکل سکون ہوگیا اور نیز معتزلیون کی تعلیم اور اصول بہی رفتہ رفتہ زوال پذیر ہوئے

حکیم ابی سینا

ابن سینا صرف حکیم ہی نہ تہا بلکہ علوم ریاضیات مین جو اختراعات اسکے زمانہ مین ہوئین
عالم مین ایک نئی روح پڑ گئی اسکی تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ ان علوم پر عربون کی کس پہلو سے نظر ڈالی ہو اور کس درجہ
ہونے ان علوم کو حاصل کیا ابی سینا کی زندگی کیا بلحاظ تعداد اور کیا بلحاظ وقت عجیب و غریب
اور مصائب سے پر ہے اوسنے اپنی زندگی مین ایسے حیرت انگیز اور انقلابات پیش آئے

سکا وطن ہے۔ لقمان کا خاندان پہہ زیادہ نامور نتہا بلکہ اسکے والدین
ے آدمی تھے۔ لقمان کے والدین تجارت پیشہ تھے چونکہ اوس زمانہ مین
بڑا مشکل کام تہا اور روپیہ کا خرچ تہا اسوجہ سے لقمان کے والدین اس ناموس
تعلیم نہ دلا سکے بہت کوشش کی مگر بلا روپیہ کے کوشش کیا کام دیتی مجبور
۱۰ برس کا ہوا اوسکے باپ نے لقمان کو ایک چچا کے پاس جو سنگتراشی میں ہوشیار
کہنے کے واسطے بٹہا دیا۔ لقمان کے والدین بت پرست تہے اور اوسکا چچا بت
کے کام مین نہایت دستکار تہا۔ ایکدن لقمان جب سنگتراشی کا کام سیکھ
سکے دلمین یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ پتھر جسکو ہم خود تیار کرتے ہین وہ کیونکر خدا
ہے اور وہ کسطرح پوجنے کے لایق ہوسکتا ہے لقمان کے دلمین یہ خیال پیدا ہوا
ر کے مارے کسی سے ظاہر نہ کر سکا اور اپنے دل ہی دلمین اس مسئلہ پہ غور
ایکدن اوسکے ماں اور تمام گہر کی عورتین کسی شادی مین گئی تہین اور لقمان کو
حفاظت کے واسطے چہوڑ دیا تہا۔ چلتے وقت لقمان کی ماں ہدایت کر گئی تہی کہ
ب دیوتا کو (جسکو لقمان کی ماں پوجا کرتی تہی) پہلے بہوگ کرا لیا کرنا بعد اوسکے
کہانا جب لقمان کی ماں چلی گئی اور کہانا کہانے کا وقت آیا لقمان تیار شدہ
دیوتا کے پاس لیگیا اور اوس سے بہ منت کہا کہ مہاراج کہانا کہا لیجے۔ دیوتا کی جانب سے
جواب نہ ملا لقمان بہت رویا اور گڑگڑایا۔ مگر کوئی آواز دیوتا صاحب نے نہ دی لقمان
کر کہ دیوتا خفا ہین ہاتھ سے نوالہ بنا کر اونکے مُنہ مین دینے لگا مگر جب اسپر بہی دیوتا نے
نہ کہلا اور نوالہ لقمان کے ہاتھ مین ہی رہا لقمان کو بہت خوف ہوا کہ دیوتا ناراض ہو گئے
تو بیٹھ کر خوشامد کرنے لگا بہتیرا اپنے قصور کی معافی چاہی رویا چلایا مگر کچھ جواب
لقمان کو غصہ آیا اور نہائی اوٹھا کر لی اور بت کے ٹکڑہ ٹکڑہ کردئے۔ اور اکیلا کہانا
جب لقمان کی ماں آئی اور اُسنے بت کے ٹکڑہ ٹکڑہ دیکھے اپنا سر پیٹ لیا اور

لقمان سے دریافت کیا لقمان نے کل حال جو گزرا تہا بیہ سنایا - اور یہ بہی کہد
مین نے توڑا ہے ماں چونکہ لقمان سے بہت محبت رکہتی ہتی اوسے کچہہ نہ کہا بلکہ
سے اونکے عقیدہ مین تذبذب پڑ گیا اور سمجہے کہ مہاراج جب ایک بچہ کا کچہہ نہ کر
تو ہمارا کیا کرین گے -

لقمان نے چند ماہ موم بتی بنانے والے کی دوکان پر یہی کام سیکہا - سنگ تراشی
بنانا یہ سب باتین لقمان کی فطرت کے خلاف ہتین اسوجہ سے اوسکی طبیعت ا
نہ جمتی ہتی اور ماں کو اسقدر محبت ہتی کہ اوسے تمام دن لقمان کا گہر سے غایب رہنا
گزرتا ہتا اسی لئے والدین نے لقمان کو موم بتی بنانے والے کی دوکان سے اوٹہا
اور تیرہ چودہ برس تک لقمان یون ہی ادہر ادہر پہرتا رہا - لقمان کا علم کی طر
پہلے ہی رجحان تہا اور وہ چاہتا تہا کہ کسی طرح علم حاصل کیا جائے - چنانچہ بڑی جد
سیموسٹا کے مدرسہ مین لقمان کو اوسکی والدین نے داخل کر دیا جہان لقمان نے علم
کی تعلیم پائی - لقمان کی ذہانت اور طباعی دیکہکر سیاس نامی مصری حکیم نے جو اس مد
کا مہتمم تہا لقمان پر بڑی مہربانی کی اور اوسکا خرچ خوراک اپنے ذمہ لے لیا اور اوسے
بہت کوشش سے تعلیم دینا شروع کیا - لقمان نے سیاس سے علم منطق اور بیان پڑ
کیا اور تہوڑے ہی دنون مین ان دونون علوم مین اعلیٰ مہارت حاصل کری مگر سیاس
کے بیوقت مرجانے نے لقمان کی تعلیم کو ادہورا کر دیا اور اوسکی مصیبتون کا زمانہ شروع ہو گیا
وجہ یہ ہوئی کہ جب سیاس کی وصیت کے موجب اوسکا سارا مال لقمان کے ہاتہہ آیا - تو یہ
دیکہکر اوسکا چچا سنگتراش بال اوڑانے کی فکر مین لگا - اور اس تدبیر مین کامیاب ہو گیا
غرض سے اوسنے لقمان کے ماں سے جاکر کہا کہ چار ہزار روپیہ تمہارے خاوند کے پاس
چاہیئے تہا وہ مر گیا اب تم دو - لقمان کی ماں نے یہ سارا قصہ لقمان سے کہا وہ دوڑا ہوا
چچا کے پاس گیا اور کہا کہ باپ کے پاس کوئی روپیہ کسی کا نہیں چاہیئے آپ کیا فرماتے ہیں

...ہ بہت خفا ہوا اور لقمان خوب مارا اور آخر مین مطلب کی بات یہ کہی کہ سیاس کا مال
خود ہی ہضم کر گئے ہمارا حصہ نہ دیا لقمان نے اپنے چچا کو چچا سمجھ کر یہ کہا کہ وہ مال آپ ہی
لے آپ سارا مال لے لیجے ہمین روٹی کپڑا آپ دیدیا کرین اور ہمین مال کیا کرنا ہے
لقمان کے چچا نے بہت خوشی خوشی تمام مال پر قبضہ کر لیا۔ اور بے ایمانی سے لقمان اور
[illegible]ان کو بالکل تہیدست کر کے کنارہ کشی کر لی مولانا [illegible] نے سیرۃ القمان مین
اس کیفیت کو نہایت فصاحت سے لکھا ہے۔ وہ کہتے مین کہ جب لقمان اسطرح بالکل
تہیدست ہو گیا تو اوسکو سخت پریشانی ہوئی مگر چونکہ علم معانی مین اوسے خوب درک
تھا اسوجہ سے سیاس کی جگہہ لقمان کو دیگئی اور آپ وہ اون شاگردون کو جنکو اوسکا
اوستاد تعلیم دیتا تھا مدرسہ مین تعلیم دینے لگا۔ لقمان کا چچا لقمان کا جانی دشمن تھا اور
جب اوسنے دیکھا کہ لقمان کو ایک اچھی جگہہ مل گئی اوسنے مجسٹریٹ سے جاکر یہ کہدیا سیاس کو
لقمان نے اوسکی جگہہ حاصل کرنے کے واسطے زہر دیا تھا مجسٹریٹ کو لقمان کے چچا سے بہت [illegible]
کی وجہ سے پرانا تعارف تھا اوسنے اوسکی رپوٹ پر لقمان اور اوسکی ماں کو گرفتار کر لیا
[illegible] پیشی کے وقت لقمان کے سچے سچے حالات بیان کرنے سے مجسٹریٹ نے اولٹا لقمان کے چچا کو
ماخوذ کیا اور تمام مال لقمان کو واپس دلادیا اور اوس مدرسہ مین سیاس کی جگہہ پر مستقل
لقمان کو مقرر کر دیا۔

لقمان کو جب روپیہ ہاتھ آگیا تو اوسنے یہ گوارا نہ کیا کہ ایسے شہر مین جہان اوسکا چچا موجود
ہو زندگی گزارے اسواسطے وہ تحصیل علم کے شوق مین اوسے وطن سے سفر کرنا پڑا۔
انطاکیہ پہونچا اور وہان منطق اور دیگر علوم مین درکمال حاصل کیا اور یہان سے
لونیا۔ اور یونان۔ فرانس۔ رومۃ الکبری اور بعد ازان ایتھنس دار الخلافہ یونان
مین پہونچا اور بڑھاپے مین علوم کی کمی کو پورا کرنے کے واسطے مصر چلا گیا۔
لقمان کی تصانیف فلسفہ منطق۔ الٰہیات ہیئات۔ طبیعیات معانی بیان وغیرہ وغیرہ

(نضر

علوم پر بہت کثرت سے ہین جو اب تک قابل دید ہین- لقمان علم ریاضی مین بہی
دستگاہ رکہتا تہا- لقمان کے مذہب کے بارہ مین مشہور ہے کہ وہ دہریہ تہا مگر یہ بات صحیح
نہین ہے مولانا محمد امین نے ایک بسیط بحث کر کے ثابت کیا ہے کہ لقمان خدا پرست تہا
نوے برس کی عمر مین اوسکے دشمنون نے الحاد کا الزام قایم کر کے لقمان کو کتون سے
پہڑوا ڈالا-

ارسطو

ارسطو افلاطون حکیم کے شاگردان رشید مین سے تہا جو اسٹیگیرا مین جو مقدونیا کا
ایک شہر ہے پیدا ہوا تہا- ارسطو کی پیدایش کا زمانہ دنیا سے تین ہزار چہ سو برس قبل
تخمینہ کیا گیا ہے- ارسطو افلاطون کی پیدی چالیس برس بعد پیدا ہوا ہے- اس کا
باپ نیکومیجس جو سکندر اعظم اور فیلقوس کے باپ امنٹس کے ہان امیر الاطبا تہا سکندر اعظم کا
دادا اوسکی بہت عزت کرتا تہا-
سترہ برس کی عمر مین ارسطو افلاطون کے پاس تعلیم کی غرض سے بہیجا گیا اور افلاطون سے
بیس برس تک تعلیم پاتا رہا- اور جب افلاطون کا انتقال ہو گیا تو ارسطو اپنے وطن اسٹیگیرا
مین جہان اوسکے ماں باپ رہتے تہے چلا آیا- ارسطو بیس برس کے بعد وطن مین آیا اور اوسوقت
اوسکے والدین بہی مر چکے تہے اور ایک عجیب انقلاب ہو گیا تہا جسکی وجہ یہ ہوئی کہ اسٹیگیرا کے
گورنر خود مختار ہونا چاہتے تہے جسپر فیلقوس نے اوسپر چڑہائی کر کے شہر کو برباد کر دیا-
ارسطو اپنے اوس اوجڑے ہوئے وطن مین رہکر کیا کرتا وہ مقام ایترنیا جو مائی سیا مین تہی
چلا آیا یہان ہرمیاس جو ارسطو کا ہم مکتب تہا حکمرانی کر رہا تہا اس نے ارسطو کا نہایت
عزت سے خیر مقدم کیا اور ارسطو یہین رہنے لگا یہانتک کہ پتیس نے جو ہرمیاس کی بہن تہی ارسطو پر
عاشق ہو کے اپنی آیندہ آرزوؤن کو پورا کرنے کی امید پر باجازت ارسطو سے پڑہنا
شروع کر دیا اور بالآخر جب ہرمیاس شاہ ایران کے ہاتہ سے قتل ہو گیا تو ارسطو اوس

ی تھی جو ایک نہایت حسین خاتون تھی) کی شادی ہوگئی شادی کو تھوڑا ہی زمانہ گزرا
تھا کہ فیلقوس نے اپنے بیٹے سکندر کی تعلیم کے واسطے ارسطو کو مقرر کیا - ارسطو نے سکندر اعظم
کو وہ تمام باتین جو ایک بڑے حکمران کو ضروری ہین تعلیم دین اور چونکہ سکندر اعظم خود بھی
ایک ہوشیار اور ہونہار لڑکا تھا اوسنے ارسطو سے تمام علوم حاصل کئے - فیلقوس ارسطو سے
یہانتک خوش ہوا کہ اوسکا اوجڑا ہوا وطن پھر آباد کرادیا -

ارسطو کو سکندر اعظم کی وجہ سے دنیا کی تمام عیش و آرام مہیا تھی مگر اوسمین ایک حکیمانہ روح تھی
دوسری افلاطون کی نصیحت کہ حکمت یا علم اسلئے نہین ہے کہ وہ دست بستہ کسی حکمران
کے آگے کھڑا ہو اور صرف یہ کھڑا ہونا علم کی معراج سمجھی جائے کو بھی نہ بھولا تھا ایک دن
بیٹھے بیٹھے اوسکے دل مین یہ خیال گزرا اوسنے اب سفر کا قصد کرکے سکندر اعظم سے اجازت
چاہی سکندر ارسطو سے اسقدر محبت کرتا تھا کہ اوسنے بدقت اوسے اجازت دی
ارسطو رخصت ہوکر ایتھنس جو دار الخلافہ یونان ہے پہونچا اور یہان ایک مدرسہ جاری کرکے
علم معانی اور فلسفہ کی تعلیم شروع کی - یہان ای سوکریٹ حکیم نے علم معانی مین
نہایت شہرت حاصل کر رکھی تھی مگر رفتہ رفتہ ارسطو کی وجہ سے اوسکی شہرت مین کمی
ہوگئی اور تمام ایتھنس مین ارسطو ہی ارسطو مشہور ہوگیا درحقیقت ارسطو کی فصاحت
بلاغت اور طلیت ایسی ہی تھی کہ اوسکے سامنے کسی کا چراغ نہ جل سکتا تھا -

جون جون ارسطو کی شہرت زیادہ ہوتی گئی اوسکے حاسدون کی تعداد بھی بڑھتی گئی
مگر ارسطو کے آگے کسی کی نہ چلی مخاصمت کی وجہ زیادہ تر یہ تھے ارسطو کے فلسفہ نے یونانیوں
کے دیوتاؤن کی پرستش بے بنیاد ثابت کردی تھی اور اس فلسفہ کا عام طور سے چرچا ہوتا
جاتا تھا اس لئے پادری اور پوجاری برانگیختہ ہوگئے اور اونہون نے ارسطو کے پھانسی دینے
کی تدبیرین کین ارسطو کا جانی دشمن اور جگری عدو سیرس کا پادری تھا -
جب سکندر اعظم کا انتقال ہوگیا تو دشمنون کی بن آئی اور اونہون نے محتسب کے پاس

نالش کی کہ ارسطو ہمارے مذہب کی توہین کرتا ہے۔ مجسٹریٹ نے ارسطو کے نام وارنٹ
گرفتاری جاری کر دیا اور پولیس اس مشہور حکیم کو عین اوس وقت جبکہ درس دے
رہا تھا اور سینکڑون شاگرد موجود تھے گرفتار کرکے لے گئے۔ اور افسوس ہے کہ
کوئی مددگار نہ ہوا اور آخرکار پولیس نے ارسطو کو اجلاس مین حاضر کیا اور مجسٹریٹ نے
بعد تحقیقات ارسطو کو جلاوطنی کی سزا دی اور ۳۰ دن کی مہلت دی کہ اتھینس
سے چلا جائے۔

جب ارسطو اس طرح ۶۱ برس کی عمر مین اتھینس سے جلاوطن کیا گیا وہ اتھینس سے
روانہ ہو کر چیل کس پہونچا جہان اوسکی اتھینس سے زیادہ آوبھگت ہوئی اور یہان بھی
اوس سے فلسفہ کی تعلیم کی بابت درخواست کی گئی مگر ارسطو کو فلسفہ کی تعلیم نے جو رنج
پہونچایا تھا وہ تھوڑا نہ تھا۔ اوس نے قطعی انکار کر دیا۔ مگر ارسطو کو اس رنج سے
کہ اوسکے بڑھاپے مین ایسی بے عزتی ہوئی۔ وہ اپنی امیدون مین ناکامیاب ہوا۔
جو تکلیف ہوتی تھی اوسکو وہ برداشت نہ کر سکا اور آخرکار اوس نے اپنے کو ہلاک کرنیکا
فیصلہ کرکے اپنی بچون اور اپنی پیاری بیوی کو اپنے وطن بھیجدیا اور آپ سمندر مین
ڈوب کر مر گیا۔

ارسطو کی وفات کے بارہ مین اختلاف ہے بعض مورخین کا بیان ہے کہ وہ درد قلنج
سے مرا۔ مگر دریا مین ڈوب کر مرنا زیادہ صحیح ہے۔

ارسطو کے ایک لڑکی اور ایک لڑکا تھا۔ لڑکی کی شادی اسپارٹا کے پوتے سے ہوئی
اور بیٹا اپنے باپ کے بعد مختلف الام مین گرفتار رہا۔

ارسطو کی تحقیقات اسقدر وسیع تھی کہ اوس نے ہر مسئلہ اور ہر علوم پر بیسیون کتابین
تحریر کی ہین۔ ارسطو کی تصنیفات پر نظر ڈالنے سے نہ صرف فلاسفی اور علم معانی
کی ذخیرے کا پتہ چلتا ہے علم نباتات اور حیوانات کا بھی ایک وسیع علم اوس مین موجود ہے

ارسطو نے صرف حیوانات کی تحقیق مین پچاس بڑی بڑی کتابین تحریر کی ہین۔ مگر افسوس ہے کہ اس نامور حکیم کی کل تصانیف پیرس کے پادریون کے حکم سے جلا دی گئین۔ مگر پوپ پائیلز پنجم کے عہد مین ۱۳۶۶ء مین پھر یہ بندوبست کیا گیا کہ ارسطو کی تصانیف جمع کی جائین آخر ۱۴۵۲ء مین ارسطو کی تصانیف کا ایک ذخیرہ جمع کیا گیا علم منطق مین ارسطو کا اول نمبر ہے۔ سیبیر و لکھتا ہے کہ ارسطو ہی علم منطق کا موجد تھا لیکن بعض یہ کہتے ہین کہ حکیم زینو نے اس علم کو ایجاد کیا تھا۔

ارسطو کے مذہب کے متعلق صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے اوستاد افلاطون کی طرح وجود خداوند تعالی کا قایل تھا۔

ارسطو کی نسبت یہ نہین کہا جا سکتا کہ وہ بت پرست تھا مگر ساتھ ہی جسطرح افلاطون نے بت پرستی کے خلاف بہت زور نہین دیا۔ ارسطو نے بھی کوئی جد و جہد نہین کی۔ اتھینس مین ارسطو کا گرفتار ہونا اور جلا وطن کیا جانا صرف دشمنی کی وجہ سے تھا کیونکہ ارسطو کی تعلیم بت پرستی کے مخالف تھی کیونکہ اگر یہ بات ہوتی تو ارسطو جلا وطن نکیا جاتا بلکہ اس جرم کی سزا مین صلیب پر لٹکا دیا جاتا۔ ارسطو کے سینکڑون شاگرد تھے جسمین صرف پانچ شاگرد نہایت مشہور ہین۔ تھیوفرٹیس۔ اسٹریٹو۔ لیکن بڑوس کا رہنے والا۔ ایرٹ(؟)۔ کریٹولاس۔ ڈایوڈورس

عمر خیام

عمر خیام اپنے وقت کا ایک قابل ترین محقق علم ہیئت و ریاضی و حکمت ہونے کے علاوہ ایک بے عدیل شاعر گزرا ہے اوسکی شاعری مین زیادہ تر قابل تعریف بات یہ ہے کہ اس مین ہر جگہہ اور ہر مقام پر فلسفیانہ حکمت کوٹ کوٹ کے بھری ہوئی ہے۔ خیام کبھی قید بدعت سے آزاد اور پابندی دین سے علیحدہ ہو کے آزادہ روی اور زندہ دلی کی تعلیم کرتا ہے۔ کبھی اپنے رندانہ وعظ و نصیحت اور قلندرانہ تلقین سے گھبرا کے

اخلاق کے سچے رستہ کی طرف لاتا ہے غرض اوسکی تعلیم بظاہر ایسی متناقص معلوم ہوتی ہے کہ جب تک غور سے نہ دیکھا جائے اوسکے اصلی منشا اور دلی مقصد کا علم ہونا مشکل ہے۔ عمر خیام ایران مین پیدا ہوا اور وہین پرورش پائی۔
اس نامور شاعر کا آبائی پیشہ خیمہ دوزی تہا جسے خود اوس نے بہی مدتون کیا ہے مگر اپنے علم اور ذہانت کی وجہ سے جو اعلیٰ قابلیت شاعری مین حاصل کی اوس زمانہ مین اوسیکا حصہ تہا۔ ہم دلچسپی کے لئے حسب ذیل اشعار ہدیہ ناظرین کرتے ہین۔ خیام زمانہ کے تغیرات کو ایک کہیل سمجہتا ہے اور عالم انقلاب کو ایک تماشہ یہانتک کہ کوئی قوت بہی اوسکے ڈرانے والی چیز نہین وہ لکہتا ہے۔

بشنو زمن اے زندہ یاران کہن
برگوشہ عرصات قیامت بنشین
اندیشہ مکن زین فلک بے سر و بن
بازیچہ چرخ را تماشائی کن

ان شعرون مین خیام سبزہ کی تعریف کرتا ہوا ایک عبرت ناک منظر دکہلا رہا ہے

چون ابر بنوروز رخ لالہ بشست
این سبزہ کہ امروز تماشاگہ تست
برخیز و بجام بادہ کن عزم درست
فردا ہمہ از خاک تو برخواہد رست

زمانہ کی بے ثباتی پر لکہتا ہے۔

ہنگام سپیدہ دم خروس سحری
[illegible] کہ نمودند [illegible] صبح
دانی کہ چرا ہمین کند نوحہ گری
[illegible] بیشبی گذشت و تو بے خبری

خیام [illegible] خیالات کا نمونہ ہے

یارب تو گلم سرشتۂ من چہ کنم
[illegible] ی کہ ازان [illegible]
پشم و قصبم تو رشتۂ من چہ کنم
[illegible] برسر من نوشتۂ من چہ کنم

خیام بر [illegible] زمانہ اختلاف حالات پر خفا ہوتا ہے اور آزادانہ شاعری کا نمونہ دکہلاتا ہے

گر فلکم دست بدی چون یزدان	بر داشتمی من این فلک را ز میان
از نو فلکی دگر چنان ساختمی	کآزادہ بکام دل رسیدی آسان

اپنے گناہ سے شرمسار اور خدا کی رحمت پر نازان ہوکے لکھتا ہے —

از حاجتہ کردگار و زرب رحیم	نومید مشو بجرم و عصیان عظیم
گر مست و خراب بودہ باشی امروز	فردا بخشد ز استخوانہائے رمیم
اسرار ازل را نہ تو دانی و نہ من	این حرف معما نہ تو خوانی و نہ من
ہست از پس پردہ گفتگوے من و تو	چون پردہ برافتد نہ تو مانی و نہ من
اے سوختہ سوختہ سوختنی	اے آتش دوزخ از تو افروختنی
تا کے گوئی کہ بر عمر رحمت کن	حق را تو کجا برحمت آموختنی

خیام نے جس طرف خیال دوڑایا ہے کوئی کسر باقی نہین رکھی دل تو بہت چاہتا ہے کہ اس نامور شاعر کے کل چیدہ چیدہ اشعار ناظرین کے سامنے پیش کئے جائین مگر اس چھوٹے سے رسالہ مین گنجائش نہین —

عمر خیام - حسن صباح و ابو القاسم کا جو بعد مین نظام الملک کے عہد تک پہونچا ہم مکتب تہا سنہ [illegible] ھ مین نیشاپور کے مشہور دار العلوم مین تعلیم پائی اور بعد ازان محمود غزنوی کے شاہی محقق علم ہیئت و نجوم کے عہدہ پر سرفراز کیا گیا اور نیشاپور ہی مین وفات پائی - یہ پتہ نہین چلتا کہ اس مشہور شاعر کی کس سنہ مین وفات ہوئی —

سعید بن مسجح

سعید بن مسجح ایک مکی نژاد شخص تہا - ابو عثمان کنیت تہی اور اون خوش نصیب غلامون مین سے تہا جو ابتدا اً تو شرفاء عرب کی خدمت کے واسطے لائے گئے [illegible] لیکن آخر مین ترقی کرکے جو اپنے آقاؤن کے لئے موجب فخر و ناز بن گئے سعید کو قسمت

کس قبیلہ عرب کا غلام بنایا اس مین اختلاف ہے بعض بنی جمح کو بتاتے ہین بعض بنی نو[illegible]
بن حارث بن عبد المطلب اور بعض بنی مخزوم کو۔
عرب کے اس نامی گرامی پہلے مغنی کو کہتے ہین کہ ایک خوش رو شخص تہا رنگت زرد تہی اور یہ
رنگ عربون کو بہت پسند تہا۔ مگر بعضے لوگ اسے سیاہ فام اور حبشی بتلاتے ہین۔ خیر
رنگت چاہئے جیسی ہی ہو خدا نے ذہن اچہا دیا تہا دانا۔ زکی۔ اور طبیعت دار شخص تہا
آقا انہین وجوہات سے بہت محبت کرتا تہا۔ اتفاقاً ایک دن سعید رقاع عاملی کے یہہ
شعر گا رہا تہا۔

اَلْمِمْ عَلَے طَلَلٍ عَفَا مُتَقَادِمٍ — بَيْنَ الْكَلِيكِ وَ بَيْنَ غَيْبِ النَّاعِمِ
لَوْ لَا الْحَيَاءُ وَ اِنَّ رَأْسِيْ قَدْ عَفَا — فِيْهِ الْمَشِيْبُ لَزُرْتُ اُمَّ الْقَاسِمِ

سعید کا آقا بہی یہ شعر سن رہا تہا اوسنے سعید کو اپنے پاس بلایا اور کہا کہ اس شعر کو پہر گاؤ
سعید نے اپنے آقا کے حکم کی تعمیل مین اس شعر کو پہر گایا اور اس مرتبہ پہلے سے بہی اچہی ادا کیا۔
آقا نے سعید سے دریافت کیا کہ یہ لَے تمنے کس سے سیکہی جواب دیا کہ مین نے اس لَے
مین عجمیون کو فارسی اشعار گاتے سنا تہا لَے اچہی معلوم ہوئی مین نے عربی اشعار پر
کوشش کرکے قایم کرلی ہے۔ سعید کا آقا اسکے یہ جدت دیکہکر بہت خوش ہوا اور
اوسے آزاد کر دیا۔
ابن مسجح کو عجمیون کے گانا سُننے کا کب اور کیونکر موقعہ ملا اسکی نسبت دو روایتین ہین
ایک تو یہ کہ معاویہ ابو سفیان نے مکہ کے مقامات از سر نو تعمیر کرانے کی غرض سے فارسی
معمارون کو بلایا تہا۔ دوسرے یہ کہ عبد اللہ بن زبیر نے خانہ کعبہ کو از سر نو تعمیر کرایا تو عجمی معمار
بلائے گئے۔ ان ہر دو روایات مین سے آخر الذکر روایت زیادہ مشہور ہے غرض سعید
نے ان معمارون سے جو کام کرتے وقت گاتے جاتے تہے علم موسیقی کو حاصل کیا۔ مگر
اس سے ظاہر ہے کہ اسوقت تک جو کچہہ ترقی کی تہی وہ خود رو تہی نہ کسی استاد سے سیکہا تہا

نہ ۔ نکال اوستادفن کو سُنا تہا۔ سعید کو جب آزادی مل گئی تو اُسنے شام کا رخ کیا اور
وہان جاکے عیسائی بڑے بڑے مغنیون سے ملاقات کی۔ رومی زبان کی دہنین سیکھی ۔ قدیم
روما کے اصول موسیقی مین مہارت حاصل کی۔ بربط چنگ بجانے مین دستگاہ پیدا کی شام
سے عراق ہوتا ہوا سعید ایران پہونچا اور یہان کے باکمال ماہرین علم موسیقی کی شاگردی
اختیار کی اور اوسکا مذاق موسیقی معلوم کیا۔ جب گانے بجانے مین پورا کمال حاصل کرلیا تو
سعید ابن مسجح پہر مکہ معظمہ واپس آیا اور سکونت پذیر ہوا۔

اسوقت تک ابن مسجح کی ترقیون کا تعلیمی زمانہ تہا۔ یعنے مروجہ اور مختلف اقوام کی موسیقی
اور اونکی پسندیدہ دہنون اور راگنیون کو حاصل کر رہا تہا۔ مگر اب مکہ مین آکے اوسکے کمالات
کا دوسرا عہد یعنے اجتہادی ترقی کا زمانہ شروع ہوا۔ اب وہ یہ کر رہا تہا کہ جن دہنون کو
عربون کے مذاق اور اونکے طبیعت کے موافق پاتا عربی اشعار مین قایم کرتا اور اس دلکشی
سے اوا کرتا کہ لوگ حیرت مین رہ جاتے۔ یہ حال دیکہہ دیکہہ کے لوگ ہر جگہہ تعریف کرتے تہے
یہانتک کہ عبد الملک بن مروان کے دربار مین شکایت کی گئی کہ سعید کے گانے سے قریش کے
نوجوانون کی اخلاقی حالت خراب ہوئی جاتی ہے اونکو اوسکے گانے سے اسقدر دلچسپی ہو گئی
ہے کہ دوسرا کام نہین کرسکتے۔

اس شکایت سے خلیفہ نے عامل مکہ کے نام حکم بہیجا کہ سعید کی تمام جائداد ضبط کرکے اوسے
میرے پاس بہیجدو۔

خلیفہ کا حکم پہونچتے ہی عامل نے غریب ابن مسجح کی کل جایداد ضبط کرلی اور انہین شام
۔ خلیفہ کے دربار مین حاضر ہونے کا حکم دیاگیا۔ سعید علم موسیقی سیکہنے کے جرم مین
گہر سے بے گہر ہو کے شام مین پہونچے تو انہین یہ دریافت کرنے کی ضرورت ہوئی کہ خلیفہ کے
دربار مین کن کن لوگون کی رسائی ہے۔ آخرکار بڑے تجسس سے اون روسا اور عمائدین کا
پتہ دریافت کیا اور یہ سیدہے اونکے مکان پر پہونچے اور نہایت آزادانہ اون سے

دریافت کیا کہ ایک مجازی غریب الوطن کو اپنا مہمان بنانے مین آپکو تامل تو نہ ہوگا۔ یہ وہ زمانہ تہا کہ صدہا اہل حجاز اپنے اپنے عرض لئے ہوئے دمشق پہونچا کرتے تہے لہذا کسی اجنبی نو وارد کا ایک معزز صاحب مرتبہ کا مہمان ہونا آسان کام نہ تہا خصوص ابن سریج جیسے حقیر صورت شخص کو۔ علاوہ اسکے جن مین قریشی رئیس زادون سے اس مغنی نے درخواست کی تہی وہ اوس روز برق الافق نامی ایک مشہور گانے والی کے یہان ایک جلسہ مین مدعو کئے گئے تہے۔ ابن سریج کی یہ درخواست دو آدمیون کو بری معلوم ہوئی مگر تیسرے شخص نے مہمان نوازی کے خلاف سمجہکے درخواست کو منظور کیا اور اپنے دونون دوستون سے کہا کہ آپ جلسہ مین جائیں مین مہمان کے ہمراہ گہر پر رہونگا۔ ان دونون نے کہا کوئی مضایقہ نہین آپ معہ اپنے مہمان کے جلسہ مین تشریف لے چلئے غرض اس طرح اتفاقیہ ابن سریج کو دمشق مین پہونچکر پہلی صحبت رقص و سرود مین شریک ہونے کا موقعہ مل گیا۔

برق الافق کے گہر پہونچکے ابن سریج نے کہا کہ مین ایک حقیر اور کالا کلوٹا آدمی ہون شاید لوگون کو میرے ساتہ بیٹہنا ناگوار ہو لہذا مین الگ جوتون کے پاس بیٹہا جاتا ہون۔ یہ درخواست ماننے کے قابل نہ تہے مگر جب بہت اصرار کیا تو لوگ مجبور ہو گئے اور ابن سریج ایک ذلیل مقام پر بیٹہہ گئے۔ جب کہانے پینے سے فراغت ہو چکی اور دور شراب چلنے لگا تو دو خوبصورت عورتین درمیان مین ایک چوکی پر آکے بیٹہین اور گانے لگین انکے بعد ایک اور خوبصورت عورت چوکی پر بیٹہی اور گانا چاہتی تہی کہ ابن سریج نے اس عورت کے حسن کی تعریف مین ایک شعر پڑہا جسپر وہ بہت ناراض ہو کے بولی کہ اب مین ایسی گئی گزری ہو گئی کہ ایسا ذلیل غلام میری تعریف کرتا ہے ابن سریج کی اس دلیری کو لوگون نے ناپسند کیا مگر خاموش ہو گئے۔ اب اوس نازنین نے ایک چیز شروع کی اور گلے بازی کا لطف دکہا تی تہی اب آپنے پہر اوسکے گلے کی تعریف کی۔ اسپر برق الافق جو اس نازنین کی ماں تہی جل گئی اور کہنے لگی کہ اگر ایسے غلام تعریف کرنے لگے تو مین شریفون سے ملنے کی قابل نہ رہون گی۔

[illegible] ابن مسجح کا میزبان سخت ناراض ہوا اور کہا کہ آپ تشریف لے جائیے مین ہی گھر پر آتا ہون
ابن مسجح اپنے میزبان کے منہ سے یہ بات سنکے اوٹھ کے چلنے کو تھے کہ لوگون نے بصد منت
بٹھا لیا اور عرض کیا کہ آپ مہربانی فرما کر خاموش بیٹھ جائیے۔
ابن مسجح اس موقعہ پر بالکل خاموش ہوگئے اس عرصہ مین اوس نازنین نے پھر گانا شروع کیا
اور دو تین تانین لی تھین کہ آپ سے نہ رہا گیا اور بول اوٹھے غلط بالکل غلط گا رہی ہے
اور اوسی وہن مین – گا کر سنایا جسے سنکے وہ گھبرا گئی اور بولی کہ یہ بات
سوائے ابو عثمان سعید بن مسجح کے کسی مین نہین اس طرح سے ابن مسجح اس مجلس مین شناخت
کر لئے گئے اور اونکی نہایت عزت و تکریم ہوئی وہ شخص جس نے آپ کو اپنا مہمان بنایا تھا خلیفہ
کے پاس لیگیا اور وہان سے اونکا قصور معاف ہوگیا اور ضبط شدہ جایداد پھر عطا کر دی گئی
ابن مسجح کے مشہور شاگردون مین ابن سریج تھا – ابن مسجح کی وفات کی تاریخ کا پتہ نہین
چلتا مگر اس مین شک نہین کہ وہ ولید بن عبد الملک کے دور تک زندہ تھا –

ابو الصلت امیۃ بن عبد العزیز

ابو الصلت امیۃ بن عبد العزیز کے نام سے بہت کم لوگ واقف ہون گے – یہ اسلام کے عہد
اولین مین سرزمین اسپین کے ایک بہت بڑے زبردست اور نامی گرامی طبیب دقیقہ
رس حقیقت شناس فلسفی جادو نگار اور فصیح البیان ادیب شاعر اور ماہر فن موسیقی گزرے
ہین ابو الصلت سنہ [illegible] ہجری کے قریب شہر دانیہ مین جو اندلس کے مشرقی اضلاع مین
اور مشہور و معروف شہر اشبیلیہ کے قریب واقعہ تھا پیدا ہوئے اور خوش نصیبی تھی کہ سواد
وطن ہی مین نشو و نما پایا – آپنے پہلے قاضی ابو الولید وقشی کی شاگردی کی اور بعدہ دیگر
اساتذہ وطن کے فیض صحبت سے ہر علم و فن مین کمال [illegible] کیا – طب مین جو کمال آپکو تھا
وہ اندلس مین کسی دوسرے کو کم حاصل تھا – ریاضی [illegible] فن وحید زمانہ شمار کئے جاتے
تھے – ادب و شاعری کے اعتبار سے وہ مقبولیت عام [illegible]
[illegible] مین

کوئی اونکے ہم پلہ نہ تہا - ان علوم کے علاوہ علم موسیقی مین ایسی واقفیت و مہارت
پیدا کی تہی کہ عرب کے تمام باکمال لوگون کا نام مٹ گیا تہا - صرف علم ہی نہین بلکہ عملی [illegible]
اس فن کے بہت بڑے اوستاد تہے افریقہ کے تمام مروجہ دہنین اونہین کی قایم کی ہوئی
تہین یہان تک کہ علامہ مصری جو اس نامی گرامی فیلسوف کے پانچ چہ سو برس بعد ہوئے
اپنی کتاب نفح الطیب مین لکہتے ہین کہ بلاد افریقیہ مین آج تک جتنی دہنین مروج اور
مقبول ہین وہ سب ابو الصلت امیہ کے قایم کی ہوئی ہین -

آخر جب انہون نے دیکہا کہ دانیہ اور اندلس مین مجہسے بڑا اوستاد نہین تب اونہون نے سفر کا
ارادہ کیا اور اونیسوین سال عالم شباب مین ۴۸۹ھ ہجری ابو الصلت امیہ اسکندریہ
ہوتے ہوئے قاہرہ مین جو مصر کا دار السلطنت تہا پہونچے مصر اس زمانہ مین حوادث زمانہ
کا اماج گاہ ہو رہا تہا - مصر مین بنی فاطمہ کے خلفار کا دور زوال مین ارہا تہا - دو سال
پیشتر خلیفہ المستنصر باللہ فاطمی جسکے ہاتہہ پر حسن بن صباح نے حاضر ہوکے بیعت کی تہی
جام شہادت پی چکا تہا - خلیفہ کے ولیعہد کو بہی لوگون نے چہوڑ دیا تہا بجائے نزار کے
مستعلی کے ہاتہون پر بیعت کر چکے تہے سبب یہ تہا کہ مستنصر باللہ کے آخر زمانہ مین ایک
ارمنی نو مسلم بدر الجمالی بڑہتے بڑہتے وزیر جنگ اور ساری فوجی قوت کا مالک ہوگیا تہا
اور عام طور پر وزیر الجیوش کے نام سے یاد کیا جاتا تہا - اس وزیر کے مرنے کے بعد خلیفہ
نے اسکے لڑکے افضل کو وزیر جنگ کے عہدہ پر معمور کر دیا تہا - جو تہوڑے دن کے بعد سلطنت
کے تمام سیاہ و سفید کا مالک ہوگیا تہا - کیونکہ خلیفہ عشرت پرست ہوکے محل سے باہر نہ نکلتا
تہا وزیر ہی کل کام انجام دیا کرتا تہا - افضل اور نزار ولی عہد کے درمیان خلیفہ کے
جیتے جی ہی ان بن ہوگئی تہی جب خلیفہ کا انتقال ہوگیا - افضل نے نزار کو نالایق کہکے
نکال دیا اور مستعلی اوسکے بہائی کے ہاتہہ پر بیعت کر لی افضل کے ساتہہ تمام قاہرہ کے
لوگون نے مستعلی کا ساتہہ دیا اور اوسکے مطیع ہوگئے نزار اور مستعلی مین کئی لڑائیان

یا آخر افضل نے نزار کو زندہ پکڑوا کے ایک دیوار مین چنوا دیا اور اب تمام
مین افضل کا ہی طوطی بولنے لگا—
ں یہ ہنگامہ اور تماشہ تہی جنہین دیکہتے ہوئے ابوالصلت قاہرہ پہونچے قاہرہ مین
ی آؤ بہگت ہوئی اور انہین امید ہوگئی کہ اب ایجے کمال مین ترقی کرنے کا موقعہ
مگر افسوس ہے کہ مصر مین آئے ہوئے آپکو چار ہی برس ہوئے تہے کہ ۴۹۲ھ ہجری
ے کروسیڈز کا ہنگامہ بپا ہوا- پیطرس راہب اور گاڈفری رفتہ رفتہ ارض
ں پر قابض ہوگئے اور خاص مسجد اقصے کی زمین ستر اسّی ہزار مسلمانون کے
سے رنگی گئی —
ہنگامے کو دو تین برس گزرے تہے کہ مستعلی مر گیا اور امر باحکام بامر جو
نچ برس کا بچہ تہا مصر کا خلیفہ مقرر کیا گیا ابوالصلت زمانہ کے اس تغیر وتبدل کو عبرت
ہون سے دیکہہ رہے تہے کہ ایک واقعہ عجیب پیش آیا- ہم حیران ہین کہ اس واقعہ کو علا
خوش قسمتی پر محمول کرین یا بدنصیبی پر کیونکہ اس واقعہ نے علامہ مذکور کی قابلیت کو
لک عالم مین مشہور کر دیا اور اسی وجہ سے اس مشہور فلاسفر نے قید کی اذیتین اوٹہائین
ہ تہا کہ ایک تاجر کا جہاز تانبے کی کہیپ لادے ہوئے مصر آرہا تہا کہ بندرگاہ اسکندریہ
پر پہونچکے ڈوب گیا اس جہاز کے ڈوب جانے سے تجار اسکندریہ کے ساتہ دولت مصر
یت بڑا نقصان ہوا جس نے افضل کو پریشان کر دیا تہا- جب جہاز کے ڈوبنے کا
لامہ ابوالصلت کو معلوم ہوا جو اس عہد کے یکتائے زمانہ مہندس اور ریاضی
ے تو انہون نے غور کرکے چند تدبیرون کا مسودہ ذہن مین قایم کیا اور افضل سے
شخص سے کہا کہ اگر آپ روپیہ صرف کرین اور جن آلات اور سامان کو مین کہون
دین تو غرق شدہ جہاز کو مین نکال دون گا—
علامہ مذکور کے مجوزہ سامان کو بخوشی مہیا کرا دیا اور صرف کثیر سے تمام آلات بنوا کے

جب حسب تجویز آلات بن گئے تو علامہ مذکور نے ایک مضبوط جہاز پر وہ کل
جر ثقیل کے اصول پر ترتیب دیا گیا تھا نصب کئے اور غوطہ خوردن کو حکم دیا
مین جا کے غرق شدہ جہاز کے اطراف مین مضبوط مضبوط ریشمی رسیان باند
غوطہ خوردن نے ایسا ہی کیا اور جب غرق شدہ جہاز کے چارون کونون
باندہ دیا گیا تو علامہ مذکور نے مجوزہ کل کے گہمانے کا حکم دیا جسکے گہومانے پر
دیر مین جہاز سطح آب کے برابر آگیا او علے کونے پانی سے باہر نکل آئے لوگ خوش ہو
بجانے لگے مگر افسوس ہے کہ جب جہاز سطح آب پر آگیا تو وہ کل جو گہمائی جا رہی تہی
رک گئی اور اب ہزار زور کیا جاتا تہا مگر جہاز ذرا نہ ادہر تا تہا - علامہ مذکور نے
کیا تہا کہ پانی کے اندر ہر چیز کا وزن بہت کم محسوس ہوتا ہے - لیکن اب جہاز ا
تک آ چکا تہا جہان پانی کا کچہہ امداد نہین پہونچ سکتی تہی بد قسمتی سے حکیم
مہندس نے اپنے اس پہلے تجربہ مین اس بات کا خیال ہی نہ کیا تہا کہ اوپر ا
بعد کیا کارروائی کی جائیگی کاش اوسی وقت پانی او پہولکے تاپنے نکالنے ا
شروع کر دی جاتی تو شاید کچھہ زور چل سکتا مگر نہین ابو الصلت کی غلطی سے
اور زور لگانے کا حکم دیدیا جسکے ساتہہ رسّے ٹوٹ گئے اور جہاز پہر تہہ سے
اس ناکامی کے بعد اگر غور کرنے کا موقعہ ملتا اور سلطنت مدد دینے پر آمادہ ہوتی
علامہ ابو الصلت دوبارہ کوشش سے یقیناً کامیاب ہوتے مگر معاملہ دگرگون
اس ناکامی کو سنکے برہم ہوا اور بجائے اسکے کہ علامہ مذکور کا ناکامی پر حوصلہ بڑہا
اسکندریہ کے کتب خانہ مین قید کر دیا گیا افسوس یہی اسباب تہے جنکی وجہ
قدیم زمانہ مین علم انجنیری اور کلین بنانے کے علم کو کامیابی نہ ہو سکی—
علامہ ابو الصلت اس طرح قید ہو کے کتب خانہ کی سیر کرتے رہے مگر آخر قید قید ہی
ہو کے انہون نے افضل کے چند معتمد علیہ امرا کی شان مین قصیدے لکہنا اور

[illegible] ھ مین قید سے نجات ملی-
[illegible] اسقدر ناراض تھا کہ آسنے اسکندریہ مین انہین نہ رہنے دیا جس سے
[illegible] علامہ مذکور سنہ ۵ [illegible] ھ مین مصر سے قطع تعلق کرکے مہدیہ چلے آئے جو الجزائر
[illegible] وقت اور فرمانروایان بنی منہاج کا دار السلطنت تھا موجودہ حکمران علی
[illegible] نے علامہ موصوف کی نہایت قدر کی اور بالآخر ۵۲۹ھ مین ہمارے
[illegible] ابو الصلت نے دوشنبہ کے روز دنیائے فانی سے کوچ کیا-
[illegible] موصوف کی تصانیف کی بہت کتابین ہین جنکا پتہ شاید ممالک افریقہ وغیرہ مین ملے
[illegible] ہندوستان اور دیگر ولایتون مین انکا ملنا دشوار ہے-
[illegible] موصوف کی تصانیف سے ایک کتاب مفرد قاہرہ کے حالات پر ہے- ایک ادبیہ مفردہ
[illegible] مین شعراء اندلس کا تذکرہ ہے- ایک رسالہ علم موسیقی پر ہے ایک رسالہ
[illegible] پر لکھا ہے ایک رسالہ مین اصطرلاب سے کام لینے کی ترکیب تحریر کی ہے-
[illegible] تصانیف کے علاوہ ایک نایاب رسالہ [illegible] ہے-

سقراط

یونان کا سب سے زبردست سب سے عالی خیال اور سب سے زیادہ نیک نفس فلاسفر
[illegible] کو یونانی سقراطیس لکھتے ہین جسکے معنے انکی زبان مین عدل پرور کے ہین
[illegible] کے باپ کا نام سفرونیعس تھا جو بت تراشی کا کام کیا کرتا تھا ہوش سنبھالا
[illegible] تھا سقراط نے بھی یہ ہی خاندانی صنعت حاصل کرنی شروع کی کیونکہ
[illegible] زمانہ مین بت پرستی عام مذہب ہونے کی وجہ سے یہ پیشہ موجب خیر و برکت سمجھا
[illegible] تھا- لیکن قریطو نامی ایک دولتمند فلسفی نے سقراط کی طباعی اور ذہانت کا اندازہ
[illegible] کرکے اسے تحصیل فلسفہ کی طرف متوجہ کیا اور اس طرح سقراط کو آبائی پیشہ ترک
[illegible] کرنے کا موقع ملگیا- سقراط یونان کے مشہور حکیم فیثاغورث سے مسائل الٰہی در

رموز حکمت سیکھتا تھا۔ اور بندقلیس نام ایک قدیم یونانی حکیم کے اصول کا پیرو
یونانی بادشاہ فلسفیون اور حکیمون کی ایسے ہی قدر کرتے تھے جیسے آجکل کون
مذہبی مقتداون کی کی جاتی ہے لہذا اکثر لڑائی کے موقعون پر انہین تبرکاً اپنے
ہمراہ لے جایا کرتے تھے۔
اسی رسم کے مطابق ایک مرتبہ یونان کا فرمان روا سقراط کو اپنے ہمراہ لے گیا
سقراط بجائے سپاہیون مین رہنے اور اون سے ملنے جلنے کے مقام خلوت مین بیٹھا
رہتا۔ اور جب دہوپ نکلتی تو دہوپ کہانے کو باہر آ بیٹھتا ایک دن اتفاق سے
بادشاہ کا ادہر گزر ہوا جہان سقراط بیٹھا ہوا دہوپ کہا رہا تھا۔ بادشاہ نے
سقراط سے پوچھا آپ میرے پاس کیون نہین آتے۔ جواب دیا۔ فرصت نہین
پوچھا آخر آپ کیا کرتے ہین۔ کہا۔ صرف وہی کام جس سے زندگی قایم رہے بادشاہ
نے حیرت سے کہا کیا بڑی چیز ہے یہ تو ہر وقت آپکے واسطے میرے پاس موجود رہتی ہے
سقراط نے جواب دیا اگر یہی امید ہوتی تو آپکا دروازہ کبھی نہ چھوڑتا۔ بادشاہ نے
اس بات کو چھوڑ کے سقراط سے دریافت کیا مین نے سنا ہے آپ کہتے ہین بت پرستی
سے نقصان پہونچتا ہے سقراط نے جواب دیا نہین یہ تو مین نے نہین کہا بادشاہ
دریافت کیا پھر آپ کیا کہتے ہین۔ سقراط نے جواب دیا کہ میرا تو یہ قول ہے کہ بت پرستی
بادشاہ کے واسطے مفید ہے اور سقراط کے لئے مضر کیونکہ بادشاہ ایسے مذہب کے
سے رعایا کا انتظام کرتا ہے اور خراج حاصل کرتا ہے برخلاف اسکے سقراط کو یقین
ہے کہ بت پرستی سے نہ کوئی نفع ہو سکتا ہے نہ ضرر پہونچ سکتا ہے اوسے تو ایک
خدائے مطلق پر بھروسا ہے جو اوسے روٹی دیتا ہے اور ہر برے بھلے کام کا
بدلہ دیگا بادشاہ نے پھر پوچھا اچھا آپ کو کچھ حاجت تو نہین۔ سقراط نے
جواب دیا۔ اگر حاجت ہے تو صرف اسقدر کہ آپ تشریف لے جائیے کیون کہ

[illegible] سے ہونے سے میری دہوپ اُرگئی ہے —

سقراط نے بہت دنون تک طیاتادا اس نام ایک زبردست فلسفی کی شاگردی کی
[illegible] اپنے فلسفیانہ مذاق مین زیادہ تر اوسی کے نقش قدم پر چلتا تھا۔ سنہ غدا پہنچ
[illegible] اور علوم روحانیہ مین منہمک رہتا سقراط کی زندگی کا طرز عمل تہا دولت وحشمت کو
[illegible] ذلیل خیال کرتا تہا۔ اور فخر و تمکنت کو انسان کا سبسے بڑا عیب۔ اپنے تصوف
کی معراج پر پہونچ کے صدائے توحید بلند کی اور علانیہ بت پرستی کا مخالف ہوگیا
اور بخوف و خطر کہنا شروع کیا کہ ان بتون کی پرستش چھوڑو جو پتھر سے کاٹ کاٹ
کے بنائے گئے ہین — نہ بول سکتے ہین نہ سن سکتے ہین عبادت اوسی خدائے واحد
بزرگ کے لئے ہے جو پاک و صاف ہے سب کا پیدا کرنے والا حکیم و دانا ہے اوسکو
ہر بات کی قدرت ہے۔ اور ہر چیز اوسی کے اختیار مین ہے اوسی کی پرستش کرو۔
یہ خبر جیسے ہی مشہور ہوئی یونانیون کا مذہبی مقتدا بڑے بڑے بت خانون کے پجاری
اور سلطنت کے کونسل کے تمام ارکان بگڑ گئے اور ہر طرف سخت برہمی پیدا ہوئی
آخر کار اشینیہ کے قاضیون اور محتسبون نے بالاتفاق اوسکے واجب القتل ہونیکا
فتوی دیدیا فرمانروائے اشینیہ کو اگرچہ فتوی نہایت ناگوار تہا مگر اوسکے اختیار
سے باہر تہا کہ کونسل کے فتوے کو مسترد کردے تاہم اوسنے اتنی مہربانی ضرور کی
کہ سقراط سے پوچھا۔ آپ جسطرح قتل ہونے کو پسند کرین وہی طریقہ عمل مین لایا جائے
سقراط نے زہر پی کے جان دینے کو پسند کیا اور یہی طریقہ منظور کر لیا گیا — کے
اُن دنون معمول تہا کہ ہرسال ایک جہاز یونانیون کی نذرین اور چڑھاوے لیکے اپالو
مندر کو جایا کرتا تہا اپالو یونان کا سبسے بڑا دیوتا تہا اور جب تک یہ جہاز وہان سے
واپس نہ آجاتا تہا کسی کو سزا نہ دی جاتی تہی موسم کی خرابی اور سمندر مین طلاطم ہونے
کی وجہ سے اس زمانہ مین جہاز کی روانگی کو بہت دیر ہوئی جسکی وجہ سے بیچارہ سقراط

نفہ

جو سالہا سے اشیفتہ مین بدمزاج بیہودہ اور بدتمیز مشہور تھی اس انتخاب سے غرض یہی تھی کہ
اوسکی جہالت پر صبر کرتے کرتے اور بدخلقیاں سہتے سہتے اپنے نفس کو اس قابل بنالے
کہ عوام کالانعام اور خودپرست امرا کی بدتمیزیاں اور سرکشیاں برداشت کی جاسکین
شاید نفس کشی کا اس سے زیادہ مکمل اور سخت نمونہ دنیا مین کوئی اور شخص نہ دکہلا سکا ہوگا
شعرا کی عمر مین اختلاف ہے بعض مورخ ۸۰ برس کا لکہتے ہین بعض کا خیال ہے کچھ اوپر
سو برس تک زندہ رہا اکثرون کا اتفاق ہے کہ جبا وسے زہر سے ہلاک کیا گیا اوسکی عمر
۶۰ برس کی تھی اور یہی قول زیادہ معتبر ہے۔

طالب علی خان عیشی

شعرا۔ دور چہارم مین سے جو فیض سخن مصحفی سے جاری ہوا اوسکی کوئی دوسری مثال نہین
ملتی اور کیون نہ ہو۔ کمال سخندانی اور کہنہ مشقی نے انہین اس مرتبہ پر پہونچا دیا تہا کہ ہر طالب
کمال شاعری ان سے مستفید ہونے کو اپنا فخر سمجہتا تہا۔ خواجہ حیدر علی آتش و مظفر علی خان اسیر کے
اسمارمبارک سے کون واقف نہین۔ یہ حضرت انہین کے ارشد تلامذہ مین سے تہے کرامت علی
خان شہیدی و منور خان غافل کے کلام نے جو شہرت حاصل کی وہ محتاج بیان نہین۔
ان مشاہیر شعرا کے علاوہ شاگردان مصحفی مین اور بہی چند لوگ ایسے گزرے ہین جنکا کلام
شایع نہین ہوا۔ اور اونکی شہرت نہ ہونے پائی لیکن یہ گمنامی اونکے نقص سخن کی وجہ سے
نہین بلکہ یہ اتفاقات عجیبہ کا نتیجہ ہے۔
میر حیدر علی گرم۔ نوراﷲ سلام منتظر۔ محمد عیسی۔ تنہا۔ طالب علی خان عیشی انہین لوگون مین
سے ہین جو اپنے کلام کے شایع نہ ہونے کی وجہ سے مشہور نہ ہونے پائے۔
طالب علی خان عیشی جنکی مختصر سوانح عمری ہم لکہہ رہے ہین ریختہ گوئی مین مصحفی اور فارسی مین
مرزا قتیل کے شاگرد تہے ان کے کلام مین مصحفی اور میر کے کلام کی جہلک پائی جاتی ہے
آپ لکہتے ہین۔

نالہ سو بے اثر ہے دعا ہے سو نا قبول — کیا جانے آگیا تہا وہ نا مہربان کہان
تصور مین مرے کس شوخ کی رنگین ادائی ہے — کہ رنگ اشکہاے چشم جون پا لا حنائی ہے
جہان مین خستگان خاک کے کیا خوب گزری ہے — نہ فرق بادشاہی ہے نہ تمئیز گدائی ہے

اساتذہ دہلی خصوصًا خاندان غالب و مومن مین فارسی ترکیبون کا استعمال اکثر ہے اور بڑی خوبی سے ہے اور علاوہ اسکے کہین کہین بجائے اصل فارسی ترکیبون کے اون کے ترجمہ اردو مین اس دلاویزی کے ساتہہ کئے گئے ہین کہ قدردان سخن ہے کا دل جانتا ہے یہ بات شعراء لکہنو مین بہت کم پائی جاتی ہے لیکن عیشی کا کلام باوجودیکہ عیشی لکہنو ہی مین پلے بڑہے ان تمام خوبیون سے لبریز نظر آتا ہے کہتے ہین۔

ہوا سرمایۂ صد الامان ناصور سینے کا — نا صبح قیامت مرہم کافور سینے کا
کبہی صیاد چہیڑے ہاتہہ کلہے باغبان ڈالے — چمن مین کیا سمجہہ کر کوئی طرح آشیان ڈالے

شور افگندن کا ترجمہ کرتے ہین۔

نہ چہیڑ اے باغبان گل کو مبادا آہ نالہ ہے — چمن مین شور محشر بلبل آتش زبان ڈالے
ہجوم ناتوانی کم نہین تسخیر عیشی کو — کوئی کیون پانون مین اسکے بہ زنجیر گران ڈالے
اوسے آتے جو دیکہا بلبلو نے سیر گلشن کو — گئے سو شکر کے سجدے بچہاکر گل کے دامن کو
جنون نے پائی وحشت آشنا باہر نکالے ہین — مرے دامن سے تانکو عرصہ محشر کے دامن کو

پائی وحشت آشنا کی ترکیب ملاحظہ ہو میر حسن مرحوم صاحب مثنوی نے بہی یہی مضمون کس خوبی سے ادا کیا ہے۔

شب وصل صنم ہے آج اے ہمدم کسی ڈہب سے — گریبان سحر کو ٹانک دیجو دامن شب سے
گریبان گیر گردون ہے غبار راہ محرومی — کسی کی خاک سے جہٹکا کسی ظالم نے دامن کو

یہ اشعار خوبئ ترکیب مین اپنا آپ ہی جواب ہین۔

خوبی شعر مین نزاکت مضمون و لطافت الفاظ کو بہت بڑا دخل ہے اور اساتذہ کامل کے

کلام مین یہ بات خصوصیت سے پائی جاتی ہے کہ وہ جس قسم کا مضمون ادا کرتے ہین
اوسی قسم کے الفاظ استعمال کرتے ہین - میر اصغر علی جان نسیم کی ایک غزل ہے -
دامن تک - گلشن تک - اوس مین عیشی اپنے کو بلبل قرار دیکر شکوہ محرومی کرتے ہین -

چمن مین فصل گل آئی ہے ہین کنج قفس مین ہم - مبارک باد مجھہ کو ڈہونڈ جاتی ہے نشیمن تک

روز ابر مین انتہائے شوق نے نوشی کو کس خوبی سے ظاہر کیا ہے -

برستا ہے جو ابر تر تمنائین ٹپکتی ہین | ڈبو دے آپ نے مین آج ساقی مجھہ کو گردن تک

دامن صحرا کی ترکیب مین جوش وحشت کا اظہار ہے -

یہی وحشت ہے تو اکدن لگا کر آگ گلشن مین | پڑے ہونگے لپیٹے منہ کسی صحرا کے دامن مین

کیسی مرنے کی بد دعا ہے -

جلایا زمزمہ نے اسکے دل ہم دردمندونکا | لگا دے آتش گل کوئی بلبل کے نشیمن مین

جوش بہار کی جنون انگیزیون کی کیا تصویر کہینچی ہے -

کون پابند جنون فصل بہاران مین نہ تہا | اس برس ننگ جوانی تہا جو زندان مین نہ تہا

نازک مزاجی محبوب کو کن الفاظ مین بیان کرتے ہین -

فرش گل پر گر قدم رکہتا ہے وہ نازک مزاج | پانون اپنے پونچھتا ہے چادر مہتاب سے

[illegible] کہتے ہین -

ہستی کا جو اپنے مجھے مختار بناتے | سو بار مٹاتا مین جو سو بار بناتے

نہ کبھی روئے نہ پٹکا سر کو گاہے سنگ پر | مفت اپنا خون ہوا جرم شکست رنگ پر

مین نے عیشی سے جو پوچھا دل پرخون کا حال | اک صراحی مئے گلگون کی بہری دکہلا دی

عیشی کے کلام مین اگر کچھہ نقص ہے تو یہ ہے کہ اونکی اکثر غزلین صرف خوبی ترکیب پر قائم
ہین ورنہ بلندی مضامین کے لحاظ سے اونکا پایہ بہت سست ہے علاوہ اسکے کہین
کہین تعقید لفظی بہی اعتدال سے زیادہ ہے اور اکثر مقامات پر اونکے کلام مین تنزل

ہم کس تہ کس کی شمشیر لئے پہرتی ہے | کہ قضا حسرت تکبیر لئے پہرتی ہے
دی اس فصل مین دیوانہ ہوا ہے شاید | کہ ہوا ہاتہہ مین زنجیر لئے پہرتی ہے
نس گشتہ خدا جانے کہان ہے کہ صبا | خبر لیلے و لگیب لئے پہرتی ہے
پہول یون ہو گئے برباد کہ اب بلبل زار | آرزوے گل تصویر لئے پہرتی ہے
بادہ نوشان خرابات مغان مژدہ کہ آج | مغفرت دفتر تقصیر لئے پہرتی ہے
گل نے کیا بے ادبی کی کہ ترے آگے نسیم | تازیانہ پئے تعذیر لئے پہرتی ہے
ضعف ہر چند کہ زنجیر قدم ہے عیشی | گردش خامہ تقدیر لئے پہرتی ہے

علامہ محمد تقی یرغانی

آپ کا اسم شریف محمد تقی - ملقب بہ شہید ثالث - والد بزرگوار کا نام محمد یرغانی قزوینی تہا آپ موضع یرغان مین پیدا ہوئے تہے اور اسی وجہ سے آپکو محمد تقی یرغانی کہتے ہین اس بات کا پتہ نہین چلتا کہ آپنے اپنا اصلی وطن کیون چہوڑ دیا کیونکہ آپ کی پیدایش تو یرغان مین پائی جاتی ہے مگر بعد اسکے مقام قزوین مین آپ سکونت پذیر رہے اور تاریخ سے ترک وطن کا کوئی سبب معلوم نہین ہوتا - آپ کی ابتدائی تعلیم مقام قزوین ہی مین ہوئی مگر بعد ازان اصفہان اور عتبات عالیات مین تکمیل حاصل کی عتبات مین سید علی بن سید محمد طبا طبائی صاحب شرح کبیر کے درس مین برابر شریک رہے - آپ کو جسقدر تحصیل علم کا شوق تہا دوسرے کو ہونا مشکل ہے جس زمانہ مین آپ اصفہان مین تعلیم پا رہے تہے آپ پر تنگدستی نے غلبہ کر رکہا تہا - دو دو دن کے فاقہ گزرتے تہے - اکثر بہوک سے تنگ ہو کے خربزہ کے چہلکون پر جنکو لوگ پہینکدیتے تہے شکم پری کر لیا کرتے تہے - مگر اس فاقہ کشی اور تکلیف کے زمانہ مین تحصیل علم مین کبہی غفلت نہین کی اپنے ہمعصرون سے ہمیشہ ممتاز رہے - ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ آپ پر کئے فاقہ گزر گئے اور کچہہ غذا میسر نہوئی - کچہہ پیسے

فوراً تعمیل کی گئی مگر مجرم کو ملا سے ناحق دشمنی ہو گئی اور اسنے چاہا کہ ملا کو قتل کرے
ملا سے قتل کے لئے اس شخص کو سوائے عبادت کے وقت کے دوسرا اچھا موقعہ نہ ملتا تہا
اسی لئے ایک دن جب ملا اپنے کتب خانہ مین مشغول بہ عبادت تہے اس نے چاہا کہ ملا کو
قتل کر ڈالے مگر جب اوس نے کتب خانہ کے دروازہ کے اندر قدم رکہا تو اسے ایسا
معلوم ہوا جیسے کسی نے پیچھے سے اسکی کمر پکڑ لی اسنے مڑ کر ادہر ادہر دیکہا جب کسیکو نہ پایا
تو اس حادثہ کو ایک خیال اور وہم سمجھکے پہر اندر جانے کی کوشش کی- تین دفعہ
اسنے کوشش کی مگر تینون دفعہ اسکو یہی معلوم ہوا کہ کسی نے پیچھے سے کمر پکڑ لی
ہے- جب سہ دفعہ ایسا معاملہ پیش آیا تو اسے ملا کی کرامت کا فوراً یقین ہو گیا اور
بہ صدق دل سے اپنے خونی ارادہ سے باز آیا اور پہر اندر جانے کی کوشش کی اس مرتبہ
اسکو کسی قسم کی حرکت محسوس نہین ہوئی اور یہ سیدہا ملا کے خدمت مین چلا گیا اور معافی چاہی-
دوسرا واقعہ بہی ایسا ہی پیش آیا کہ اپنے قزوین مین ایک تاجر پر حد شرعی جاری کی
تہی اور اوس تاجر نے آپکے قتل کا پورا ارادہ کر لیا تہا- مگر جس رات اوسنے ملا کے قتل
کا سامان کیا اوسی رات اوسکے گہر مین آگ لگ گئی اور تمام گہر جل کے خاک سیاہ ہو گیا
ملا شیعی علماؤن مین سے مستند عالم شمار کئے جاتے ہین اور آپ کو دیگر شیعی علماء
پر خاص فوقیت ہے- آپ شہید ثالث کے نام سے زیادہ مشہور ہین-
آپ سنہ ۱۲۶۳ مین فرقہ وہابی کے ہاتھ سے شہید ہوئے- آپ نماز مین مشغول تہے
کہ دشمنون نے آپ کی گردن پر ایک نیزہ مارا- پہلا نیزہ کہانے پر آپ عبادت
خداوندی مین برابر مشغول رہے مگر ادہر نماز ختم ہوئی ادہر آپکے دوسرا نیزہ
لگا جس سے آپ بیتاب ہو گئے طاقت بشری نے جواب دیدیا سنبہل نہ سکے سجدہ سے
سر اوٹہا کے پوچہا کون ہے اور مجہے کس گناہ پر قتل کیا جاتا ہے- ملا کے اس سوال
کا جواب کچہہ نہ دیا گیا- اور تیسرا نیزہ آپکے منہ پر پڑا جس سے طاقت کلام بہی جاتی

اور سینہ خون کی کلیون سے بہر گیا جب آپ نے دیکہا کہ میرے خون سے مسجد
ناپاک ہوتی ہے بخیال تعظیم خانہ خدا محراب عبادت سے اٹہے اور مسجد تک
آئے مگر ضعیفی اور زخمون کی اذیت نے آگے نہ چلنے دیا اور آپ زمین پر گر پڑے۔
جب آپکے ورثا کو اس جانگزا واقعہ کی خبر ملی تو وہ اونہا کے لے گئے اور ملا دو
دن تک بستر بیماری پر تڑپ تڑپ کر گلزار جنان کو سدہارے۔
آپ کو عتبات عالیات مین دفن کرنے کا ارادہ تہا لیکن اہل قزوین نے اس شرف
ہاتہ سے نہ جانے دیا اور جوار شاہزادہ حسین مین آپ مدفون کئے گئے۔

ادریسی

علم جغرافیہ جاننے والون مین فاضل شریف ادریسی کا رتبہ سب سے بڑہا ہوا ہے
اکثر مورخون کی رائے کے بموجب عربون مین سے پہلا شخص جس نے جغرافیہ تحریر کیا
وہ یہی کہنے والا تہا۔ اوسکو جغرافیہ کے اصولون سے واقفیت نہین تہی صرف
اوس نے بدو قوم کے حالات اور قبائل عرب کی زندگی اور طرز معاشرت کو
بیان کیا تہا اور کچہہ حالات شمس وقمر وکواکب اور رات ودن کے گہٹنے بڑہنے
کے متعلق قلمبند کئے تہے اور جہان تک اوسکا علم اوسے مدد پہونچا سکا عرب کے
جنگلون پہاڑون کا حال بہی تحریر کیا۔ اس لحاظ سے ہم ادریسی کی نسبت یہ تو نہین
کہہ سکتے کہ یہ علم جغرافیہ کا موجد ہے۔ مگر پہر بہی جن اصولون پر اسنے جغرافیہ کو
تحریر کیا اوس مین اور سب سے پہلے رسالہ مین زمین آسمان کا فرق ہے اور اس
سبب سے یہ ماننا پڑیگا کہ گو ادریسی جغرافیہ کا موجد نہ ہو لیکن علم جغرافیہ کی ترقی کا باعث
ضرور ہوا۔ یہ فاضل بزرگ ۴۹۳ ہجری مین بمقام شہر سبتہ پیدا ہوا تہا اور دارالخلافہ
قرطبہ کے شاہی دار العلوم مین تعلیم پائی۔ ادریسی کو علم ہیئت فلسفہ اور جغرافیہ
مین اعلی درجہ کی قابلیت تہی۔ یہ تمام علوم ادریسی نے شاہی دار العلوم مین سیکہی

ادریسی نے علوم وفنون کی تکمیل کے بعد اپنی تجربہ کو وسیع کرنے کے لئے سیاحت
شروع کی اندلس اور سواحل افریقہ کی سیاحت کے بعد شام کے راستہ سے
قسطنطنیہ وارد ہوا اور اناطولین علاقہ کی سیر کرتا رہا پھر یورپ کی سیر کرتا ہوا
جزائر صقلیہ مین پہونچا اور لندن فرانس اٹلی کے خوب سیر کی ادریسی کی
زندگی کا خاتمہ سیاحت مین ہی ہوا اس سبب سے تاریخ و مقام وفات کا پتہ نہین چلتا-
ادریسی نے چاندی کا کرہ زمین بنا کے تمام ممالک کا نقشہ حدود اور اقالیم سبعہ
کو اسپر ثبت کیا تھا- اسی نقشہ کے موافق اس نے اپنی کتاب کو تصنیف کیا اور
نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق نام رکھا اس چاندی کے کرہ پر جو نقشہ تھے
اونسے ادریسی نے اپنی کتاب مین ۹۰ نقشہ لکھے ہین- اور آثار اسلاف اور سیاحون
کی شہادتون سے ان نقشون کی صحت کو مدلل طور سے اپنی کتاب مین تحریر کیا ہے
یہ نقشہ جو آج کل یورپ کے ملکون مین عام مدارس مین پڑھائے جاتے مین اسی
فاضل کی ایجاد ہین-

ادریسی کی کتاب کے مختلف نسخہ ہین کیونکہ ادریسی کی یہ عادت تھی کہ جب ایک
نسخہ کو زیادہ طول ہوجاتا تھا تو اسے مختصر کرنے کے لئے ختم کر دیتا تھا- اور اوسکی
نقل عام طور سے مشتہر ہوجاتی تھی- لوگ اوسکی تصانیف کو نہایت قدر کرتے اور
دلچسپی سے دیکھتے تھے-

آج کل اس کتاب کے دو ضخیم نسخہ ان اصلی نسخون سے پیرس مین موجود ہین اور
ایک نسخہ کا ترجمہ فرانسیسی زبان مین ہوکے ۱۸۳۶ء مین شائع ہوچکا ہے
اس کتاب مین جو حصہ اسپانیہ اور افریقہ کے متعلق ہے اوسکو فرنچ زبان مین
ترجمہ کرکے اکسفورڈ یونیورسٹی نے اپنے کورس مین داخل کرلیا ہے لیکن اس پر
بہت سے حواشی اپنی طرف سے بڑھا دیے تھا- یہ کورس لیڈن کے مطبع مین

یا گیا ہے —
سل کتاب یا اوسکے متعدد نسخہ جو عربی مین ہین کہین نہین چہپے —

ی

رخان عرب مین جو شہرت طبری کو فن تاریخ کی وجہ سے نصیب ہوئی وہ کسی کو نہ
ہنین ہوئی اکثر واقعات جو طبری نے اپنی تاریخ مین لکہے ہین وہ چشم دید واقعات
ن - طبری نے اون تمام روایات کو اچہی طرح اون اصولون سے جو اوس زمانہ
مروج تہے جانچا ہے جس روایت کی اُسے سند نہیں ملی اُس پر اعتبار نہیں کیا
ری ان مورخون مین سے نہیں ہے جو ایک واقعہ کی نسبت جو مختلف روایتیں
ہیں بہم پہنچین لکہہ دیتے ہیں اور جو اس مین کوئی تنقید او تحقیق نہین کرتے
ری نے بعض روایتون کی تحقیقات کرکے یہہ بہی لکہہ دیا ہے کہ کیون یہ روایت
یا واقعہ قابل اعتبار نہیں سمجہا اور یہ کہ کس طرح اور کن اصولون سے اُن کی جانچ
کی گئی -

سول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ مین اور نیز ہجرت سے سو برس کے
اندر کوئی کتاب احادیث کی ترتیب نہیں دی گئی تہی اس لئے کہ عربون کا قوت
حافظہ بہت بڑہا ہوا تہا اور وہ قول رسول کو اپنے حافظہ مین رکہنا کتابی صورت
مین لانے سے زیادہ اچہا سمجہتے تہے سنہ ۱۱۰ھ مین بعد وفات خلفاء اربعہ مدینہ منورہ
مین جب ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی گئی اس وقت سے احادیث رسول کی ایک
مستقل بلکہ قریب قریب کتابی صورت قایم ہوگئی - کوئی ایسی کتاب جو سو برس
کے اندر ترتیب دی گئی ہو دستیاب نہین ہوئی لیکن دوسری صدی ہجری مین
کتابین ضرور ترتیب دی گئین اور اُن مین جو روایتین اور احادیث درج کی
گئین اُن کے لئے کافی مصالحہ موجود تہا - مثلاً مختلف قسم کی دستاویزین عہد نامے

خطوط۔ احکام۔ فتاوے۔ وغیرہ وغیرہ۔ سب سے پہلی تاریخ حضور انور رسول خدا
صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے سوانح عمری کے طور پر ابن اسحاق کی لکھی ہوئی ہے جسکی وفات
۱۵۱ھ مین ہوئی۔

طبری کی خوش قسمتی تہی کہ ـــ اس سے پہلے جو مورخ گزرے انہون نے بہی حتی المقدور
تاریخ کے لکھنے مین خوب چہان بین کی مگر طبری نے اپنے زمانہ مین پچہلے مورخون کی تاریخ
سے ہی مدد نہین لی بلکہ ان تمام واقعات کو اچہی طرح جانچا ہے۔

طبری کا پورا نام ابو جعفر محمد بن جریر الطبری تہا اس کے حلیہ کی نسبت بیان کیا گیا ہے
کہ گورا رنگ بڑی بڑی آنکہین لمبا قد اور جسم چہریرا تہا۔ یہ بہی بیان کیا گیا ہے کہ
مرتے دم تک طبری کی ڈاڑہی موچہین سفید نہین ہوئین۔ اس مشہور مورخ کی تعلیمی
حالات کی نسبت کسی تاریخ سے پورا پتہ نہین چلتا۔

طبری ۲۲۴ہجری مطابق ۸۳۸ء طبرستان کے ایک شہر مین پیدا ہوا۔ بچپن مین ہی
بغداد چلا آیا اور اس زمانہ کے مشہور اساتذہ کے حلقہ درس مین شامل ہو گیا پہر شام
مصر کا سفر کیا جہان وہ ۲۶۳ھ مین موجود تہا۔ پہر وہ بغداد چلا آیا اور یہان اپنے
زمانہ وفات تک قیام پذیر رہا اس کی وفات ۳۱۰ہجری مطابق ۹۲۳ء مین ہوئی
اول درجہ کا محنتی اور ہوشیار تہا۔ اس کے ہزارہا شاگرد تہے اس نے چالیس سال تک چالیس
صفحے روزانہ برابر لکہے اگرچہ یہ بات مبالغہ سے خالی نہین مگر طبری کی اتنی بڑی ضخیم کتاب خود
اسکی شہادت دیتی ہے کہ اس کا مصنف کس درجہ محنتی تہا۔ کہتے ہین کہ موجودہ تاریخ
طبری جو اس وقت پیرس مین طبع ہوئی اور جس کی بیس جلدین ہین کامل تاریخ نہیں
ہے اس مین کچہ شبہہ نہین کہ طبری کی کامل تاریخ یورپ یا مصر مین نہین پہنچی۔ جتنے
اجزاء اس تاریخ کے مل گئے اس کو ایک جگہ ترتیب دیکے جمع کر لیا گیا ہے ۱۳۰۲ھ مین
جو کتاب طبری کی تاریخ کی ترتیب دی گئی تہی لندن مین طبع ہوئی۔ اس مین ہزار ...

[illegible] صفحے -

[illegible] ہین کہ طبری کے اصل مسودہ کا یہ ایک حصّہ ہے - یہ بہی تحقیق ہوا ہے کہ طبری نے بطور ضمیمہ اپنی کتاب کے ساتھ ان محدثون - راویون اور مورخون کی ایک فہرست ترتیب دی تہی جس سے اس نے مضامین اخذ کئے ہین - جو نسخہ لندن مین چہاپا گیا اس مین بہی اس ضمیمہ کا خلاصہ دیا گیا ہے -

پیرس مین طبری ایک تو عربی زبان مین جمع ہوئی ہے اور ایک فرانسیسی زبان مین مگر جس طبری کا فرانسیسی زبان مین ترجمہ ہوا ہے وہ واقعی ایک عجیب وغریب کتاب ہے فاضل مترجم نے اُن واقعات کو جنہین طبری نے روایتون کے رنگ مین لکہا تہا تاریخی طرز وانداز کا جامہ پہنا دیا اور بیچ مین سے تمام راویون کے نام اُڑا کے مضامین کا سلسلہ ایک باقاعدہ علم ادب مین کر دیا ہے جس سے طبری کی بڑی بہاری وقعت ہوگئی -

طبری کے بعد جو مورخ مثل رازی - مسعودی - ثعالبی وغیرہ گزرے ہین انہون نے نہ صرف طبری کی تحقیق وتنقید سے بے فائدہ اٹہایا ہے بلکہ اسماء الرجال کا قاعدہ جو اہل عرب مین روایتون اور حدیثون کی جانچ کے واسطے ایک بڑا بہاری اصول قرار دیا گیا ہے اس مین بہی انہین طبری سے بہت مدد ملی ہے -

ہم اُن تمام مورخین کا جو طبری سے بعد مین گزرے ہین مختصر سا حال لکہتے مگر اس رسالہ کے واسطے ایسا حال دلچسپ معلوم نہین ہوتا لہٰذا ہم اسے ترک کرتے ہین - غرض طبری [illegible] مورخون مین ایک ایسا مورخ گزرا ہے جو مورخین کے گروہ مین وقعت کی نگاہون سے دیکہے جانے کے قابل ہے -

امام اعظمؒ

آپ کا اسم امی نعمان اور ابو حنیفہ کنیت - امام اعظم لقب ہے - آپ ۸۰ھ... کوفہ میں پیدا ہو[ئے] آپکے والد کا نام ثابت اور زوطی ابن ماہ تہا - آپکے دادا عجمی النسل تہے اور ایران کے شاہی خاندان سے

[illegible] خداکا دوسرا نام نعمان تھا جو اسلام لانیکے بعد رکھا گیا - اور سلطنت
فارس کی بد انتظامی کی وجہ سے مقام سلطانہ مین جو اصفہان کے پاس ایک قریہ تھا سکونت پذیر
ہوگئی تھے بعدازان کوفہ مین بعہد حضرت علی چلا آئے تھے اور تجارت کیا کرتے تھے بعض مؤرخین
لکھتے ہین کہ امام اعظم کے باپ دادا حذف بافی کیا کرتے تھے مگر یہ تحریر ٹھیک نہین ہے - اور امام
اعظم ابوحنیفہ نے سوائے قرآن شریف پڑہنے کے اور کسی علم کی تعلیم نہین پائی اپنے آبائی پیشہ
تجارت مین مصروف رہے - مگر آپ اکثر ان صحابہ کے درس مین شریک ہوا کرتے تھے جنہون نے
کوفہ مین درس تدریس کا کام جاری کر رکھا تھا اور چونکہ تجارت کی وجہ سے ابوحنیفہ کو اکثر
دور دراز سفر کرنا پڑتا تھا اور مختلف علما کی زیارت نصیب ہوتی رہتی تھی اس لئے ۱۹ برس کی
عمر مین آپکو صدہا مسائل باوجود کسی علم نہ ہونیکے یاد ہوگئے تھے - حافظہ ایسا تیز تھا کہ وعظ کا
بہت حصہ صرف ایک دفعہ کے سننے سے آپکو یاد ہوجایا کرتا تھا - آپکی تیز ذہنی اور روز طبیعت کی
وجہ سے علم کلام مین آپکو خوب ملکہ ہوگیا تھا اور بصرہ کے مختلف العقائد آدمیون سے مناظرہ کرنیکی
وجہ سے آپکی شہرت بہی ایک حد تک خوب ہوگئی تھی اور چونکہ آپکو والد ثابت کے زمانہ مین آپکے
پاس عموماً اعیان و اشراف کا مجمع رہتا تھا اور سوائے اسکے کوئی ذکر ہی نہ رہتا تھا کہ فلان مسئلہ
مین رسول اللہ نے یہ فرمایا ہے اور فلاں حدیث یون روایت کیگئی ہے اس لئے امام اعظم صاحب مناظرہ مین اپنے
مقابل پر غالب ہوتے رہے - امام صاحب نے اپنی زندگی کا بہت سا حصہ علم کلام مین ہی صرف
کیا اور آخر کار فقہ کی ضرورتون کو محسوس کرکے آپ حماد کے پاس جو اس زمانہ مین مقام کوفہ علم تفقہ
درس دیا کرتا تھا فقہ کی تعلیم پانے لگے حماد سے بہتر اس زمانہ مین دوسرا فقیہ نہ تھا - طلحہ بن زیاد
عبید بن مالک مسعر - ابوالمکارم - شعبہ جو اسلامی دنیا مین بڑے مشہور ہین حماد ہی کے درس
تعلیم پاکر نکلے تھے - دس برس کامل امام صاحب نے حماد کے درسگاہ مین تعلیم پائی اور آخر کار جب
حماد مقام بصرہ اپنے کسی رشتہ دار کے مرجانے کی وجہ کوفہ سے چلے گئے تو آپ ہی حماد کے خلیفہ مقرر ہوئے
اور پڑہانا شروع کردیا خود اجتہاد کرتے تھے - پڑہانے کا طریقہ پہلے یہ تھا کہ استاد بطور لکچر کے طلبہ سے

بیان کر دیا تھا۔ علم فقہ کے علاوہ امام اعظمؒ کو علم حدیث مین بھی پوری دستگاہ تھی یہ بات تو ظاہر
ہے کہی جا سکتی ہو کہ آپ نے کس سے تعلیم پائی۔ مگر جہانتک اس معاملہ مین چھان بین کی گئی صرف اسی قدر
پتہ چلا ہو کہ اپنی مختلف درسگاہون مین اس علم کو حاصل کیا اور مختلف علما رکی صحبت سے مستفید ہوئے
اس زمانہ مین جبکہ امام صاحب کا عالم شباب تھا لوگون کو حدیثین جمع کرنیکی طرف رغبت ہو چلی تھی اور
جرح و قدح کے بعد حدیث کی صحت و غیر صحت پر اعتماد کیا جاتا تھا۔ مکہ معظمہ میں عطا بن ابی رباح
سے آپ نے علم حدیث کی تعلیم حاصل کی تھی۔ آپ مدینہ مین بھی تشریف لیگئے اور وہان کے عما سے بھی حدیثین
پڑھین۔ کہا جاتا ہی کہ امام صاحب کو آٹھ لاکھ حدیثین یاد تھین۔
امام ابو حنیفہ حضرت امام باقر علیہ السلام کے زمانہ مین تھے اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام
کے زمانہ کو بھی دیکھا تھا اور اکثر امام جعفر علیہ السلام کی صحبت مین اپنا بہت سا وقت صرف کیا ہی
امام مالکؒ بھی امام اعظمؒ کے زمانہ موجود تھے باعتبار عمر دونون مین ۱۰ گیارہ برس کا فرق تھا۔
رفتہ رفتہ آپکے علم و فضل نے یہان تک عروج پکڑا کہ سلطنت کے پہلو بہ پہلو اسنے ترقی کی اور آناً
فاناً مین ایک زمانہ کے دلون پر قبضہ کر لیا۔ اسلامی دنیا مین اندلس کے بعض حصہ تو حنفی مذہب کے
اثر سے بچ گئے تھے ورنہ کوئی ملک ایسا نہین تھا کہ جس کا اکثر حصہ حنفی مذہب کا نہ ہو۔ امام اعظم رح
کی شہرت ہو جانے مین اُن کے آبائی پیشہ تجارت نے بھی بہت امداد دی کیونکہ جیسا اوپر لکھا گیا آپ
تجارت کی وجہ سے دور دور کے ملکون مین سفر کرتے رہتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ امام مالک وغیرہ
کا اثر بالکل محدود ہی رہا۔ اور آپنے اپنے اجتہاد کا اثر دنیا مین پھیلا دیا۔ چنانچہ ۱۲۱ھ مین زید
بن علی نے جب ہشام بن عبد الملک کے زمانہ مین بغاوت کی تو آپ کو بھی اس بغاوت مین شریک
بتایا جاتا ہے مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں دیا گیا۔
جب مروان الحمار تخت خلافت پر متمکن ہوا ہے اس زمانہ مین عباسیون کا بہت زور تھا اسی
وجہ سے مادہ فساد کا دبانا مروان کی قدرت سے باہر ہو گیا تھا۔ مروان نے جب یزید بن عمر
بن ہبیرہ کو کوفہ کا گورنر کرکے بھیجا تو اس نے اس فساد کے فرو کرنے کی یہ تدبیر نکالی کہ امام اعظم

کو قضات کے عہدہ پر مقرر کر دیا جائے۔ مگر آپ نے منظور نہین کیا۔ یزید نے آپ کو قید
کر دیا اور دس دس دُرّے روز مارنے کا حکم دیا اس ظلم پر بھی جب آپ نے اس کے حکم کی تعمیل
نہین کی اور لوگون میں اس خبر سے اشتعال پیدا ہونے لگا تو مجبوراً آپ کو رہا کر دیا گیا۔
سلطنت بنو امیہ کے اختتام کے بعد بنو عباس کی سلطنت کا عروج ہوا ادہر بنو امیہ کی سازشون
کی آگ ملک مین برابر لگی رہی یہان تک کہ منصور جو ابو العباس سفاح کے بعد تخت نشین ہوا تہا
اس نے بنو امیہ کے خاندان کو اپنے خیال میں بالکل تباہ کر دیا۔ مگر سادات کے دعوی خلافت نے
اسے بہت پریشان کیا۔ چنانچہ محمد نفس ذکیہ کے قتل کے بعد جو منصور کے مقابلہ مین شہید ہوئے
۱۴۵ھ ہجری مین ابراہیم نے منصور پر حملہ کیا جس مین امام اعظمؒ بہی شریک تہے اور آپ نے
ہر طرح ابراہیم کو مدد دی مگر ابراہیم منصور سے شکست فاش کہا کے میدان جنگ مین کام آئے
اسی طرح منصور نے بنو امیہ اور دیگر دعویداران خلافت کی بغاوتون سے نجات پا کے امام
اعظمؒ کی طرف نظر ڈالی اور اُن کو دربار مین بلا کے درخواست کی کہ قضات کا عہدہ
آپ قبول کریجے۔ آپ کے انکار نے جس کو وہ خود چاہتا تہا اسے اس بات کا موقع لینے
دیا کہ اپنی خواہش کے مطابق آپ کو قید کر دیا اور بالآخر پوشیدہ زہر دلوا دیا۔
آپ کا مقبرہ جس کو ۴۶۰ھ کے آغاز مین سلطان الپ سلجوقی نے تعمیر کرایا تہا مقام خیزران
مین واقع ہے اور مشہد ابو حنیفہ کے نام سے مشہور ہے۔
امام ابو حنیفہؒ کے چہہ اولاد ہوئین جن مین سے صرف ابراہیم بچے جن کو بعد ازان حماد کے نام سے
شہرت دی گئی۔ آپ نے سوائے ایک شادی کے دوسری شادی نہیں کی۔

تمام شد

انفرون کی کشتی اور آنحضرت صلعم کا شب کیوقت حضرت علیؓ کو اپنی جگہ سُلا اور حضرت صدیقؓ کو ہمراہ
لے کر رخصت ہونا۔ غار ثور مین تین شب ٹھیرنا اور عام راستہ کو کترا کر مدینہ منورہ پہونچنا۔ حلیہ مبارک سراپا وغیرہ
غرضکہ آٹھ باب مین جُدا جُدا عنوان سے مضمون ہے درحقیقت جب ملاحظہ سے گذریگی تب معلوم ہوگا کہ یہ گوہر بے بہا
کیا چیز ہے۔ اس کا حصہ اول طبع ہوچکا جس کی محض اس خیال سے کہ عام اہل اسلام امیر و غریب اس سے بہرہ مند
ہون قیمت صرف چار آنہ (۴) ہے باقی مدینہ منورہ کی اسلامی دنیا کو دوسرے اسی پیرایہ مین زیر طبع ہین جن مین
تمام غزوات اور تمام ازواج مطہرات کا مختصر سوانح عمریان اسلام کی ترقی اور فتوحات وغیرہ غرض سنہ ہ
آنحضرت صلعم کی وفات تک کے سنہ بسنہ واقعات مفصل و مبوب مذکور ہون گے۔ اس کا نام "اسلام"
اسی لئے رکھا گیا ہے کہ اس مین بانی اسلام کے حالات درج ہین اس کا حصہ اول مفت حمایل شریف
ایسی کاغذ عاشدہ مجلد قیمتی ہے کے خریدار کو مفت ملے گا۔ صرف اس حصہ اول کے خریدنے والے حضرات
محصول کے ٹکٹ لفافہ مین بند کرکے روانہ فرماوین تاکہ ہر کا ٹکٹ ایک رسالہ پر محصول کا لگا کر روانہ کردیا جائے
اگر اہل اسلام نے قدر فرمائی اور درخواستین پیشگی بھیجدین تو حصہ دوم وسوم بھی جلد طبع ہوگا ورنہ اسی پر اکتفا
ہوگا۔ یہ رسالہ و نیز نایاب حمایل شریف جسکے جدید و مفید مضامین مفصلہ ذیل ہین۔ ترجمہ اردو سلیس تفسیر
ذیر ہر آیت کا شان نزول۔ چیدہ مطالب و منتخب توضیحات۔ خاص خاص سورتون کی تلاوت کے
اجر و ثواب۔ صحت جسمانی و روحانی کے تعلق مجرب معتبر اعمال۔ تنزیل کے اعتبار سے سورتون کی حاشیہ پر
ترتیب۔ سورتون کے کئی کئی نام۔ شروع صفحہ پر کلام مجید کے پچپن نام۔ خاص سورتون کے خاص قیود ن
پر اوعیہ مسنونہ۔ شروع مین فضایل تلاوت۔ تلاوت مسنونہ کا مفصل طریقہ۔ ان تمام انبیاء علیہم السلام
کی مختصر سوانح عمریان و نسب نامے جنکے اسماء صراحتہً کلام مجید مین مذکور ہین و نیز فرشتے ستارے وغیرہ
جنکے ذکر قرآن مجید مین ہین۔ آخر مین سلسلہ طریقت خاندان چشتیہ صابریہ کا حضرت مرشدنا مولوی رشید احمد
صاحب گنگوہی مدظلہ تک مکمل شجرہ۔ ہر پارہ علیحدہ علیحدہ قلم واضح نہایت خوشخط مشہور معتبر تفاسیر سے ماخوذ ہین
مہتمم دفتر خیر المطابع میرٹھ سے ملسکتی ہے دوسری جگہ نہین ملیگی حمایل شریف کا ہدیہ ولایتی کاغذ

باحاشیہ [illegible] جلد [illegible] حمایل شریف [illegible] رسالہ اسلام سنت - المشتہر محمد عاشق الٰہی مولوی فاضل [illegible]

عمر خیام

یعنی

اس نامور حکیم اور نجومی شاعر کی سوانح عمری

اوسکی

۵۰۰ رباعیات حروف تہجی کے التزام کے ساتھ

مرتبہ

منشی جے نرائن صاحب ورما مالک رسالہ ناول لکھنؤ

ناظرین کی دلچسپی کے لئے

بہ تحفظ حقوق

مطبع منشی جی نرائن ورما واقع لکھنؤ مین چھپا

۱۹۰۵

دفتر رسالہ ناول امین آباد لکھنؤ مین فروخت کے لیے موجود ہین

تسخیر - شہر اور دیہات کی طرز معاشرت مین فرق - غریب دیہاتیون کی وہ سادگی آمیز غلطیان جو انسے طرز معاشرت کے برتنے مین ہو جایا کرتی ہین - ہر ایک تمسخر آمیز اور ظرافت انگیز سین سے کشت زعفران ہو گویا ایک آستہ کے ڈراماٹسٹ اسٹونس نوکا نثر کا ترجمہ حجم ۹۰ صفحہ قیمت ۸ر

دھوکا یا طلسمی فانوس مسٹر رینالڈ کے ایک اچھوتے دلکش نصیحت خیز عبرت آمیز ناول کا ترجمہ جسمین عجیب دلاویز پیرایہ مین دکھایا گیا ہے کہ دنیا کے معاملات کا ظاہر کچھ ہوتا ہے اور باطن کچھ اور بادی النظر مین جو کچھ نظر آئے اسپر اعتبار کر کے رائے قائم نکرنا چاہیے مترجمہ اڈیٹر اودھ پنچ حجم ۲۰۰ صفحہ عما

روز المیرٹ - انگلستان کے جادو نگار مسٹر جی ڈبلو رینالڈس کے مشہور و معروف ناول کا ترجمہ جسمین ایک غیور نیک طینت حسن فروش پادری کی بیٹی کی سوانح عمری کچھ اس نصیحت آمیز موثر اور دلچسپ پیرایے مین درج ہے کہ جبتک سارا ناول ختم نہو جائے طبیعت کو قرار نہ آئے - انگلستان کے امرا کا کچا چٹھا جوانی کا جوش حسن کی مقناطیسی کشش پھر اگر نتیجہ پر غور کیجیے تو سرا پا نصیحت ہے ضرور ملاحظہ فرمائیے کامل دو حصون مین مجلد حجم ۲۵۶ صفحہ قیمت عہ

نیرنگ مسٹر رینالڈ کے ناول فلورا کا ترجمہ خود غرضی اور وفاداری کی عکسی تصویر عاشق مزاجون کے لیے تیر کار و دقیقہ سنجون کے لیے اعلی درجہ کا نتیجہ خیز - نارضامندی کی شادی کے نتائج حجم ۹۲ صفحہ قیمت ۱۰ر

کارزار صلیبیہ یعنی داستان سلطنت بیت المقدس جسمین ملکی - مالی - تمدنی - اور اخلاقی حالات شاہان فرنگ اسلام - زنگی و سلجوقیہ تاتاریون - مملوکیون امرا اور انکے عیش و نشاط - عدالتون حاکمون - قوانین و رسم و رواج - رعایا غازیون آلات حرب علوم و فنون علما کی کیفیتین علاوہ انکے جنگہای صلیبی کے اغراض نہایت دلچسپی کے ساتھ درج ہین باتصویر اے آر چرچ چارلس لنتھرج گنگسفورڈ صاحب کی تاریخ کروسیڈس کا اردو ترجمہ تقریبا بیس جزو قیمت .... عہ

کلثوم - ایک حسین لڑکی کو اسکے اصلی ورثہ سے محروم بنکر کی چالین لکھنؤ کی ایک لنگاڑی کی کارستانیان ۸ر

زعفران زار - یعنی ان لاجواب مضامین کا انتخاب جو لکھنؤ کے آزاد و ظریف اخبار اودھ پنچ کے ساتھ سنہ ۱۹۰۱ع مین شایع ہوے تھے اور جو ظرافت کی جان اور لٹریچر کی روح روان ہین - مردہ دلو نکے ساتھ مسیحائی کرنا روتون کو ہنسانا درہنسون کو لوٹن کبوتر بنانا اس رسالہ کا ادنی کرشمہ ہے - قیمت ۸ر

اور عام طور سے لوگون کا یہ اعتقاد تھا کہ جس لڑکے نے اُنکے پاس بیٹھکر قرآن
مجید اور حدیث شریف کا درس لیا وہ بلاشبہہ ناموری اور عزت کے درجہ تک
پہونچا۔ اسی وجہ سے میرے باپ نے حکیم عبدالصمد کے ہمراہ مجھے طوس سے
نیشاپور بھیجا تاکہ مین اِس بزرگ اُستاد کی رہنمائی سے تحصیل علوم مین اپنے کو
مصروف کرون۔ میری طرف ہمیشہ اُنکی عنایت و مہربانی کی نظر رہتی تھی اور
بلحاظ شاگرد ہونے کے مجھے بھی اُنسے از حد اُلفت اور خوش اعتقادی تھی۔
اِسطرح اُنکی خدمت مین مین نے چار سال گذارے۔ جب مین پہلے پہل وہان
آیا تو مین نے دو اور نووارد طالبعلمون کو پایا جو میرے ہی ہمعمر تھے۔ یہ حکیم
عمر خیام اور بدقسمت حسن بن صباح تھے۔ دونون کو خدا نے عجیب ذہن رسا اور
ذاتی قابلیتین بخشی تھین۔ ہم تینون ایک دوسرے کے نہایت ہی بے تکلف
دوست ہو گئے۔ جب امام صاحب اپنی وعظ کے بعد تشریف لیجاتے تو وہ دونون
میرے پاس آتے اور ہم اپنا پڑھا ہوا سبق ایک دوسرے کو سُناتے۔ عمر
نیشاپور کا باشندہ تھا اور حسن کے باپ کا نام علی تھا جو اپنی زندگی کو سخت پابندیون
کے ساتھ بسر کرتا تھا لیکن جسکے عقاید اور اصول بالکل ملحدانہ تھے۔ ایک دن
حسن نے مجھسے اور خیام سے کہا کہ "یہ بات عام طور سے مانی جاتی ہے کہ
امام موفق کے شاگرد ضرور خوش نصیب ہوکر رہین گے اب اگر ہم سب کو بھی وہ
بات حاصل نہ ہوگی تو یقیناً ہم مین سے ایک کو تو ضرور ہوگی۔ اس حالت مین
ہم مین کونسا اقرار اور معاہدہ ہونا چاہیے؟" ہمنے جواب دیا کہ جو تم پسند کرو
اُسنے کہا کہ "اچھا اب ہمکو قسم کھانا چاہیے کہ جس کسی کے حصے مین یہ دولت و عزت
پڑے وہ دوسرون کو اُسمین سے برابر برابر حصہ دے اور اپنی ذات کے
لیے کسی طرح برتری مخصوص نہ کرے۔" ہم دونون نے جواب دیا کہ ہمین منظور ہے
اور ان شرائط پر ہمنے ایک دوسرے کے ساتھ عہد واثق کر لیا۔ زمانہ گذرتا
گیا۔ مین خراسان سے ماورا النہر گیا اور غزنی و کابل پھرتا پھراتا لوٹا اور ایک

عہدے پر مقرر ہو گیا اور سلطان الپ ارسلان کے زمانہ حکومت مین مملکت کا
تمام کاروبار میرے سپرد کیا گیا۔
" وہ بیان کرتا جاتا ہے کہ بہت سے سال گذر گئے اور اُسکے دونون
مدرسے کے پُرانے دوستون نے اُسے ڈھونڈھ نکالا۔ وہ آکر اُسکی دولت
وحشمت مین اپنے حصون کے طلبگار ہوے جسکے زمانہ تعلیم مین انھون نے
قسم کھائی تھی۔ وزیر نہایت فیاض تھا اور اپنے وعدہ پر قایم رہا۔ حسن سلطنت
مین ایک عہدہ کا خواستگار ہوا جسے سلطان نے وزیر کی سفارش پر اُسے عطا فرمایا
لیکن درجہ بدرجہ ترقی کرنے سے قانع نہ ہوکر وہ طرح طرح کی سازشون کی فکر
مین جو ایشیا ئی دربار کا خاصہ ہوتی ہین لگا رہنے لگا اور اپنے محسن کے
برباد کرنے کی ایک کمینی کوشش مین ناکامیاب ہونے کے بعد وہ نہایت ذلت
سے علحدہ کر دیا گیا۔ بہت سی گردشون اور آوارگیون کے بعد حسن ایران کے
اسمٰعیلیہ فرقہ کا سرگروہ بنگیا۔ یہ جاہل متعصب لوگون کی ایک جماعت تھی جو عرصۂ
دراز تک گمنامی کی حالت مین پڑی رہی تھی لیکن اس شخص کی مضبوط اور بد اندیش
طبیعت نے رہنمائی کرکے اُسکو ایک زبون و فودار ترقی کی چوٹی پر پہونچا دیا۔
سنہ ۱۰۹۰ء مین اُسنے الموت کا قلعہ جو صوبہ رودبار مین ہے چھین لیا۔ یہ صوبہ بحیرۂ کاسپین
کے جنوب کے پہاڑی ملکون مین واقع ہے۔ اور اسی پہاڑی گھر مین رہکر اُسنے
صلیبیون مین "شیخ الجبل" کے نام سے ایک بڑی شہرت حاصل کی اور تمام دنیاے
اسلام مین ایک ہیبت سی چھادی۔ یہ امر ابھی تک زیر بحث ہے کہ لفظ اسیسن جسکے
معنی قاتل کے ہین اور جو کہ زمانۂ حال کی یوروپین زبانون مین اُنکی سیاہ اعمالیون
کے یادگار کے طور پر موجود ہے لفظ حشیش (بھنگ) سے جسے کھا کر وہ بالکل
دیوانے ہو جاتے تھے نکلا ہے یا اُس سلسلہ کے بانی کے نام سے ماخوذ ہے
جسکو کہ ہمنے نیشاپور مین دیکھا تھا جبکہ وہ ایک محض طالب العلم تھا۔
" اُس قاتل کے خنجر کے شکارون مین سے اُسکا پرانا ہم مکتب دوست

نظام الملک بھی تھا۔

"عمر خیام بھی وزیر نظام الملک کے پاس اپنے حصے پر حق جتلانے کو آیا لیکن اُسکا ارادہ کوئی خطاب یا عہدہ حاصل کرنیکا نہ تھا۔ اُسنے کہا کہ سب سے بڑی نعمت جو تم مجھے دے سکتے ہو یہ ہے کہ اپنے اقبال کے سایہ مین مجھے کوئی جگہ ایسی عطا کرو جہان رہکر مین اپنے علم کے فواید کو پھیلاؤن اور اوسے وسیع کرون اور تمھاری ترقی عمر و دولت کی دعا مانگتا رہون - وزیر کہتا ہے کہ جب اُسنے دیکھا کہ خیام اپنے انکار پر راسخ ہے تو اُسنے بھی اُسے زیادہ مجبور نہین کیا لیکن بارہ سو مثقال زر نیشا پور کے خزانے سے اُسکی پنشن مقرر کر دی۔ وہ کہتا ہے کہ نیشاپور مین عمر خیام اسی طرح رہا اور مر گیا۔ اور ہمیشہ ہر قسم کا علم حاصل کرنے مین مشغول رہا۔ خاصکر علم نجوم جسمین اُسنے بہت بڑی شہرت حاصل کی۔

"ملک شاہ کی سلطنت کے زمانہ مین وہ مرو مین آیا اور اپنے علمی کمالات کی وجہ بہت بڑا نام حاصل کیا۔ اور سلطان نے بھی خاص عنایتین اُسپر مبذول فرمائین۔

"ملک شاہ نے جب ارادہ کیا کہ جنتری مین کچھ اصلاح کرے تو عمر خیام بھی اُن آٹھ بڑے بڑے عالمون مین سے تھا جو اِس کام کے لیے مقرر ہوے اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ جلالی (جو بادشاہ کے ایک نام جلال الدین سے موسوم ہے) پیدا ہوا۔ گبن لکھتا ہے کہ یہ زمانہ کے شمار کا طریقہ جولین کے طریقے سے بھی بڑھ گیا اور گریگوری کے طریقے کے برابر صحت اور درستگی مین جا پہنچا اُسنے چند نجوم کے خانے جو زیج ملک شاہی کے نام سے مشہور ہین ترتیب دی اور فرانسیسیون نے ابتک عربی مین اُسکے ایک الجبرے کی کتاب اور اُسکا ترجمہ چھاپا ہے۔

اوسکے تخلص۔ (خیام) کے معنی ایک خیمہ بنانے والے کے ہین اور یہ کہا جاتا ہے کہ ایک زمانہ مین وہ یہی پیشہ کرتا تھا۔ شاید نظام الملک کی

اس قصہ کو ہندوستان مین پڑھ رہا تھا توکسی نے اُسے سسرو کا واقعہ یاد دلایا
کہ اسی طرح اُسے بھی آرشمیدس کی قبر سراقیوس مین گھاس اور پتون سے ڈھکی ہوئی
ملی تھی۔

اگرچہ سلطان کی طرح طرح کی خسروانہ عنایتین اور مہربانیان عمر کے حال پر
رہتی تھین۔ مگر اسکی تقریر اور خیالات کی ابیقورس کی پیروٗن کی سی شوخی او بیباکی
نے اسے اپنی ہی زمانہ اور اپنے ہی ملک مین ہمیشہ ایک بُرو اور خود سر کے
صورت مین لوگون کے سامنے ظاہر کیا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ صوفیہ فرشتہ والے
جنکی یہ ہمیشہ ہنسی اور مذمت کیا کرتا تھا اُسے بالخصوص خوف اور نفرت کی نگاہ
سے دیکھتے تھے۔ ان لوگون کا مذہب اگر تصوف اور اسلام کے ظاہری اقرار
کے پردے سے جسمین عمر خیام کسی طرح اپنے کو نہین چھپا سکتا تھا باہر نکالکر
صاف روشنی مین دیکھا جاسے تو اسکے اصول اور طریقے سے کہین کم ظاہر
ہوگا۔ اسکے شاعرون نے جنمین (علاوہ فردوسی کے) حافظ بھی شامل ہین اور
جو ایران مین کثرت سے ہین ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عمر خیام کے خیالات
اور مضامین سے بہت کچھ اخذ کیا ہے لیکن تصوف کے رنگ مین لیجاکر اور
اُن لوگون کے مذاق کے موافق بناکر جو اُسکے صوفیانہ معنی لیتے ہین اپنے
طرز مین بیشک خوب پھلے پھولے ہین۔ وہ لوگ جنسے انکا خطاب ہے اُسیقدر
جلدی توہم اور اشتباہ کو قبول کرلینے والے ہین جسقدر جلدی ایمان کے
طریقے یا کسی اور عقیدے کو اور اُسیقدر جلدی جسمانی لذائذ کو محسوس کرتے
ہین جسقدر دماغی کو۔ ان دونون قسم کی لذتون یعنی جسمانی اور دماغی کو وہ ایکجا
کرکے اِسقدر محظوظ ہوتے ہین کہ کبھی تو نہایت آزادی اور جوش مسرت سے
اپنے شاعرانہ تلازمون کے بازوٗون پر سوار ہوکر آسمان کی سیر کرتے ہین
اور کبھی زمین پر آتے ہین اور کبھی اس جہان مین گذر کرتے ہین اور کبھی دوسرے
ہی جہان مین غائب ہوجاتے ہین اِسطرح سے کہ دونون جہانون مین اُنکا وجود

بہت سی غلطیوں اور تکرار کے بعد ۵۱۶ تک پہونچی ہے واتی ہومر اسپنے ایک نسخے
کے متعلق کہتا ہے کہ اُسمیں قریب ۵۰۰ کے رباعیاں ہیں اور ڈاکٹر اسپرنگر کی تحریر
کے موافق لکھنؤ کے ایک نسخے مین اسکی دوچند ہین لیکن ابھی ایک نسخہ کلکتہ ۱۸۳۶ع
کا چھپا ہوا ملا ہے جسمین ۴۳۸ رباعیان ہین اور اسکے ضمیمہ مین ۵۴ اور مندرج ہین
جو مختلف نسخون سے نقل کر کے جمع کی گئی ہین۔ کلکتہ اور اکسفورڈ کے نسخون کے
کاتبون نے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک عمد کر کے لکھا ہے۔ ہر ایک سند ایک
رباعی سے ہے (بلا خیال اچھی یا بری کے) بلحاظ ابجد کے ترتیب جسکے ابتدا کی ہے۔
اکسفورڈ والا ایک عذریہ رباعی سے شروع کرتا ہے اور کلکتہ والے نے
ایک شکوہ اور سرزنش کی رباعی سے ابتدا کی ہے جسکے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ
(جیسا اُسکے حاشیہ پر درج ہے) کہ عمر خیام کا یہ خیال ایک خواب سے پیدا ہوا تھا
جسمین اسکی مان نے اُسکی آیندہ قسمت کے متعلق پوچھا تھا اُس رباعی کا مطلب
یہ ہے "اے توجلا کر دل اُن لوگون کے لیے دکھتا ہے جو دوزخ مین جل رہے
ہین جنکے شعلے تب تیری باری آئیگی تجھے بھی کھانا پڑیگے۔ کبتک چلائے جائیگی
کہ خدا اُنپر رحم کرے تو بھلا تو کہان اُنھین سکھا سکتی ہے اور وہ کہان سے تیری
بات سیکھ سکتے ہین"

مسٹر طامس باڈلی ولیل آکسفورڈ کے لائبریری مین جو نسخہ موجود ہے
شروع کی رباعی ہمہ اوست کے مسئلہ کی تائید کرتی ہے۔ اسکا مطلب یہ ہے "
اگر مین نے خود کسی سست مذہب یا طریقے پر ریکھ پیکے کے جواہرون کو بہت ڈھیلا
پرویا ہے تو مرت یہ ایک چیز میری نجات کے لیے شفیع ہو سکتی ہے کہ مین نے ایک
کو دو کبھی نہین کہا"

ریویو رنے جس سے مجھے عمر خیام کی زندگی کے حالات ملے ہین
شروع مین سے خیام کا بلحاظ نا جودت طبیعت اور [illegible] اور بلحاظ حوادثات
زمانہ کے جسمین ان دونون کی عمر گذری مقابلہ کرتے اپنے بیان کو ختم کیا ہے

وہ دونون بلاشبہ نہایت نازک مضبوطاً ہوبرعات اور اچھی طبیعت کی تھی دونون کے خیالات نہایت ستھرے - اور دونون کے دل مین انصاف اور سچائی کی آرزو دبیری ہوئی تھی -

جو حق بجانب اپنے ملک کے مذہب اور اُسکی پوچ اور باطل پیروی سے متنفر ہوئے ہیں لیکن جن اصولون کا اُنھون نے تہ وبالا کر دیا اُنکی بجاے وہ ایسی خوشی آیندہ اُمیدون کو اپنے دل مین جگہ نہین دیسکتے جسطرح سے اور لوگون نے کرکے اپنے واسطے ایک قانون بنالیا ہے باوجودیکہ اُسکے پاس اُسلئے زیادہ اختیار موزدانی کا کوئی ذریعہ نہین تھا۔ سقراط بیشک ان تمام اسباب کے ساتھ جوابی قورس نے اُسے مہیا کر دیے تھے ایک بہت بڑی کل بنانے کے منصوبے سے جو کہ ایک اُسکی دل مین پیدا ہوا تھا اپنے آپ کو کچھ اطمینان دے لیا تھا - اور ایک ایسے قانون کے مطابق عمل کرتا تھا جس مین کچھ اجتہاد کی ضرورت نہین - اسطرح سے بجاے ابیقوری درشتی وضع کے زینو کی طریقت کی سختی مین اپنے دل کو جمع کر دینا کے کچھ ڈراسے پرستیں کر وہ خود ایک ایکٹر تھا غور کرنے کے لیے بیٹھا - لیکن (جسطرح سے وہ خود روسن تیلیرون کی تعریف مین کہتا ہے) یہ وسنے کی زرد اچکن سے جو دیکھنے والون کے اعداد سوراخ کے درمیان مین حائل ہونکی وجہ سے تھی خود اُسکے اور اُسکے تمام گرد و پیش والون کے رنگ کو بالکل پھیکا کر دیا - خیام نے زیادتی نا امیدی بالکس ایسے پیچ در پیچ طریقے سے بے توجہی اختیار کرنے کی وجہ سے جس کا نتیجہ بجز ایک بیہودگی کی مجبوری کے اور کچھ نہ نکلا اپنے علم اور فہم دونون کو ایک ترش یا خوش مذاقی کے ساتھ عام بربادی کی حالت مین جو کہ اُنکی جبلگیون سے جو کسی طرح کافی نہین ہوتین ،ونتا فوقتاً ظاہر ہوجاتی ہے پھینک دیا اور انہ انفسانی کو زندگی کا بہت بڑا مقصد قرار دیکر الوہیت کے خیالی مسائل - قضا و قدر - مادہ - روح - نیک و بد - اور ایسیطرح

اور مسئلون سے اپنا دل بہلایا گیا۔ یہ مسائل ایسے ہین جنکی ابتدا کرنا بمقابلہ انمین
کمال حاصل کرنے کے زیادہ آسان ہے۔

اصل رباعیون کا جسطرح پر وہ ہین ایک کا دوسرے سے کوئی
تعلق نہین ہے ہر ایک مین چار چار مصرعے ہین اور گو کہ اُنکی میزان مختلف ہو
لیکن برابری مین سب یکسان ہین۔ بعض وقت تو سب مصرعے مقفا ہین مگر اکثر کا
تیسرا مصرعہ غیر مقفا ہے اور کسیقدر یونانیون کی اُس خاص قسم کی شاعری سے
ملتا جلتا ہے جسمین ہر تیسرا مصرعہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شعر کے تموج کو چوتھے
مصرعے تک بڑھنے نہین دیتا اور جو لہر اُسپر گرتی ہے اُسے برابر اٹھاے رہتا
ہے۔ اِس ایشیائی طرز و طریقے سے مصرعون کی صورت مین تمام رباعیان
بترتیب ابجد ایک دوسرے کے بعد۔ کہین پر سنجیدہ اور کہین ظرافت آمیز آتی
چلی آئی ہین۔ انگریزی مین جو اسکا ترجمہ ہوا ہے اُسکی ترتیب انگریزی دیہقانی
نظمون کے طریقے پر ہے جسمین کہ شراب پینا۔ خوشی منانا اِسطرح کے مضامین کا
ذرا کم خیال کیا گیا ہے جو کہ (صحیح ہو یا غیر صحیح) اصل کتاب مین بہت زیادہ تواتر
کے ساتھ آئے ہین۔ لیکن نتیجہ دونون حالتون مین قابل افسوس ہے سب سے
زیادہ قابل افسوس شاید وہان پر ہے جہان کہ عمر خیام نہایت خوبصورتی کے
ساتھ اظہار کرتا ہے۔ ان سب سے بمقابلہ غصہ کے رنج و غم کے آثار اُسکی
حالت مین بہت پاے جاتے ہین ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے پیرون کو
تقدیر کی بیڑیون سے بیفائدہ آزاد کرنا چاہتا ہے اِس خیال سے کہ روز فردا
کی جھلک پر شاید کوئی صبح نظر پڑ جاے لیکن اُسے امروز ہی سے نجات نہین
ملی (جنے کہ بہت سے روز فردا کو اپنی چال مین تھکا دیا ہے) اور وہ اِس ہی
مین یہ سمجھکر کہ یہی صرف ایسی زمین ہے جسپر کھڑا ہو کر وہ ذرا قدم ٹیک سکتا ہے
پڑا رہ گیا ہے گو کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے اِسپر سے
اسکے پیر پھسل پھسل جاتے ہین۔

جس زمانہ مین کہ عمر خیام کی رباعیات کے اِس ترجمہ کی طبع ثانی تیار ہو رہی تھی مانشر نکولس
فرانسیسی کانسل مقیم رشت نے ایک طہران کے چھپے ہوے نسخے کو جسمین چارسو
چونسٹھ رباعیان تھین مع اپنے ترجمے اور حواشی کے نہایت عمدگی کے ساتھ چھپوایا
تھا۔ مانشر نکولس جن کے مطبوعہ نسخے نے مجھے بہت سی باتون کا خیال دلایا اور نہ
دوسرے ہی طرز کے امور کو ظاہر کیا عمر کو ابیقورس کے ڈھنگ پر جیسا کہ میرا
خیال اُسکے لغوی معنون کو دیکھکر ہے نہین مانتا بلکہ وہ اوسے تصوف کے رنگ
پہ لیگیا ہے وہ کہتا ہے کہ شراب و ساقی وغیرہ کی صورت مین جیسا کہ لوگ حافظ
کی نسبت خیال کرتے ہین خیام کو خدا کا جلوہ نظر آتا تھا۔ مختصر یہ کہ اُسے بھی وہ مثل
اور دوسرے شاعرون کے ایک صوفی مزاج شاعر سمجھتا ہے لیکن مجھے اپنی
راے تبدیل کرنے کی کوئی وجہ نہین معلوم ہوتی مین نے اِس راے کو بارہ
برس سے زیادہ ہوے جب قایم کیا تھا اُسوقت سب سے پہلے عمر کو ایک
ایسے شخص نے مجھے دکھلایا تھا جس کا مین جو کچھ مین نے علوم شرقی سے پڑھا ہے
ہمیشہ اسلیے مرہون احسان رہونگا۔ اور اِس سے زیادہ اور علوم کا بھی
اُسکا شکر گذار رہونگا۔ (کیونکہ جو کچھ اور مجھے علوم مشرقی سے آتا ہے وہ سب
اُس ہی کے بدولت ہے)۔ وہ عمر کے فہم و ذکا کا اِسقدر مداح تھا کہ اگر اُسکے
امکان مین ہوتا تو اُسکے ایسے مطالب جیسے مانشر نکولس پیدا کرتے ہین بخوشی
منظور کر لیتا مگر حقیقت مین وہ ایسا کبھی نہین کر سکتا تھا اور یہ بات اُسکے مضامین
سے جو کلکتہ ریویو مین چھپتے رہتے ہین اور جنکا ایک بڑا حصہ ابھی ہمنے اوپر نقل
کیا ہے بخوبی ظاہر ہوسکتی ہے۔ اِس مین وہ فی نفسہ نظم سے اور شاعر کے اُن
واقعات سے جو ہم پہونچے ہین بحث کرتا ہے۔

اگر مانشر نکولس کے اصول کے خلاف اور زیادہ ثبوت کی ضرورت
ہو تو وہ اُس ہی کی طرز بیان سے جس مین وہ عمر خیام کی سرگذشت تحریر کرتا ہے
معلوم ہو جائیگا جسمین اشعار کے مطالب سے جو حاشیہ پر درج ہین بالکل خلاف

باتین لکھی ہین (اُسکے دیباچے کے سولھوین اور سترھوین مضمون کو دیکھو) حقیقت
مین جبتک کہ عمر کے عذرخواہ مجھے آگاہ کرین مین بالکل نہین جانتا تھا۔ اُسکے نظم کو
ایسے ایسے معنے پہنائے گئے ہین۔ کہ جس شراب کو حافظ نے پیا تھا اور اُسکی
تعریف کی تھی وہ جو کچھ ہو مگر عمر نے جو شراب پی وہ انگور کے خالص عرق کی تھی۔
اسے وہ نہ صرف جبکہ اپنے دوستون کے ساتھ عیش وطرب مین مشغول ہوتا
استعمال کرتا تھا بلکہ (جیسا مانٹر نکولس کہتے ہین) اِس غرض سے پیتا تھا کہ
اپنے کو حالت کے اُس جوش تک پہونچا دے جسے اور لوگ شور وشغب
کرنے اور ہاتھ پیر مارنے سے بھی حاصل نہین کر سکتے۔ مگر اسپر بھی کتاب مین
جہان کہین مے وساقی کا ذکر آیا ہے (اور یہ بکثرت ہے) مانٹر نکولس نہایت ہوشیاری
کے ساتھ اُسکی شرح لکھتے ہین" خدا" "قادر مطلق" وغیرہ وغیرہ۔ اور حقیقت
مین ایسی احتیاط کے ساتھ لکھتے ہین کہ خواہ مخواہ آدمی کو خیال ہوتا ہے کہ یہی
اُس صوفی کے جس سے اُنھون نے اِن اشعار کو پڑھا ہے ہم مشرب اور
ہم خیال ہوگئے ہین۔ ایک ایرانی طبعًا یہ چاہیگا کہ اپنے ملک کے ایک مشہور
ومعروف شخص کو اِن الزامات سے بری رکھے اور اُسکی جانب سے عذر
خواہی کرے۔ اور ایک صوفی کی یہ غرض ہوگی کہ اُسے اپنے طریق مین داخل
کرے جیسے کہ ایران کے بڑے بڑے شعرا شامل ہین۔
مانٹر نکولس کے پاس اِس بات کی کونسی تاریخی سند ہے کہ خیام نے
صوفیانہ خیالات پر اپنے آپ کو مختل کیا تھا؟ ہمہ اوست کے مسائل بلکہ وجدانیت
اور احتیاج کے اصول کو صوفیون یا اُنسے پہلے فلوطینس یا اُس سے بھی
پہلے ابیقورس کے ساتھ مخصوص نہین سمجھنا۔ شاید کہ یہ ابتدائی فلسفیون اور فکر
اور غور کرنے والے آدمیون کے ملحدانہ اصول کے شروع ہی سے ماخذ رہے
ہون اور بہت زیادہ ممکن ہے کہ یہ ایک ایسے فلسفی کے خود بخود پیدا ہونے
والے خیالات کے مرکز ہون جو معاشرت اور تمدن کی جہالت کے ایسے زمانہ

مین پیدا ہوا تھا جس مین یہ خیال کیا جاتا تھا کہ تمام دنیا کل بہتر مذہبون پر منقسم ہو-
واٹن ہومر عمر خیام کو ایک آزادخیال اور مذہب صوفی کا بہت بڑا مخالف
بتاتا ہے شاید اسلیے کہ اُسکے اصولون کو زیادہ اختیار کرتے وقت وہ کسی طرح
بے ناموسی فق اخلاقی تشدید پر قایم رہنے کا دعوی کرنا نہین چاہتا تھا - سر ڈبلیو
اُوسلی نے بھی آکسفورڈ کے باڈلین کتب خانہ کے نسخے مین ایک سادے ورق
پر تھوڑا سا اسی کے ہم معنی لکھا ہے اور مانشر نکولس کے مولفہ نسخے کی دو
رباعیون مین تصوف اور صوفی کا نہایت اہانت کن نامون سے تذکرہ کیا
گیا ہے -
اسمین شک نہین کہ انمین سے بہت سی رباعیون کا اگر اُنکے معنے
صوفیانہ طریق پر نہ لیے جائین تو کوئی مطلب نہین پیدا ہوسکتا مگر بہت زیادہ
اسطرح کے ہین کہ اگر انکے لفظی معنے نہ لیے جائین تو کسی طرح کچھ سمجھ مین نہین
آسکتا - مثلاً اگر شراب علوی مانی جائے تو کسطرح سے جسم جب مردہ ہوگیا ہو
تو اُس سے دھویا جاسکتا ہے ؟ - کیونکر وہ کے قدحون کو جو مٹی کے بنے ہوے
ہین کوئی مجذوب الوہیت کے شراب سے بھر دیگا - مانشر نکولس خود جہان
کہین مشرقی اسرار آگئے ہین اور کسی خاص مضمون کی طرف اشارہ کیا گیا ہے
اُنکی تشریح کرنے مین گھبرا گھبرا جاتے ہین مگر تاہم اُنکو پڑھنے والا سوا ے
الوہیت کے اور کسی طرف منسوب نہین کرسکتا - اس مین کوئی شک نہین کہ
طہران کے نسخے مین بھی جیسا کہ کلکتہ کے کتب خانہ کے نسخے مین ہے بہت سی
رباعیان جعلی ہین - اور خیام کی طرف غلط منسوب ہین - یہ رباعیین بالکل ایران
کے معمولی قطعات یا معمولی رباعیون کے طرز پر ہین - لیکن اس سے بھی حقیقت
مین جسقدر اس ایک بات کے متعلق معلوم ہوتا ہے اُسیقدر دوسرے کے
یہی نہین بلکہ صوفی جو ایران مین ایک عالم اور منشی سمجھا جاتا ہے اُس نے ممکن
ہے کہ بیفکری اور عیش پسندی کے مقابلے مین جو کچھ اُسکی طبیعت کے ایک

شاعر ہونے کی حیثیت سے زیادہ موافق ہوا ہو اُسے خواہ مخواہ اُس مین ٹھونس
دیا ہو - مین نے معلوم کیا ہے کہ آکسفورڈ کے باڈلین کتبخانہ مین جو نسخہ ہے اُسمین
ایسی رباعیان بہت کم ہین جو بالکل تصوف کے لباس مین ملبوس ہون - یہ نسخہ سب سے
زیادہ پُرانا ہے جسے شیراز کی لکھی ہوئی تاریخ ۸۶۵ھ (۱۴۶۰ء) موجود ہے - ایسی
خاص بات کی وجہ سے عمر کو (مین اُسے ——— نہین نہین مسیحی نہین ——— مشہور
نام لیکر یاد کرنے سے باز نہین رہ سکتا) اور دوسری شرط سے امتیاز حاصل
ہے - اس مین وہ خود بھی اورون کے ساتھ اپنے ہی ترانہ مین بیخود اور محو
ہو کر آدمی کو ایک تمثیل بنا کر کھڑا کرتا ہے اور اُسے ایک خیالی جامہ پہناتا
ہے - ہمین یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آدمی خود خیام ہے جو کہ اپنے تمام خواص
طبیعت اور جذبات کے ساتھ ہمارے سامنے موجود ہے گویا کہ حقیقت
مین ہم اور وہ ایک ہی میز پر جب کہ شراب کا دور چل چکا ہے نہایت آزادی
اور بے تکلفی سے بیٹھے ہوئے ہین -

مین بذات خود حافظ کی اِس صوفی شربی کا کبھی قائل نہین ہون -
جہان تک کہ شاعر نے اپنی نظم کے شروع اور اخیر مین حضرت محمدؐ رسول اللہ صلعم
کی شان مین سلام لکھا ہے اس مین ہمہ اوست کے مسئلہ کا ذکر کرنے اور
اُسے اختیار کرنے مین بھی یہ نہین ظاہر ہوتا کہ کونسی قباحت ہو سکتی ہے -
ایسی حالتون مین مولانا جلال الدین رومیؒ - ملا جامیؒ - حضرت فرید الدین
عطار - اور اور شاعرون نے بھی نظمین لکھی ہین جسمین کہ انھون نے شراب اور
حسن کو الوہیت کے بیان کرنے کے لیے (نہ کہ پردہ بنا کر اُسے چھپانیکے
لیے) ایک خیالی تصویر فرض کر کے ہمارے سامنے پیش کیا ہے - کوئی اور
تمثیل جس مین غلطی معنے یا غلطی استعمال کا کم گمان ہوتا شاید ایسی مستقل طبیعت
والون کے لیے زیادہ مناسب ہوتی اور ایسی حالت مین اور بھی زیادہ
مناسب ہوتی جبکہ بعض لوگون کے موافق حافظ اور خیام کے نزدیک شراب

اور حسن کا تصور لذائذ نفسانی کی خیالی تصویرون سے مشابہت ہی نہین بلکہ
مطابقت رکھتا ہے۔ یہ طریقہ زاہدون اور ریاضت کرنے والون کے لیے
خواہ مفرت ہو مگر اُنکے ایسے ابناے جنس کے لیے جو اُنسے بہت کمزور ہین
زیادہ پرخوف وخطر ہے اور یہ طریقہ ریاضت جسکی اسطرح ابتدا کی گئی ہے جسقدر
بڑھتا جاتا ہے اُسی نسبت کے ساتھ ایک دنیا دار اور ملحدانہ خیال والے
آدمی کے لیے اور زیادہ معرض خطر ہو جاتا ہے۔ اور یہ سب کس واسطے ہے؟
اسواسطے کہ لذائذ نفسانی کی ایسی خیالی تصویرون کیوجہ سے وہ مورد طعن
وتشنیع کیے جائین اور حذا جو کہ اُن کی تعلیم کے موافق مادہ جسمانی اور روح
دونون کہا جا سکتا ہے اگر اُسکی کنہ کے قریب تک بھی کوئی پہونچ سکے
تو فوراً یہ سب خیالی شکلین ترک کر دی جا سکتی ہین۔ اُسی کی دنیا مین آدمی یہ
خیال کرتا ہے کہ وہ بعد مرنے کے جائیگا لیکن بلاکسی امید کے کہ جس عجز اور
انکساری سے وہ اِس جہان مین رہا ہے اُسکے عوض مین اُسے دوسرے
جہان مین کوئی اور پیچھے آنیوالی خوشی بھی میسر ہوگی۔

نفروشس کا نابینا خدا درحقیقت مین اُسیقدر نفس کشی کا مستحق ہے
جسقدر یہ صوفیان کا اور غالباً اِس مین یہ بات بھی حاصل ہو گئی ہوگی۔ عمر خیام
کے اشعار کی ردیف اگر "بیا کہ بخوریم" نہین ہے تو یہ ضرور ہے "خوشیم کہ
فردا زندہ نخواہیم ماند"۔ اور اگر حافظ کی مراد ایسی زبان سے اور ہی کچھ تھی
تو بیشک اُسنے اپنی فراست کا غلط اندازہ کیا دران حالیکہ اُس نے اپنی عمر
اور دانائی کو ایسی مبہم اور پیچیدہ نظم آرائی مین صرف کیا جسکو کہ اُسکے زمانے
سے آجتک برابر پاک اور قدسی عابدون کے علاوہ بھی ہر ایک شخص گا چکا ہے
مگر چونکہ سلسلہ بسلسلہ یہ خیال برابر چلا آیا ہے اور واقعی بعض علما کی بھی
یہی رائے ہے کہ عمر خیام ایک صوفی (بلکہ درویش منش آدمی) تھا جو صاحب
چاہین اُسکے مے اور ساقی کے اِسی طرح کے معنے سمجھ لین۔ لیکن چونکہ

یہ بات تاریخ سے مانی گئی ہے کہ یہ ایک فلسفی اور عالمانہ نظر اور ایسی قابلیت
کا آدمی تھا جو اُسکے زمانے اور اُسکے ملک سے کہین دور تھی - اور دنیا کی تمنا
اُسے اسیقدر اعتدال کے ساتھ تھی جتنی ایک فلسفی کو ہونی چاہیے اور اوسکی
ضروریات بھی اسقدر معتدل تھین کہ مشکل سے ایک رند مشرب آدمی کے لیے
کافی ہوسکتی تھین اسلیے بعض پڑھنے والے میرے ہم خیال ہونگے کہ جبکہ
وہ شراب جسکا عمر تذکرہ کرتا ہے صرف انگور کا عرق تھی - اُسنے جسقدر کہ اُسے
پیا اُس سے زیادہ اُس مئے اقدس کے مقابلے مین تعلی کی لی جسنے کہ اپنے
مطیعون اور رسیکشون کو ایک نمایش اور تنفر کی حالت مین ڈبو دیا - فقط

اے چرخ فلک خرابی از کینهٔ تست — بیدادگری شیوهٔ دیرینهٔ تست
۲۵ اے خاک اگر سینهٔ تو بشگافند — بس گوهر قیمتی که در سینهٔ تست

این یک دو سه روزه نوبت عمر گذشت — چون آب بجویبار و چون باد بدشت
۲۶ هرگز غم دو روز مرا یاد نگشت — روزیکه نیامدست و روزیکه گذشت

آن لعل گران بها ز کانی دگرست — وان درّ یگانه را نشانی دگرست
۲۷ اندیشهٔ این و آن خیال من و تست — افسانهٔ عشق از زبانی دگرست

امروز که نوبت جوانی من ست — می نوشم از آنکه کامرانی من ست
۲۸ عیبش مکنید اگرچه تلخ ست خوش ست — تلخ ست از آنکه زندگانی من ست

اے دل چو نصیب تو همه خون شدنست — احوال تو هر لحظه دگرگون شدنست
۲۹ اے جان تو درین تنم چه کار آمده — چون عاقبت کار تو بیرون شدنست

امروز ترا دسترس فردا نیست — واندیشهٔ فردات بجز سودا نیست
۳۰ ضایع مکن این دم ار دلت شیدا نیست — کین باقی عمر را بقا پیدا نیست

از هرزه بهر درے کمی باید تاخت — با نیک و بد زمانه باید ساخت
۳۱ از طاسک چرخ و کعبتین تقدیر — هر نقش که پیدا شود آن باید باخت

این کوزه چو من عاشق زاری بودست — در بند سر زلف نگاری بودست
۳۲ این دسته که در گردن او می بینی — دستیست که بر گردن یارے بودست

پیش از من و تو لیل و نهاری بودست — گردنده فلک ز بهر کارے بودست
۳۳ زنهار قدم بخاک آهسته نهی — کان مردمک چشم نگاری بودست

بتخانه و کعبه خانهٔ بندگیست — ناقوس زدن ترانهٔ بندگیست
۳۴ زنار و کلیسا و تسبیح و صلیب — حقا که همه نشانهٔ بندگیست

بر لوح نشان بود و نیا بوده است — پیوسته قلم ز نیک و بد آسوده است
۳۵ اندر تقدیر هر چه بایست بداد — غم خوردن و کوشیدن ما بیهوده است

با هر بد و نیک راز نتوانم گفت — کوته سخنم دراز نتوانم گفت
۳۶ حالے دارم که شرح نتوانم داد — رازی دارم که باز نتوانم گفت

۳۷ با ما درم طلب منگیر و جفت — جا زد و [illegible] ما پاک [illegible]

پیرے ز خرابات برون آمد گفت
می خور که بعمرها بباید خفت

۳۸
با حکم خدا بجز رضا در نگرفت
با خلق بجز روے و ریا در نگرفت
هر حیله که در تصور عقل آید
کردیم ولیک با قضا در نگرفت

۳۹
بیگانه اگر وفا کند خویش من است
ور خویش خطا کند بداندیش من است
گر زهر موافقت کند تریاک است
ور نوش مخالفت کند نیش من است

۴۰
پرخون ز فراقت جگرے نیست که نیست
شیدائے تو صاحب نظرے نیست که نیست
با آنکه نداری سر سودائے کسے
سودائے تو در هیچ سرے نیست که نیست

۴۱
تا هشیارم طرب ز من پنهان است
چون مست شدم در خردم نقصان است
حالیست میان مستی و هشیاری
من بندهٔ آنکه زندگانی آنست

۴۲
ترکیب پیاله که درهم پیوست
بشکستن آن کجا روا دارد مست
چندین سر و پائے نازنین و کف دست
از مهر که ساخت و بکین که شکست

۴۳
ترس اجل و وهم فنا مستی نیست
ورنه ز فنا شاخ بقا خواهد رست
تا از دم عیسوی شدم زنده بجان
مرگ ابد آمد و چو من دست بشست

۴۴
چون لاله بنوروز قدح گیر بدست
با لاله رخے اگر ترا فرصت هست
مے نوش بخرمی که این چرخ کبود
ناگاه ترا چو باد گرداند پست

۴۵
چون کار نه بر مراد ما خواهد رفت
اندیشهٔ جهد ما کجا خواهد رفت
پیوسته نشسته ایم از حسرت آنک
دیر آمده ایم و زود میباید رفت

۴۶
خیام ز بهر گنه این ماتم چیست
وز خوردن غم فائده بیش و کم چیست
آنرا که گنه نکرد غفران نبود
غفران ز برائے گنه آمد غم چیست

۴۷
در پردهٔ اسرار کسے را ره نیست
زین تعبیه جان هیچ کس آگه نیست
جز در دل خاک تیره منزلگه نیست
افسوس که این فسانها کوته نیست

۴۸
در عالم بیوفا که منزلگه ماست
بسیار بجستم بقیاسی که مراست
چون روئے تو ماه نیست روشن گفتم
چون قد تو سرو نیست میگویم راست

۴۹
در صومعه و مدرسه و دیر و کنشت
ترسنده ز دوزخ اند و جویائے بهشت
آنکس که ز اسرار خدا با خبر است
زین تخم در اندرون خود هیچ نکشت

دنیا دیدی و هرچه دیدی هیچ است — وان نیز که گفتی و شنیدی هیچ است
۵۰ سرتاسر آفاق دویدی هیچ است — وان نیز که در خانه خزیدی هیچ است

در خواب بدم مرا خردمندی گفت — کز خواب کسی را گل شادی [illegible] نشکفت
۵۱ کاری چه کنی که با اجل باشد جفت — می خور که بزیر خاک می باید خفت

دل سر حیات اگر کماهی دانست — در موت هم اسرار الهی دانست
۵۲ اکنون که تو با خودی ندانستی هیچ — فردا که ز خود روی چه خواهی دانست

چون زیره شود اذا السماء انفطرت — واندم که شود اذا النجوم انکدرت
۵۳ من دامن تو بگیرم اندر عرصات — گویم صنما بای ذنب قتلت

سر از همه ناکسان نهان باید داشت — راز از همه ابلهان نهان باید داشت
۵۴ بنگر که بجای مردمان خود چه کنی — چشم از همه مردمان نهان باید داشت

ساقی چو زمانه در شکست من و تست — دنیا نه سراچه نشست من و تست
۵۵ گر زانکه میان من و تو جام می است — امید ان یقین که حق بدست من و تست

عمری گل و باده بر نشیم نگذشت — یک کار من از دو جهان راست نگشت
۵۶ وز سعی چو نشد هیچ مرادی حاصل — از هرچه گذشتیم گذشتیم گذشت

می در کف من نه که دلم در تابست — وین عمر گریز پای چون سیمابست
۵۷ برخیز که بیداری دولت خوابست — دریاب که آتش جوانی آبست

ما کافر عشقیم و مسلمان دگرست — ما مور ضعیفیم و سلیمان دگرست
۵۸ از ما رخ زرد و جامه کهنه طلب — بازارچه قصب فروشان دگرست

می خوردن و شاد بودن آیین منست — فارغ بودن ز کفر و دین دین منست
۵۹ گفتم بعروس دهر کابین تو چیست — گفتا دل خرم تو کابین من است

ای لایق سجده نه در خور کنشت — ایزد داند گل مرا از چه سرشت
۶۰ چون کافر درویشم و چون قحبه زشت — نی دین و نه دنیا و نه امید بهشت

[illegible] بسنگ خانه هی ماندر است — جز بانگ میان تهی از او هیچ نخاست
۶۱ [illegible] صفت و خواب خرگوش دهد — آشوب پلنگ دارد و گرگ دغاست

هر سبزه که در کنار جوی رستست — گویی ز لب فرشته خوی رستست

هان بر سر سبزه پا بخواری نه نهی — کان سبزه بخاک لاله روی رستست

هر دل که درو نور محبت بسرشت — گر ساکن مسجد است و گر ز اہل کنشت

٩٣

در دفتر عشق هر که را نام نوشت — آزاد ز دوزخ است و فارغ ز بهشت

یکجرعهٔ مے ز ملک کاؤس به است — وز تخت قباد و ملکت طوس به است

٩٤

هر ناله که عاشقے بر آرد به سحر — از نعرهٔ زاہدان سالوس به است

هر چند که از گناه بدبختم و زشت — نومید نیم چو بت پرستان کنشت

٩٥

اما سحرے که میرم از مخموری — مے خواہم و معشوق چه دوزخ چه بهشت

مے خوردن من نه از برائے طربست — نز بہر فساد و ترک دین و ادبست

٩٦

خواہم که ز بیخودی بر آرم نفسے — مے خوردن و مست بودنم زین سببست

گویند که دوزخی بود مردم مست — قولیست خلاف دل درو نتوان بست

٩٧

گر عاشق و مست دوزخی خواہد بود — فردا باشد بهشت ہمچون کف دست

گویند مخور باده که شعبان نه رواست — نے نیز رجب که آن مه خاص خداست

٩٨

شعبان و رجب ماه خدا ہست و رسول — ما در رمضان خوریم کان خاصهٔ ماست

آمد رمضان و سوسم باده برفت — دور مے ناب و راح ساده برفت

٩٩

هر باده که داشتیم ناخورده بماند — هر قحبه که یافتیم ناگاده برفت

این کهنه رباط را که عالم نامست — آرامگه ابلق صبح و شام است

١٠٠

بزمیست که واماندهٔ صد جمشید است — گوریست که تکیه‌گاه صد بهرام است

اکنون که گل سعادتت پربار است — دست تو ز جام مے چرا بیکار است

١٠١

مے خور که زمانه دشمن غدار است — دریافتن روز چنین دشوار است

آن قصر که بهرام درو جام گرفت — آہو بره کرد و شیر آرام گرفت

١٠٢

بهرام که گور میگرفتے به کمند — دیدی که چگونه گور بهرام گرفت

ابر آمد و باز بر سر سبزه گریست — بے باده ارغوان نمی باید زیست

١٠٣

این سبزه که امروز تماشاگه ماست — تا سبزهٔ خاک ما تماشاگه کیست

امروز که آئینه مراد را نام است — ـ نوش کن از قدح پیاپے جا

هر روز اگر یکقدح مے خوردی — امروز دو خور که سید الایام است

آن باده که [illegible] ذات — گاهی حیوان همی شود گاه نبات
تا ظن نبری که هست گردد هیهات — موصوف به ذات است اگر نیست صفات

از آتش این خانه جز دود نیست — وز هیچ کسم امید بهبود نیست
دستی که ز دست چرخ بر سر دارم — در دامن هر که میزنم سود نیست

آنکس که بجگی ترا تکیه بروست — گر چشم خرد باز کنی دشمنت اوست
آن به که درین زمانه کم گیری دوست — با اهل زمانه صحبت از دور نکوست

ای بیخبر این شکل مجسم هیچ است — وین طارم نه سپهر ارقم هیچ است
خوش باش که در نشیمن کون و فساد — وابسته یکدمیم و آن هم هیچ است

با مطرب و می حور سرشتی گر هست — با آب روان کنار کشتی گر هست
بهتر زین مطلب دوزخ فرسوده — حقا که جز این نیست بهشتی گر هست

پیری ز خرابات برون آمد مست — سجاده بدوش و کاسه باده بدست
گفتم شیخا ترا چه حال آمد پیش — گفتا می خور که کار عالم باد است

چون بلبل مست راه در بستان یافت — روی گل و جام باده را خندان یافت
آمد بزبان حال در گوشم گفت — دریاب که عمر رفته را نتوان یافت

خیام تنت بخیمه ماند راست — سلطان روح است و منزلش دار فناست
فراش اجل ز بهر دیگر منزل — ویران کند این خیمه چو سلطان برخاست

خیام که خیمه‌های حکمت میدوخت — در کوره غم فتاد و ناگاه بسوخت
مقراض اجل طناب عمرش ببرید — دلال قضا به رایگانش بفروخت

در فصل بهار با بت حور سرشت — یک کوزه می اگر بود بر لب کشت
هرچند به نزد عام بد باشد این — از سگ بترم اگر کنم یاد بهشت

در جام طرب باده گلرنگ خوش است — با نغمه عود و ناله چنگ خوش است
زاهد که خبر ندارد از جام شراب — دور از بر ما هزار فرسنگ خوش است

دوران جهان بی می و ساقی هیچ است — بی زمزمه نای عراقی خوش نیست
هرچند در احوال جهان می نگرم — حاصل همه عشرت است و باقی هیچ است

دریاب که از روح جدا خواهی رفت — در پرده اسرار خدا خواهی رفت

مے خور که ندانی از کجا آمده　　خوشباش ندانی که کجا خواہی رفت
رفتن چو حقیقت ست پس بودن چیست　　راہ طمع محال پیمودن چیست
۸۸ جائیکه بمصلحت نه خواہند گذاشت　　فارغ ز سفر بودن و آسودن چیست
عمر یست که تو راحی سے و ردِ منست　　و اسباب بیست ہر چه در گرو منست
۸۹ زاہد اگر ایستادہ تو عقلست اینجا　　خوشباش که استاد تو شاگرد منست
فاسق خوانند مردمانم پیوست　　من بیگنهم خیال شان بر من بست
۹۰ بر من بخلاف شرع اے اہل صلاح　　جز خمر و لواطه و زنا جرم نه است
گر در پئے شہوت و ہوا خواہی رفت　　از من خبرت که بینوا خواہی رفت
۹۱ بنگر چه کسی و از کجا آمده　　میدان که چه میکنی کجا خواہی رفت
گردون کمرے ز عمر فرسودهٔ ماست　　جیحون اثرے ز چشم پالودهٔ ماست
۹۲ دوزخ شررے ز رنج بیہودهٔ ماست　　فردوس سے ز وقت آسودهٔ ماست
من بندهٔ عاصیم رضاے تو کجاست　　تاریک دلم نور و صفاے تو کجاست
۹۳ ما را تو بہشت اگر بطاعت بخشی　　این مزد بود لطف و عطاے تو کجاست
من ہیچ ندانم که مرا آن که سرشت　　کرد اہل بہشت خوب یا دوزخ زشت
۹۴ جامے و بتے و بربطے بر لب کشت　　این ہر سه مرا نقد و ترا نسیہ بہشت
من بیخود رمز و ما فغان از چپ و راست　　گویند مخور باده که دین را اعداست
۹۵ چون دانستم که مے عدو دینست　　واللہ بخورم خون عدو را که رواست
نیکی و بدی که در نہاد بشر است　　شادی و غمی که در قضا و قدر است
۹۶ با چرخ مکن حواله کاندر رہ عقل　　چرخ از تو ہزار بار بیچاره تر است
تیر یکه اجل کشد سپر ہا ہیچست　　وین محتشمی و سیم و زر ہا ہیچست
۹۷ چندانکه بروے کار ہا در نگرم　　نیکست که نیکست دگر ہا ہیچست
ہر دل که در و مایهٔ تجرید کم است　　بیچاره ہمه عمر ندیم ندم است
۹۸ جز خاطر فارغ که نشاطے دارد　　باقی ہمه ہر چه ہست اسباب غم است
ہر کو طربے ز عقل در دل می کاشت　　یکروز ز عمر خویش ضایع نگذاشت
۹۹ یا در طلب رضاے یزدان کوشید　　یا راحت خود گزید و ساغر بر داشت

یزدان چو گل وجود ما را آراست — دانست ز فعل ما چه خواهد برخاست

بی حکمش نیست هر گناهی که مراست — پس سوختن قیامت از بهر چه خواست ۱۰۰

یکچند شراب خورده باشی پیوست — هان تا ندهی بروز آدینه ز دست

در مذهب ما شنبه و آدینه یکیست — جبار پرست باش نه روز پرست ۱۰۱

یا رب تو کریمی و کریمی کرم است — عاصی ز چه رو برون ز باغ ارم است

با طاعتم ار ببخشی آن نیست کرم — با معصیتم اگر ببخشی کرم است ۱۰۲

عیش و ارکه روزگار شور انگیز است — ایمن منشین که تیغ دوران تیز است ۱۰۳

در کام تو گر زمانه لوزینه نهد — زنهار فرو مبر که زهر آمیز است

هر جا که گلی و لاله زاری بودست — از سرخی خون شهریاری بودست

هر برگ بنفشه کز زمین می روید — خالیست که بر رخ نگاری بودست ۱۰۴

می لعل مذاب ست و صراحی کانست — جسم ست پیاله و شرابش جانست

آن جام بلورین که ز می خندانست — اشکیست که خون دل درو پنهانست ۱۰۵

می نوش که عمر جاودانی اینست — خود حاصلت از دور جوانی اینست

هنگام گل ست و مل و یاران سرمست — خوش باش دمی که زندگانی اینست ۱۰۶

می خور که بزیر گل بسی خواهی خفت — بی مونس و بی حریف و بی همدم و جفت

زنهار بکس مگو تو این راز نهفت — هر لاله که پژمرده نخواهد بشکفت ۱۰۷

گویند مرا چو سور با حور خوش ست — من میگویم که آب انگور خوش ست

این نقد بگیر و دست از آن نسیه بدار — کآواز دهل شنیدن از دور خوش است ۱۰۸

دل گفت مرا علم لدنی هوس است — تعلیم بکن اگر ترا دسترس است

گفتم که الف گفت دگر هیچ مگو — در خانه اگر کس است یک حرف بس است ۱۰۹

چون آمدنم بمن نبد روز نخست — وین رفتن بی مراد عزمیست درست

برخیز و میان ببند ای ساقی چست — کاندوه جهان بمی فرو خواهم شست ۱۱۰

تا چند زنم بروی دریا ها خشت — بیزار شدم ز بت پرستان کنشت

خیام که گفت دوزخی خواهد بود — گه رفت بدوزخ و گه آمد به بهشت ۱۱۱

بر چهره گل نسیم نوروز خوش ست — در صحن چمن روی دل افروز خوش ست ۱۱۲

ازدی کہ گذشت ہرچہ گوئی خوش نیست — خوش باش وزدی مگو کامروز خوش است

برخیز و بدہ بادہ چہ جای سخن است — کامشب دہن تنگ تو روزی من است

۱۱۳ مارا چو رخ خویش مے گلگون دہ — وین توبۂ من چو زلف تو پر شکن است

برتر ز سپہر خاطرم روز نخست — لوح و قلم و بہشت و دوزخ می جست

۱۱۴ پس گفت مرا معلم از رای درست — لوح قلم و بہشت و دوزخ با تست

آنرا کہ بر منال تحقیق تر است — دانست کہ او نیست درین راہ درست

۱۱۵ ہر کس زدہ است دست در شاخ ہست — امروز چہ دی شناس و فردا چہ نخست

اکنون کہ جہان را بخوشی دست رسیست — ہر زندہ دلی را سوی صحرا ہوسیست

۱۱۶ بر ہر شاخی طلوع موسی دستیست — در ہر نفسی خروش عیسی نفسیست

ای وای بر آن دل کہ درو سوزی نیست — سودا زدۂ مہر دل افروزی نیست

۱۱۷ روزی کہ تو بی عشق بسر خواہی برد — ضایع تر از آن روز ترا روزی نیست

از باد صبا دلم چو بوی تو گرفت — ما را بگذاشت جست و جوی تو گرفت

۱۱۸ اکنون ز منش ہیچ نمی آید یاد — بوی تو گرفتہ بود خوی تو گرفت

با بادہ نشین کہ ملک محمود این است — وز چنگ شنو کہ لحن داود این است

۱۱۹ از آمدہ و رفتہ دگر یاد مکن + — حالی خوش باش زانکہ مقصود این است

دہ عقل و نہ رواق و ز ہشت بہشت — ہفت اختر و از شش جہت این نامہ نوشت

۱۲۰ کز پنج حواس و چار ارکان و سہ روح — ایزد بدو عالم چو تو یکتا نہ سرشت

ویرانیست کہ صد ہزار عیسی دیدست — طوریست کہ صد ہزار موسی دیدست

۱۲۱ قصریست کہ صد ہزار قیصر بگذشت — طاقیست کہ صد ہزار کسری دیدست

سیم ار چہ نمایۂ خرد و مسند انس است — بی سیمان را بلغ جہان زندان است

۱۲۲ از دست تہی بنفشہ سر بر زانوست — وز کیسۂ زر دہان گل خندان است

بس خون کسان کہ چرخ بیباک بریخت — بس گل کہ برآمد از گل و پاک بریخت

۱۲۳ بر حسن و جوانی او بسی غرہ مشو — بس غنچۂ ناشکفتہ بر خاک بریخت

جز حق حکمی کہ حکم را شاید نیست — ہستی کہ ز حکم او برون آید نیست

۱۲۴ ہر چیز کہ ہست آن چنان می باید — آن چیز کہ آنچنان نمی باید نیست

۱۲۵
این گنبد لاجوردی و زرین گشت — بسیار بگشتست و دگر خواهد گشت
یکچند ز اقتضاے دوران قضا — ما نیز چو دیگران رسیدیم و گذشت

۱۲۶
دارنده چو ترکیب طبائع آراست — از بهر چه او فگندش اندر کم و کاست
گر نیک آمد شکستن از بهر چه بود — ور نیک نیامد این صور عیب کراست

۱۲۷
با دشمن و دوست فعل نیکو نیکوست — بد کے کند آنکه نیکیش عادت و خوست
با دوست چو بد کنی شود دشمن تو — با دشمن اگر نیک کنی گردد دوست

۱۲۸
در چشم محققان چه زیبا چه زشت — منزل گه عاشقان چه دوزخ چه بهشت
پوشیدن بیدلان چه اطلس چه پلاس — زیر سر عاشقان چه بالین چه خشت

۱۲۹
بسیار بگشتیم بگرد در و دشت — اندر همه آفاق بگشتیم بگشت
از کس نشنیدیم که آمد زین راه — راهی که برفت راهرو باز گشت

۱۳۰
آیا د خرابات ز مے خوردن ماست — خون دو هزار توبه در گردن ماست
گر من نکنم گناه رحمت که کند — رحمت همه موقوف گنه کردن ماست

۱۳۱
این هستی تو هستی هستے دگرست — وین مستی تو مستی مستے دگرست
رو سر بگریبان تفکر در کش — کین دست تو آستین دستے دگرست

۱۳۲
از فضل عنان بپیچ و در ساغر پیچ — از خلد و سقر بگذر و در کوثر پیچ
دستار فقیه بباده بفروش و تو هیچ — [illegible] به سر پیچ

۱۳۳
بنگر ز جهان چه طرف بربستم هیچ — در حاصل عمر چیست در دستم هیچ
شمع طربم ولے چو بنشستم هیچ — من جام جمم ولے چو بشکستم هیچ

۱۳۴
چون جان بلب آمد چه نشابور و چه بلخ — پیمانه چو پر شود چه شیرین و چه تلخ
مے نوش که بعد از من و تو ماه بسے — از سلخ بغره آید از غره بسلخ

۱۳۵
اے عارض تو نهاده بر نسرین طرح — روے تو فگنده بر بتان چین طرح
وے غمزهٔ تو داده و شه بابل را — اسپ و رخ و فیل و بیدق و فرزین طرح

۱۳۶
این قافلهٔ عمر عجب میگذرد — دریاب دمے که از طرب میگذرد
ساقی غم فرداے حریفان چه خوری — پیش آر پیاله را که شب میگذرد

۱۳۷
آنکس که زمین و چرخ و افلاک نهاد — بس داغ که او بر دل غمناک نهاد

بسیار لب چو لعل و زلفین چو مشک	در طبل زمین و حقه خاک نهاد
ای بیخبر ان عشوه دنیا خرید	چون از همه حالهای او باخبرید
۱۳۸ وین عمر عزیز خویش مدهید بباد	تا ان یار طلب کنید وین باده خورید
ای همنفسان مرا ز می قوت کنید	وین روی چو کهربا چو یاقوت کنید
۱۳۹ چون مرده شوم بمی بشوئید مرا	وز چوب رزم تخته تابوت کنید
امروز که توسن فلک زین کردند	و آرایش مشتری و پروین کردند
۱۴۰ این بود نصیب ما ز دیوان قضا	ما را چه گنه قسمت ما این کردند
افسوس که نان پخته خامان دارند	اسباب تمام ناتمامان دارند
۱۴۱ چشم خوش ترکان تماشا دوست	ملکیست که شاگرد و غلامان دارند
اکنون که دم ز عمر محروم نشد	کم بود ز اسرار که مفهوم نشد
۱۴۲ چون نیک همی بنگرم از روی خرد	عمرم بگذشت و هیچ معلوم نشد
آن قوم که سجاده پرستند خرند	زیرا که بزیر بار سالوس درند
۱۴۳ وین از همه طرفه تر که در پرده زهد	اسلام فروشند و زکافر بترند
انکس که گنه به نزد او سهل بود	این نکته بگوید آنکه او اهل بود
۱۴۴ علم ازلی علت عصیان کردن	نزد یک حکیم غایت جهل بود
آورده باضطرابم اول بوجود	جز حیرتم از حیات چیزی نفزود
۱۴۵ رفتیم باکراه و ندانیم چه بود	زین آمدن و رفتن و بودن مقصود
اندیشه جرم چو بخاطر گذرد	از آتش سینه آهم از سر گذرد
۱۴۶ لیکن شرط است بنده چون توبه کند	مخدوم بلطف خویش از سر گذرد
آنها که خلاصه جهان ایشانند	بر اوج فلک براق فکرت رانند
۱۴۷ در معرفت ذات تو مانند فلک	سرگشته و سرنگون و سرگردانند
ایزد به بهشت وعده با ما میکرد	پس در دو جهان حرام [illegible] کرد
۱۴۸ شخصی ز عرب باده حمزه بی کرد	پیغمبر ما حرام می بروی کرد
۱۴۹ اکنون که ز خوشدلی بجز نام نماند	یک همدم پخته جز می خام نماند
دست طرب از ساغر می باز مگیر	امروز که در دست بجز جام نماند

ای بس که نباشیم و جهان خواهد بود — نے نام ز ما و نے نشان خواهد بود
زین پیش نبودیم و نبد هیچ خلل — زین پس چو نباشیم همان خواهد بود ۱۵۰

اینها که جهان زیر قدم فرسودند — و اندر طلبش هر دو جهان پیمودند
آگاه نمی‌شوم که ایشان هرگز — زین حال چنانکه هست آگه بودند ۱۵۱

افسوس که سرمایه ز کف بیرون شد — و ز دست اجل بسے جگرها خون شد
کس نامد از آنجهان که پرسم از وے — کاحوال مسافران عالم چون شد ۱۵۲

این جمع اکابر که مناصب دارند — از غصه و غم ز جان خود بیزارند
و آنکس که اسیر حرص چون ایشان نیست — وین طرفه که آدمیش می‌نشمارند ۱۵۳

این چرخ جفا پیشهٔ عالی بنیاد — هرگز گره کار کسے نگشاد
هر جا که دلے دید که داغے دارد — داغ دگرے بر سر آن داغ نهاد ۱۵۴

افسوس که نامهٔ جوانی طے شد — وین تازه بهار شادمانی دے شد
آن مرغ طرب که نام او بود شباب — فریاد ندانم که کے آمد کے شد ۱۵۵

با این دو سه نادان که جهان دارانند — از جهل که دانائے جهان ایشانند
خوش باش که خرمی ایشان بمثل — هر کو نه خرست کافرش میدانند ۱۵۶

پیوسته خرابات ز رندان خوش باد — در دامن زهد زاهدان آتش باد
آن دلق بصد پاره و آن صوف کبود — افتاده بزیر پاے دردی‌کش باد ۱۵۷

تا چند اسیر رنگ و بو خواهی شد — چند از پے هر زشت و نکو خواهی شد
گر چشمهٔ زمزمی و گر آب حیات — آخر بدل خاک فرو خواهی شد ۱۵۸

تا یار شراب جانفزایم نه دهد — صد بوسه فلک بر سر و پایم ننهد
گویند که توبه کن اگر وقت آید — چون توبه کنم تا که خدایم نه دهد ۱۵۹

چون مرده شوم خاک مرا گم سازید — واحوال مرا عبرت مردم سازید
خاک تن من بباده آغشته کنید — و ز کالبدم خشت سر خم سازید ۱۶۱

خیام اگرچه خرگهٔ چرخ کبود — زد خیمه و در بست در گفت و شنود
چون شکل حباب باده در جام وجود — ساقی ازل هزار خیام نمود ۱۶۲

خوش باش که غصه بیکران خواهد بود — بر چرخ قران اختران خواهد بود ۱۶۳

خستم که ز قلب تو خواهند زدن ‌— ایوان سرای دیگران خواهد بود

خرم دل آنکسی که معروف نشد ‌— در جبّه و دراعه و در صوف نشد

سیمرغ صفت بعرش پرواز کرد ‌— در کنج خرابهٔ جهان بوف نشد [۱۴۳]

حال گل و مل باده پرستان دانند ‌— نی تنگدلان و تنگدستان دانند

از بیخبری بیخبران معذورند ‌— ذوقیست درین شیوه که مستان دانند [۱۴۴]

در میکده جز بمی وضو نتوان کرد ‌— وان نام که زشت شد نکو نتوان کرد

که ده که کنون پردهٔ مستوری ما ‌— بدریده چنان شد که رفو نتوان کرد [۱۴۵]

دادم بامید روزگارے بر باد ‌— نابوده ز روزگار خود روزے شاد

زان میترسم که روزگارم ندهد ‌— چندانکه ز روزگار بستانم داد [۱۴۶]

در عالم جان بهوش میباید بود ‌— در کار جهان خموش می باید بود

تا چشم و زبان و گوش برجا باشد ‌— بیچشم و زبان و گوش می باید بود [۱۴۷]

در دهر هر آنکه نیم نانے دارد ‌— از بهر نشست آشیانے دارد

نه خادم کس بود نه مخدوم کسے ‌— گو شاد بزی که خوش جهانے دارد [۱۴۸]

در ملک تو از طاعت من هیچ فزود ‌— وز معصیتے که رفت نقصانے بود

بگذار و مگیر چونکه معلوم نشد ‌— گیرنده دیری و گذارنده زود [۱۴۹]

دستے چو نشے که جام و ساغر گیرد ‌— حیف است که او دفتر و منبر گیرد

تو زاهد خشکی و منم فاسق تر ‌— آتش نشنیده ام که در تر گیرد [۱۵۰]

در دهر کسے بگلعذارے نرسید ‌— تا بر دلش از زمانه خارے نرسید

در شانه نگر که تا بصد شاخ نشد ‌— دستش بسر زلف نگارے نرسید [۱۵۱]

در دست همیشه آب انگورم باد ‌— در سر هوس بتان چون حورم باد

گویند مرا که ایزدت توبه دهاد ‌— او خود بدهد من نکنم دورم باد [۱۵۲]

رفتیم زبان زمانه آشفته بماند ‌— با آنکه ز صد گهر یکے سفته نماند

افسوس که صد هزار معنی دقیق ‌— از بیخبری خلق ناگفته بماند [۱۵۳]

روزیست خوش و هوا نه گرم است و نه سرد ‌— ابر از رخ گلزار همی شوید گرد

بلبل بزبان حال با گل زرد ‌— فریاد همی زند که مے باید خورد [۱۵۴]

زان پیش که غمهات شبیخون آرند — فرمای که تا باده گلگون آرند
تو زر نه ای ای غافل نادان که ترا — در خاک نهند و باز بیرون آرند ۱۷۵

از آمدنم نبود گردون را سود — وز رفتن من جاه و جلالش نفزود
وز هیچکسی نیز دو گوشم نشنود — کاین آمدن و رفتنم از بهر چه بود ۱۷۶

سریست همه دانای فلک میدانند — کو موی بموی و رگ برگ میدانند
گیرم که بزرق خلق را بفریبی — با او چه کنی که یک بیک میدانند ۱۷۷

سودازده را باده پر و بال بود — می بر رخ خاتون خرد و خال بود
ماه رمضان باده بخوردیم و برفت — یارب شب عید ماه شوال بود ۱۷۸

شب نیست که عقل در تحیر نشود — وز گریه کنار من پر از در نشود
پر می نشود کاسه سر از سودا — هر کاسه که سرنگون بود پر نشود ۱۷۹

طبعم بنماز و روزه چون مایل شد — گفتم که مراد کلیم حاصل شد
افسوس که آن وضو ببادی بشکست — وان روزه بنیم جرعه می باطل شد ۱۸۰

طبعم همه با روی چو گل پیوندد — دستم همه با ساغر مل پیوندد
از هر جزوی نصیب خود بردارم — زان پیش که جزویم بکل پیوندد ۱۸۱

عشقی که مجازی بود آبش نبود — چون آتش نیم مرده تابش نبود
عاشق باید که ماه و سال و شب و روز — آرام و قرار و خورد و خوابش نبود ۱۸۲

عمرت تا کی بخود پرستی گذرد — یا در پی نیستی و هستی گذرد
می نوش که عمری که اجل در پی اوست — آن به که بخواب یا بمستی گذرد ۱۸۳

قومی ز گزاف در غرور افتادند — و اندر طلب حور و قصور افتادند
معلوم شود چو پردها بردارند — کز کوی تو دور دور دور افتادند ۱۸۴

گویند بهشت و حور عین خواهد بود — وانجا می ناب و انگبین خواهد بود
گر ما می و معشوقه پرستیم رواست — چون عاقبت کار همین خواهد بود ۱۸۵

گر باده بکوه بر نشانی رقص کند — ناقص بود آنکه باده را نقص کند
از باده مرا توبه چه میفرمائی — روحیست که او تربیت شخص کند ۱۸۶

گر گرد دل من درین قفس تنگ آید — از بهر [illegible] آب و گلش ننگ آید ۱۸۷

گفتم که مگر بشکنم این زندان را ‌ ‌ پایم ز رکاب شرع بر سنگ آید

گویند که ماه رمضان گشت پدید ‌ ‌ من بعد بگرد باده نتوان گردید

۱۸۸ در آخر شعبان بخورم چندان می ‌ ‌ کاندر رمضان مست بیفتم تا عید

گر شربت عیش صاف باشد گه درد ‌ ‌ گر پوشش ما پلاس باشد گه برد

۱۸۹ اینها همه سهل است به نزد عاقل ‌ ‌ این واقعه سهل است که می باید مرد

کس مشکل اسرار ازل را نگشاد ‌ ‌ کس یکقدم از نهاد بیرون ننهاد

۱۹۰ من می‌نگرم ز مبتدی تا استاد ‌ ‌ عجز است بدست هر که از مادر زاد

کم کن طمع جهان که باشی خرسند ‌ ‌ از نیک و بد زمانه بگسل پیوند

۱۹۱ خوش باش چنانکه هست این دور فلک ‌ ‌ هم بگذرد و نماند این دوری چند

کس را پس پردهٔ قضا راه نشد ‌ ‌ وز سر قدر هیچ کس آگاه نشد

۱۹۲ هفتاد و دو سال فکر کردم شب و روز ‌ ‌ معلوم نگشت و قصه کوتاه نشد

گویند بحشر گفتگو خواهد بود ‌ ‌ وان یار عزیز تند خو خواهد بود

۱۹۳ از خیر محض جز نکوئی ناید ‌ ‌ خوش باش که عاقبت نکو خواهد بود

می خور که ز دل کثرت و قلت ببرد ‌ ‌ و اندیشهٔ هفتاد و دو ملت ببرد

۱۹۴ پرهیز مکن ز کیمیائی که ازو ‌ ‌ یکمن بخوری هزار علت ببرد

می گرچه حرامست ولی تا که خورد ‌ ‌ وانگاه چه مقدار و دگر با که خورد

۱۹۵ هرگاه که این سه شرط شد راست بگو ‌ ‌ گر می نخورد مردم دانا که خورد

من باده بجام یکمنی خواهم کرد ‌ ‌ خود را بدو جام می غنی خواهم کرد

۱۹۶ اول سه طلاق عقل و دین خواهم داد ‌ ‌ پس دختر رز را بزنی خواهم کرد

من می خورم و هر که چو من اهل بود ‌ ‌ می خوردن او نزد خدا سهل بود

۱۹۷ می خوردن من حق ز ازل میدانست ‌ ‌ گر من نخورم علم خدا جهل بود

میخواره اگر غنی بود عور شود ‌ ‌ وز عربده‌اش جهان پر از شور شود

۱۹۸ در حقهٔ لعل زان زمرد ریزم ‌ ‌ تا دیدهٔ افعی غمم کور شود

نابرده بصبح در طلب شامی چند ‌ ‌ تنها ده ز خود شتن برون گامی چند

۱۹۹ در کسوت خاص آمده عامی چند ‌ ‌ بدنام کنندهٔ نکونامی چند

وقتے کہ طلوع صبح ازرق باشد — باید کہ بکف جام مروّق باشد

گویند کہ حق تلخ بود در افواہ — باید کہ بدین دلیل مے حق باشد ۲۰۰

وقت است کہ از سبزہ جہان آرایند — موسی صفتان ز شاخ کف بنمایند

عیسی صفتان ز خاک بیرون آیند — وز چشم سحاب چشمہا بگشایند ۲۰۱

هان تا ننهی بر تن خود غصہ و درد — تا جمع کنی سیم سفید و زر زرد

زان پیش کہ گرد و نفس گرم تو سرد — با دوست بخور کہ دشمنت خواہد خورد ۲۰۲

هر جرعہ کہ ساقیش بجام افشاند — در دیدہ گرم آتش غم بنشاند

سبحان اللہ ز بادہ می پنداری — آبی کہ ز صد درد دلت برهاند ۲۰۳

زاہد بکرم ترا چو مانشناسد — بیگانہ ترا چو آشنا نشناسد

گفتی کہ گنہ کنی بدوزخ بروی — این را بکسے گو کہ ترا نشناسد ۲۰۴

یاران چو باتفاق میعاد کنید — خود را بجمال یکدگر شاد کنید

ساقی چو مئے مغانہ برکف گیرد — بیچارہ فلان را بدعا یاد کنید ۲۰۵

یکروز ز فلک کار مرا ساز نداد — ہرگز سوئے من دمے خوش آواز نداد

یکروز دمے ز شادمانی نزدم — کان روز بدست صد غمم باز نداد ۲۰۶

یکنان بدو روز اگر شود حاصل مرد — وز کوزہ شکستہ دم آبے سرد

محکوم کم از خودے چرا باید بود — یا خدمت چون خودے چرا باید کرد ۲۰۷

تا زہرہ و مہ در آسمان گشت پدید — بہتر ز مئے لعل کسے ہیچ ندید

من در عجبم ز می فروشان کایشان — بہ زانچہ فروشند چہ خواہند خرید ۲۰۸

آنانکہ محیط فضل و آداب شدند — در جمع کمال شمع اصحاب شدند

رہ زین شب تاریک نبردند برون — گفتند فسانہ و در خواب شدند ۲۰۹

ہر صبح کہ روئے لالہ شبنم گیرد — بالای بنفشہ در چمن خم گیرد

انصاف مرا ز غنچہ خوش می آید — کو دامن خویشتن فراہم گیرد ۲۱۰

گردون ز سحاب نسترن می ریزد — گوئی کہ شگوفہ در چمن می ریزد

در جام چو سوسن مئے گلگون ریزم — کز ابر بنفشہ گون سمن می ریزد ۲۱۱

پیرانہ سرم عشق تو در دام کشید — ورنہ ز کجا دست من و جام نبید

آن توبه که عقل داد جانان بشکست   زان جامه که صبر و وقت ایام دریده
آن مرد نیم کز عدمم بیم آید   آن نیمم مرا خوشتر ازین نیم آید
۲۱۳ جانیست مرا بعاریت داده خدا   تسلیم کنم چو وقت تسلیم آید
اجرام که ساکنان این ایوانند   اسباب تردد خردمندانند
۲۱۴ هان تا سر رشتهٔ خرد گم نکنی   کانان که مدبرند سرگردانند
آنها که فلک ریزهٔ دهر آرایند   آیند و روند و باز با دهر آیند
۲۱۵ در دامن آسمان و در جیب زمین   خلقیست که تا خدا نمیرد زایند
آنها که اسیر عقل و تمییز شدند   در حسرت هست و نیست ناچیز شدند
۲۱۶ رو با خبران و آب انگور گزین   کاین بیخبران بغوره میویز شدند
آن عقل که در راه سعادت پوید   روزی صد بار خود ترا می گوید
۲۱۷ دریاب تو این یکدمه وقت که نهٔ   آن تره که بدروند و دیگر روید
ماه رمضان برفت شوال آمد   هنگام نشاط و عیش و قوال آمد
۲۱۸ آمد گه آنکه خیکها اندر دوش   گویند که پشت پشت حمال آمد
یاران موافق همه از دست شدند   در پای اجل یگان یگان پست شدند
۲۱۹ بودند بیک شراب در مجلس عمر   دوری دو سه پیشتر ز ما مست شدند
آنانکه بکهنه و بنو موصوفند   در ره بکف آب و دو نان موقوفند
۲۲۰ گویند که شبلی و جنیدیم همه   شبلی نه ولی در کرخ معروفند
تا خاک مرا بقالب آمیخته اند   بس فتنه که از خاک برانگیخته اند
۲۲۱ من بهتر ازین نمی توانم بودن   کز بوته مرا چنین برون ریخته اند
آنها که کشندهٔ نبید ناب اند   وانها که بشب مدام در محراب اند
۲۲۲ بر خشک یکی نیست همه در آب اند   بیدار یکیست دیگران در خواب اند
از آب عدم تخم مرا کاشته اند   از آتش غم روح من افراشته اند
۲۲۳ سرگشته چو باد دمبدم گرد جهان   تا خاک من از جای برداشته اند
چون نیست درین زمانه سودی ز خرد   جز بیخرد از زمانه بر می نخورد
۲۲۴ پیش آور ازآنکه او خرد را ببرد   تا بو که زمانه سوی ما برنگرد

چون شاهد روح خانه پرداز شود — هر جنس باصل خویشتن باز شود
این ساز وجود چار ابریشم طبع — از زخمهٔ روزگار بی‌ساز شود ۲۲۵

آنها که بکفر و در معنی سفتند — در ذات خدا بتخمینها گفتند
واقف چو نگشتند بر اسرار فلک — اول زنخی زدند و آخر خفتند ۲۲۶

این خلق همه خران با افسوس اند — پر مشغله و میان تهی چون کوس اند
خواهی که کنی پای ترا می بوسند — خوش نام بزی که بندهٔ ناموس اند ۲۲۷

روزی که جزای هر صفت خواهد بود — قدر تو بقدر معرفت خواهد بود
در حسن صفت کوش که در روز جزا — حشر تو بصورت صفت خواهد بود ۲۲۸

آن کاسه گری که کاسه سرها کرد — در کاسه گری صفات خود پیدا کرد
بر خوان وجود ما نگون کاسه نهاد — وان کاسهٔ سرنگون پر از سودا کرد ۲۲۹

از واقعهٔ ترا خبر خواهم کرد — وان را بدو حرف مختصر خواهم کرد
با عشق تو در خاک فرو خواهم شد — با مهر تو سر ز خاک بر خواهم کرد ۲۳۰

دل چو غنیمت است که نور از رخ دلگیرد — وز پیر در غمش زندگی از سر گیرد
صفت شمع به پروانه دلی باید گفت — کین حدیثیست که با سوختگان در گیرد ۲۳۱

جانم بفدای آنکه او اهل بود — سر در قدمش اگر نهم سهل بود
خواهی که بدانی بیقین دوزخ را — دوزخ بجهان صحبت نااهل بود ۲۳۲

خورشید کمند صبح بر بام افکند — کیخسرو روز باده در جام افکند
می خور که منادی سحر خیزان — آوازهٔ اشربوا در ایام افکند ۲۳۳

یاران بموافقت چو میعاد کنید — باید که ز دوست یاد بسیار کنید
چون بادهٔ خوشگوار نوشید بهم — نوبت چو بما رسد نگونسار کنید ۲۳۴

چندان کرم و لطف ز آغاز چه بود — وان داشتنم در طرب و ناز چه بود
اکنون همه در رنج دلم میکوشی — آخر چه گناه کرده ام باز چه بود ۲۳۵

آنها که اساس کار بر زرق نهند — آیند و میان جان و تن فرق نهند
بر فرق نهم خم سبوی را پس ازین — گر همچو خروس اره بر فرق نهند ۲۳۶

آنها که در آمدند در جوش شدند — آشفتهٔ ناز و طرب و نوش شدند

خوردند زمی بیالی و خاموش شدند — در خاک ابد جمله هم آغوش شدند
زد اکن نصیب نیکبختان بخشند — قسمی بمن رند پرستان بخشند

۲۳۸
گر نیک آییم مرا از ایشان شمرند — ور بد باشم مرا بدیشان بخشند
از گردش روزگار زبهر سے برگیر — بر تخت طرب نشین بکف ساغر گیر

۲۳۹
از طاعت و معصیت خدا مستغنیست — باری تو مراد خود ز عالم برگیر
افلاک که جز غم نفزایند دگر — ننهند بجا تا نربایند دگر

۲۴۰
نا آمدگان اگر بدانند که ما — از دهر چه میکشیم نایند دگر
از بودنی ای دوست چه داری تیمار — وز فکرت بیهوده دل و جان افگار

۲۴۱
خرم تو بزی جهان بشادی گذران — تدبیر نه با تو کرده اند اول کار
این اهل قبور خاک گشتند و غبار — بیخود شده و بیخبرند از همه کار

۲۴۲
هر ذره ز هر ذره گرفتند کنار — آه این چه سرابست که تا روز شمار
ایدل همه اسباب جهان خواسته گیر — باغ طربت بسبزه آراسته گیر

۲۴۳
وانگاه بران سبزه شبی چون شبنم — بنشسته و بامداد برخاسته گیر
سنت مکن و فریضهٔ حق بگذار — وان لقمه که داری ز کسان باز مدار

۲۴۴
غیبت مکن و بجوی کس را آزار — هم وعدهٔ آن جهان منم باده بیار
از گردش این زمانهٔ دون پرور — با صد غم و دردی برم عمر بسر

۲۴۵
چون غنچه بگذار از جهان با دل تنگ — چون لاله ز باغ دهر با خون جگر
ایام جوانیست شراب اولی تر — با خوش پسران بادهٔ ناب اولی تر

۲۴۶
این عالم فانی چو خرابست بآب — از باده درو مست و خراب اولی تر
ای در طلب تو عالمی در شر و شور — درویش تو درویش و توانگر همه عور

۲۴۷
ای با همه در حدیث و گوش همه کر — وی با همه در حضور و چشم همه کور
با سفلگان خسی و بی عقل و وقار — ز نهار مخور باده که رنج آرد بار

۲۴۸
بدمستی و شور و عربده در شب عیش — دردسر و عذر خواهش روز خمار
چون نیست ز آخر آنکه رود اقرار — چندین نبی مراد دل رنج مدار
نان تا نشنی بر دل خود چندین بار — تمهید گفتن وگذشتن است آخر کار

ای جان سه ماه است تا مشوش مخور | پیمانه دیتان تو دلکش می خور

۲۵۰ ای خون رز است و رز ترا میگوید | خون بر تو حلال کرده ام خوش میخور

دلتنگ شوی بگو که بنگ بخور | یا بنگ منکی باده گلرنگ بخور

۲۵۱ صوفی شده این نخوری آن نخوری | در خورد تو سنگست برو سنگ بخور

دی کوزه گری بدیدم اندر بازار | بر تازه گلی لگد همی زد بسیار

۲۵۲ وان گل بزبان حال با وی میگفت | من همچو تو بوده ام مرا نیکو دار

یک بوسه از ملکت جم خوشتر | بوسی قدح از نماز مریم خوشتر

۲۵۳ آه سحری ز سینه خمارے | از ناله بو سعید و ادهم خوشتر

در دایره سپهر ناپیدا غور | جامیست که جمله را چشانند بدور

۲۵۴ نوبت چو بدور تو رسد آه مکن | مے نوش بخوشدلی که دوریست بجور

عمر تو چه دو صد وچه سی صد چه هزار | زین کهنه سرا برون برندت ناچار

۲۵۵ گر پادشهی وگر گدای بازار | این هر دو بیک نرخ بود آخر کار

او را خواهی ز زن و فرزند بگیر | مردانه در آ ز خویش پیوند ببر

۲۵۶ هر چیز که هست بند راه است ترا | با بند چگونه ره روی بند ببر

ای بیل چه حقیقت جهانست مجاز | چندین چه خوری تو غم ازین رنج دراز

۲۵۷ تن را بقضا سپار و با درد بساز | کین رفته قلم ز بهر تو ناید باز

از جمله رفتگان این راه دراز | باز آمده کو که بما گوید راز

۲۵۸ زنهار درین سراچه از روی مجاز | چیزے نگذاری که نمی آئی باز

این چرخ که با کسی نمیگوید راز | کشته است بستم هزار محمود و ایاز

۲۵۹ می خور که بکس عمر دوباره ندهد | هر کس که شد از جهان نمی آید باز

ای بر همه سروران عالم فیروز | وانی که چه وقت می بود روح افروز

۲۶۰ یکشنبه و دوشنبه و سه شنبه و چهار | پنجشنبه و آدینه و شنبه شب و روز

ای خوش پسر غمزه گر رنگ آمیز | بنشین و هزار فتنه بنشان و بخیز

۲۶۱ تو حکم همی کنی که در من منگر | این حکم چنان بود که کج دار و مریز

۲۶۲ با تو بخرابات اگر گویم راز | به زانکه کنم بی تو به محراب نماز

ای اول و آخر همه خلقان تو
با مردم پاکباز و عاقل آمیز
گر زهر و بدتر از خردمند بجوش
بازے بودم پریده از عالم راز
اینجا چو نیافتم کسے محرم راز
مکلے که از او کمال باشد پرهیز
آنگاه میان امر و نهیش عاجز
رفتند و ز رفتگان یکے نامد باز
کارت ز نیاز میکشاید نه نماز
رو بر سر افلاک جهان خاک انداز
چه جای عبادت و چه جای نماز
از گوهر طاعتت نسفتم هرگز
نومید نیم ز بارگاه کرمت
کردیم دگر شیوهٔ رندی آغاز
هر جا که صراحی است ما را عینی
ما لعبتگانیم و فلک لعبت باز
بازیچه همی کنیم بر نطع وجود
می پرسیدی که چیست این نقش مجاز
نفسیست پدید آمده از دریائی
ما عاشق و آشفته و مستیم امروز
از هستی خویشتن بکلی رسته
معشوق که عمرش چو عمر باد دراز
بر چشم من انداخت و می چشم و بزد
لب بر لب کوزه بردم از غایت آز
لب بر لب من نهاد و می گفت براز

خواهی تو مرا بسوز و خواهی بنواز
از نا اهلان هزار فرسنگ گریز
در نوش و بهر ز دست نا اهل بریز
تا بو که رسم من از نشیبی به فراز
زان در که در آمدم برون رفتم باز
فرموده و امر کرده کز وی بگریز
در مانده جهانیان که کج دار و مریز
تا با تو بگوید سخن از پردهٔ راز
بازیچه بود نماز بے صدق و نیاز
مے خور و گرد خوبرویان می تاز
از جملهٔ رفتگان یکے نامد باز
گرد گنه از چهره نرفتم هرگز
زیرا که یکے را دو نگفتم هرگز
تکبیر همی زنیم بر پنج نماز
گردن چو صراحی سوی آن کرده دراز
از روی حقیقتی نه از روی مجاز
رفتیم بصندوق عدم یک یک باز
گر بر گویم حقیقتش هست دراز
وانگاه شده بقعر آن دریا باز
در کوی مغان باده پرستیم امروز
پیوسته بمحراب الستیم امروز
امروز ز بهر تو خطے کرد آغاز
یعنی که نکوئی کن و در آب انداز
تا زو طلبم واسطهٔ عمر دراز
مے خور که برین جهان نمی آئی باز

در کتم عدم شفقت پدرم گفتی چیست   دارد و جهان دور جهان شور انگیز
واکنون که بفرمان تو ام حیرانم   القصه چنان ذره که نج دارد و مریز ۲۷۵

ای واقف اسرار ضمیر همه کس   در حالت عجز دستگیر همه کس
یارب تو مرا توبه ده و عذر پذیر   ای توبه ده و عذر پذیر همه کس ۲۷۶

مرغی دیدم نشسته بر باره طوس   در پیش نهاده کلهٔ کیکاوس
با کله همیگفت که افسوس افسوس   کو بانگ جرسها و کجا نالهٔ کوس ۲۷۷

انجا و ثنا زمانه آینده مپرس   وز هرچه رسد چو نیست پاینده مپرس
این یکدمه نقد را غنیمت میدان   از رفته میندیش و ز آینده مپرس ۲۷۸

آغاز روان گشتن آن زرین طاس   و انجام خرابی چنین نیک اساس
دانسته نمیشود به معیار عقول   سنجیده نمیشود بمقیاس قیاس ۲۷۹

پندی دهمت اگر بمن داری گوش   از بهر خدا جامهٔ تزویر مپوش
عقبی همه ساعتست و دنیا یکدم   از بهر دمی ملک ابد را مفروش ۲۸۰

تا چند کنم عرضه نادانی خویش   بگرفت دل من از پریشانی خویش
زنار مغانه بر میان خواهم بست   دانی زچه از ننگ مسلمانی خویش ۲۸۱

خیام اگر ز باده مستی خوش باش   با لاله رخی اگر نشستی خوش باش
چون آخر کار نیست خواهی بودن   انگار که نیستی چو هستی خوش باش ۲۸۲

در کارگه کوزه گری رفتم دوش   دیدم دو هزار کوزه گویا و خموش
ناگاه یکی کوزه بر آورد خروش   کو کوزه گر و کوزه خر و کوزه فروش ۲۸۳

سرمست بمیخانه گذر کردم دوش   پیری دیدم مست و سبوی بر دوش
گفتم ز خدا شرم نداری ای پیر   گفتا کرم از خداست رو باده بنوش ۲۸۴

می را که خضر خجسته دارد پاسش   از آب حیاتست و منم الیاسش
من قوت دل و قوت روحش خوانم   چون گفت خدا منافع للناسش [illegible]

گر چه حراست مدامش مینوش   با نغمه و چنگ صبح و شامش مینوش
جائی ز می لعل گرت دست دهد   یکقطره رها مکن و تمامش مینوش ۲۸۶

هفتاد و دو ملتند در دین کم و بیش   از ملتها عشق تو دارم در پیش

چه کفر و چه اسلام چه طاعت چه گناه
مقصود توئی بهانه بردار از پیش
ای یک سر مو ببین و گنه ده و بخش
هر جرم که رفت حسبة لله بخش
از باده هوا آتش کین زا مغرور
ما [illegible] طفیل رسول الله بخش
غم چند خوری زکار نا آمده پیش
رنجست نصیب مردم دوراندیش
خوش باش و جهان تنگ مکن بر دل خویش
کز خوردن غم قضا نگردد کم و بیش
جامیست که عقل آفرین می زندش
صد بوسه ز مهر بر جبین می زندش
این کوزه گر دهر چنین جام لطیف
می سازد و باز بر زمین می زندش
می در قدح الصاف که جانیست لطیف
در کالبد شیشه روانیست لطیف
لایق نبود هیچ گران همدم من
جز ساغر باده کان گرانیست لطیف
ای چرخ فلک بزنان [illegible]
پیوسته مرا برهنه سازی چو [illegible]
از چرخ زنی دو شخص پوشیده شود
پس چرخ زنی به از تو ای چرخ فلک
گر گل نبود نصیب ما خار اینک
ور نور نباشد نرسد نار اینک
ور سبحه و سجاده و شیخی نبود
ناقوس و کلیسیا و زنار اینک
گر صلح نیابم ز فلک جنگ اینک
[illegible] نباشدم ننگ اینک
جام می لعل ارغوان رنگ اینک
[illegible] سر و سنگ اینک
این صبح دمید و دامن شب شد پاک
برخیز و صبوح کن چرا غمناک
می نوش دلا که صبح بسیار دمد
[illegible] کرده و ما زیر خاک
از آتش آخرت نمیداری باک
ور آب [illegible] نشوی هرگز پاک
چون باد اجل چراغ عمرت بکشد
ترسم که ترا ز ننگ نپذیرد خاک
این صورت کون جمله نقش خیال
عارف نبود هر که نداند [illegible]
بنشین قدح باده بنوش و خوش باش
فارغ شو از این نقش خیالات محال
با سرو قدی تازه تر از خرمن گل
از دست مده جام می و دامن گل
زان پیش که ناگه شود از باد اجل
پیراهن عمر تو چو پیراهن گل
در سر مگذار هیچ سودای محال
ای [illegible] سال ساغر مالامال
با دختر رز نشین و عیشی میکن
دختر بحرام به که مادر بحلال

۳۰۰
عشق کمال دلربایی به جمال — دل پرغم و زبان زگفتن شده لال
زین نادره ترک وعده یارب بجهان — من تشنه و پیش من روان آب زلال

۳۰۱
و برکف من نه و بر آور ز تغافل — با ناله عندلیب و صورت بلبل
بی نغمه اگر روا بود می خوردن — می از سر شیشه می نگردد قلقل

۳۰۲
اسرار حقیقت نشود حل بسوال — نه نیز به در باختن نعمت و مال
تا جان نکنی و خون نخوری پنجه سال — از قال ترا ره ننماید بحال

۳۰۳
از جرم حضیض خاک تا اوج زحل — کردم همه مشکلات گردون را حل
بیرون جستم ز بند هر مکر و حیل — هر بند گشاده شد مگر بند اجل

۳۰۴
تا کی ز ابد حدیث و تا کی ز ازل — بگذشت ز اندازه من علم و عمل
هنگام طرب شراب را نیست بدل — هر مشکل را شراب گرداند حل

۳۰۵
از خالق کردگار و از رب رحیم — نومید مشو بجرم عصیان عظیم
گر مست و خراب مرده باشی امروز — فردا بخشد بر استخوان های رمیم

۳۰۶
ای چرخ ز گردش تو خرسند نیم — آزادم کن که لایق بند نیم
گر میل تو با بیخرد و نادانست — من نیز چنان اهل و خردمند نیم

۳۰۷
ای مفتی شهر از تو پرکارتریم — با این همه مستی از تو هشیارتریم
تو خون کسان خوری و ما خون رزان — انصاف بده کدام خونخوارتریم

۳۰۸
آن به که بجام باده دل شاد کنیم — وز آمده و گذشته کم یاد کنیم
وین عاریتی روان زندانی را — یک لحظه ز بند عقل آزاد کنیم

۳۰۹
تا کی لحظه که از اجل گریزان گردیم — چون برگ ز شاخ عمر ریزان گردیم
خواهم ز نشاط دل بسی شاد کنیم — زان پیش که خاک خاک بیزان گردیم

۳۱۰
این چرخ فلک که ما درو حیرانیم — فانوس خیال از و مثالی دانیم
خورشید چراغدان و عالم فانوس — ما چون صوریم کاندر او گردانیم

۳۱۱
از آب و گل سرشته من چه کنم — وین پشم و قصب تو رشته من چه کنم
هر نیک و بدی که آید از ما بوجود — تو بر سر من نوشته من چه کنم

۳۱۲
ای دوست بیا تا غم فردا نخوریم — وین یکدم عمر را غنیمت شمریم

فردا که ازین دیر کهن درگذریم — با هفت هزار سالگان هم سفریم
بی باده مباش تا توانی یکدم — کز باده شود عقل و دل و دین خرم
ابلیس اگر باده بخوردی یکدم — کردی دو هزار سجده پیش آدم

برخیز و بکوب پای تا دست زنیم — می در نظر نرگس سرمست زنیم
در بیست زدن ذوق ندارد چندان — ذوق عجب آن بود که در شصت زنیم

برخود در کام و آرزو در بستم — وز منت هر ناکس و کس وارستم
جز دوست چو کس نیست که گیرد دستم — من دانم و او چنانکه هستم هستم

پیوسته ز گردش فلک غمگینم — با طبع خسیس خویشتن در کینم
علمی نه که از سر جهان برخیزم — عقلی نه که فارغ ز جهان بنشینم

بر مفرش خاک خفتگان می بینم — در زیر زمین نهفتگان می بینم
چندانکه بصحرای عدم می نگرم — نا آمدگان و رفتگان می بینم

با رحمت تو من از گنه نندیشم — با توشهٔ تو ز رنج ره نندیشم
گر لطف توام سفید رو گرداند — یک ذره ز نامهٔ سیه نندیشم

تا ظن نبری که از جهان می ترسم — وز مردن و از رفتن جان می ترسم
مردن چو حقیقت است زان باکم نیست — چون نیک نزیستم از آن می ترسم

تا چند اسیر عقل هر روزه شویم — در دهر چه صد ساله چه یکروزه شویم
در ده تو بکاسه می ازان پیش که ما — در کارگه کوزه گران کوزه شویم

تا چند ملامت کنی ای زاهد خام — ما رند و خراباتی و مستیم مدام
تو در غم تسبیح و ریا و تلبیس — ما با می و معشوقه مدامیم بکام

با نفس همیشه در نبردم چه کنم — وز کردهٔ خویشتن بدردم چه کنم
گیرم که ز من درگذرانی بکرم — زان شرم که دیدی که چه کردم چه کنم

جانا من و تو نمونهٔ پرگاریم — سر گرچه دو کرده ایم یکتن واریم
بر نقطه روانیم کنون دایره وار — تا آخر کار سر بهم باز آریم

چون نیست مقام ما درین دیر مقیم — پس بی می و معشوق خطائیست عظیم
تا کی ز قدیم و محدث او مرد حکیم — چون من ز جهان چه محدث چه قدیم

۳۲۵
در مسجد اگرچه با نیاز آمده ام | حقا که نه از بهر نماز آمده ام
روزی اینجا سجاده دزدیدم | آن کهنه شدست باز باز آمده ام

۳۲۶
دیگر غم این گردش گردون نخوریم | جز باده ناب صاف گلگون نخوریم
خون جهانست و جهان خونی ما | ما خون دل خونی خود چون نخوریم

۳۲۷
در عشق تو صد گونه ملامت بکشم | ور بشکنم این عهد غرامت بکشم
گر عمر وفا کند جفاهای ترا | بارے کم از آنکه تا قیامت بکشم

۳۲۸
در دایرهٔ وجود دیر آمده ایم | وز پایهٔ مردمی بزیر آمده ایم
چون عمر نه بر مراد ما میگذرد | اے کاش سر آمدے که سیر آمده ایم

۳۲۹
دنیا چو فناست من بجز فن نکنم | جز یاد نشاط و می روشن نکنم
گویند مرا که ایزدت توبه دهاد | او خود ندهد و گر دهد من نکنم

۳۳۰
در پای اجل چو من سرافگنده شوم | در دست اجل چو مرغ پرکنده شوم
زنهار گلم بجز صراحی مکنید | باشد که ببوی می دمی زنده شوم

۳۳۱
زنیکو نه که من کار جهان می بینم | عالم همه رایگان بران می بینم
سبحان الله بهر چه در مینگرم | ناکامی خویش اندر آن می بینم

۳۳۲
جمع است دمی بری گلرنگ زنیم | وین شیشهٔ نام و ننگ بر سنگ زنیم
دست از امل دراز خود باز کشیم | در زلف دراز و دامن چنگ زنیم

۳۳۳
گر من گنه روی زمین کردستم | عفو تو امید است که گیرد دستم
گفتی که بروز عجز دستت گیرم | عاجز تر ازین مخواه کاکنون هستم

۳۳۴
گر من ز می مغانه مستم هستم | ور کافر و گبر و بت پرستم هستم
هر طایفه بمن گمانے دارند | من زان خودم چنانکه هستم هستم

۳۳۵
هشیار نبوده ام دمے تا هستم | امشب شب قدر است و من امشب مستم
لب بر لب جام و سینه بر سینهٔ خم | تا روز بگردن صراحی دستم

۳۳۶
من ظاهر نیستی و هستی دانم | من باطن هر فراز و پستی دانم
با این همه از دانش خود شرمم باد | گر مرتبهٔ ورای مستی دانم

من باده خورم و لیک مستی نکنم | الا بقدح دراز دستی نکنم

ای آنکه غرض ز سیر پرستی چه بود — تا همچو تو خویشتن پرستی نکنیم
محروم هستی مگر با تو گوییم یک دم — اگر اول کار خود چه بود ست آدم
۴۳۸ محنت زده سرشته اند از گل غم — یکچند جهان بخورد و برداشت قدم

ما جامه نمازی به لب خم کردیم — خود را به یکی نعل چو مردم کردیم
۴۳۹ در کوی خرابات اگر بتوان یافت — آن عمر که در صومعه‌ها گم کردیم

مقصود ز جمله آفرینش ماییم — در چشم خرد جوهر بینش ماییم
۴۴۰ این دایره جهان چو انگشتری است — بی هیچ شکی نقش نگینش ماییم

ما کز می بیخودی طربناک شدیم — وز پایه دون بر سر افلاک شدیم
۴۴۱ آخر همه زآلایش تن پاک شدیم — از خاک بر آمدیم و با خاک شدیم

من در رمضان روزه اگر میخوردم — تا ظن نبری که بی خبر میخوردم
۴۴۲ از محنت روزه روز من چون شب بود — پنداشته بودم که سحر میخوردم

هرگز بطرب شربت آبی نخوریم — تا از کف اندوه شرابی نخوریم
۴۴۳ نانی نه زنیم در نمک هیچ گهی — تا از جگر خویش کبابی نخوریم

هر روز بر آنم که در خرابات شوم — همراه قلندران طامات شوم
۴۴۴ چون عالم سر و الخفیات توئی — توفیق ده تا بمناجات شوم

یکچند بغم ایام نداریم خوشیم — گر چاشت بود و شام نداریم خوشیم
۴۴۵ چون پخته بما همی رسد از مطبخ — از کس طمع خام نداریم خوشیم

یک روز ز بند عالم آزاد نیم — یک دم زدن از وجود خود شاد نیم
۴۴۶ شاگردی روزگار کردم بسیار — در کار جهان هنوز استاد نیم

یکدست بمصحفیم و یکدست بجام — گه نزد حلالیم و گهی نزد حرام
۴۴۷ ماییم درین گنبد فیروزه رخام — نه کافر مطلق نه مسلمان تمام

از من بر مصطفی رسانید سلام — و آنگاه بگوئید باعزاز تمام
۴۴۸ کای سید هاشمی چرا دوغ ترش — در شرع حلال است و مئی ناب حرام

از من بر خیام رسانید سلام — و آنگاه بگوئید که خامی خیام
۴۴۹ من کی گفتم که می حرامست ولی — بر پخته حلال است و بر خام حرام

گر من بغلط گفت کہ من فیلسوفم ‌‌ ‌ اینرو دانند کہ آنچہ او گفت نیم
لیکن چو درین غم آشیان آمده‌ام ٢٥٠ آخر کم از آن کہ من ندانم کہ کیم

چندانکه ز خود نیست ترم مست ترم ‌ هر چند بلند پایه تر پست ترم
زین طرفه تر آنکه از شراب هستی ٢٥١ هر لحظه که هشیار ترم مست ترم

گل گفت کہ من یوسف مصر چمنم ‌ یاقوت گران مایه پر زر دهنم
گفتم چو تو یوسفی نشانی بنمای ٢٥٢ گفتا کہ بخون غرق نگر پیرهنم

یکچند بکودکی باستاد شدیم ‌ یکچند باستادی خود شاد شدیم
پایان سخن شنو کہ ما را چه رسید ٢٥٣ از خاک بر آمدیم و بر باد شدیم

پاک از عدم آمدیم ناپاک شدیم ‌ آسوده در آمدیم غمناک شدیم
بودیم ز آب دیده در آتش دل ٢٥٤ دادیم بباد عمر و در خاک شدیم

در جستن جام جم جهان پیمودیم ‌ روزی ننشستیم و شبی نغنودیم
ز استاد چو وصف جام جم بشنودیم ٢٥٥ خود جام جهان نمای جم من بودیم

فرزین صفتا کست غمهات شدم ‌ از اسپ پیاده از جفاهات شدم
از بازی فیل و شاه چون در ماندم ٢٥٦ رخ بر رخ تو نهاده‌ام مات شدم

ایزد چو نخواست آنچه من خواسته‌ام ‌ کی گردد راست آنچه من خواسته‌ام
گر جمله صواب است که او خواسته است ٢٥٧ پس جمله خطاست آنچه من خواسته‌ام

هنگام گلست اختیاری بکنم ‌ و انگه به خلاف شرع کاری بکنم
با سبزه خطان و لاله رخ روز چند ٢٥٨ بر سبزه ز جرعه لاله زاری بکنم

تا ظن نبری که من بخود موجودم ‌ یا این ره خونخوار بخود پیمودم
این بود و نبود من ز بود او بود ٢٥٩ من خود کہ بدم کجا بدم کی بودم

من بی می ناب زیستن نتوانم ‌ بی باده کشید بار تن نتوانم
من بندهٔ آن دمم کہ ساقی گوید ٢٦٠ یک جام دگر بگیر و من نتوانم

ای گشته شب و روز بدنیا نگران ‌ اندیشه نمیکنی تو از روز گران
آخر نفسی ببین و باز آی بخود ٢٦١ کایام چگونه میکند با دگران

ای آنکه توئی خلاصهٔ کون و مکان ٢٦٢ بگذار ز دنیی وسوسهٔ سود و زیان

یک جام مے ساقی باقی بستان — تا با کر زتی از غم این بیہودہ جہان
از گردش این دائرۂ بے پایان — برخورداری و نوع مردم رادان

۳۴۳
یا با خبری تمام از نیک و بدش — یا بیخبری از خود و از کار جہان
احوال جہان بر دلم آسان میکن — و افعال بدم ز خلق پنہان میکن

۳۴۴
امروز خوشم بدار و فردا با من — آنچہ از کرم است سزد بما آن میکن
آنرا کہ وقوف است بر احوال جہان — شادی و غم و رنج بر و شد یکسان

۳۴۵
چون نیک و بد جہان بسر خواہد شد — خواہی تو بدرد باش و خواہی درمان
برخیز و مخور غم جہان گذران — خوش باش و دمے بشادمانی گذران

۳۴۶
در طبع جہان اگر وفائے بودے — نوبت بتو خود نیامدے از دگران
بشنو ز من ای زبدۂ یاران کہن — اندیشہ مکن زین فلک بیسر و بن

۳۴۷
برگوشۂ عزلت قناعت بنشین — بازیچۂ چرخ را تماشا میکن
تا بتوانی خدمت رندان میکن — بنیاد نماز و روزہ ویران میکن

۳۴۸
بشنو سخن راست ز خیام ای دوست — می میخور و رہ میزن و احسان میکن
حق جان جہانست و جہان جملہ بدن — و اصناف ملائکہ حواس این تن

۳۴۹
افلاک عناصر و موالید اعضا — توحید ہمین است و دگرہا ہمہ فن
دی شب ز سر صدق و صفای دل من — در میکدہ آن روح فزای دل من

۳۵۰
جامی بمن آورد کہ بستان و بخور — گفتم نخورم گفت برای دل من
خواہی چند پیش تو گردون گردن — کار تو بود ہمیشہ جان پروردن

۳۵۱
ہمچون منت اعتقاد باید کردن — می خوردن و اندوہ جہان ناخوردن
در عالم خاک از کران تا بکران — چندانکہ نظر کنند صاحب نظران

۳۵۲
حاصل ز جہان بیوفا چیزے نیست — الا مے لعل و عارض خوش پسران
دی بر لب جوے با نگارے موزون — من بودم و ساغر شراب گلگون

۳۵۳
در پیش نہادہ صدفے کز گہرش — نوبت زن صبح صادق آید بیرون
شرمت ناید ازین تباہی کردن — زین ترک او امر و نواہی کردن
گیرم کہ سراسر این جہان ملک تو شد — آنگہ بہ باکسی چہ خواہی کردن

زندہ دیدم نشستہ بر خشک زمین — نے کفر و نہ اسلام و نہ دنیا و نہ دین
نہ حق نہ حقیقت نہ شریعت نہ یقین — اندر دو جہان کرا بود زہرہ این

نے متفکر ند در مذہب و دین — جمعے متحیر ند در شک و یقین
ناگاہ منادی بر آید ز کمین — کاے بیخبران راہ نہ آنست نہ این

گاویست در آسمان و نامش پروین — یک گاو دگر نہفتہ در زیر زمین
چشم خردت کشاے چون اہل یقین — زیر و زبر دو گاو مشتی خر بین

گویند براے کہ کمتر خور ازین — آخر چہ عذر بر ندارے سر ازین
عذر رم رخ یار و بادہ صبح مست — انصاف بدہ چہ عذر روشن تر ازین

گر بر فلکم دست بدے چون یزدان — بر داشتمے من این فلک را زمیان
از نو فلک دگر چنان ساختمے — کازادہ بکام دل رسیدے آسان

مسکین دل دردمند دیوانۂ من — ہشیار نشد ز عشق جانانۂ من
روزے کہ شراب عاشقی میداد غم — در خون جگر زدند پیمانۂ من

در خوردن و گردیدن نکوان گردیدن — بہ زانکہ بزرق و زاہدی ورزیدن
گر عاشق و مست دوزخی خواہد بود — پس روے بہشت کس نخواہد دیدن

نتوان دل شاد را بغم فرسودن — وقت خوش خود بسنگ محنت سودن
در دہر کہ داند کہ چہ خواہد بودن — مے باید و معشوق و بکام آسودن

نیکست بنام نیک مشہور شدن — عارست ز جور چرخ رنجور شدن
خمار بوے آب انگور شدن — بہ زانکہ بزہد خویش مغرور شدن

یارب بدل اسیر من رحمت کن — بر سینۂ غم پذیر من رحمت کن
بر پاے خرابات رو من بخشاے — بر دست پیالہ گیر من رحمت کن

یارب ز قبول و رزوم باز رہان — مشغول خودت کن ز خودم باز رہان
تا ہشیارم ز نیک و بد میدانم — مستم کن و از نیک و بدم باز رہان

زین گنبد گردیدہ بد افعالی بین — وز رفتن دوستان جہان خالی بین
تا بتوانی تو یک نفس خرم باش — فردا منگر دے مطلب حالی بین

چون حاصل آدمی درین شورستان — جز خوردن غصہ نیست یا کندن جان

خرم دل آن کزین جهان زود برفت
بموجب عقل زندگانی کردن
استاد تو روزگار چابک دستست
اسرار ازل را نه تو دانی و نه من
هست از پس پرده گفتگوی من و تو
این چرخ فلک بهر هلاک من و تو
بر سبزه نشین بتا که بس دیر نماند
از تن چو برفت جان پاک من و تو
وانگه زبر اے خشت گور دگران
آن قصر که بر چرخ همی زد پهلو
دیدیم که بر کنگره اش فاخته‌ئی
از آمدن و رفتن ما سودے کو
در چنبر چرخ جسم چندین پاکان
ای آب حیات مضمر اندر لب تو
گر خون صراحی بخورم مردنیم
آنم که پدید گشتم از قدرت تو
صد سال بامتحان گنه خواهم کرد
بردار پیاله و سبو اے دلجو
کین چرخ بسے قد بتان مهرو
تا چند خریدار سے کهنه و نو
تو هیچ که پس از مرگ کجا خواهی رفت
ناکرده گناه در جهان کیست بگو
من بد کنم و تو بد مکافات دهی
یاقوت لب لعل بدخشانے کو
گویند حرام در مسلمانی شد

آسوده کسے که خود نیامد بجهان
شاید کردن و لے خدائی کردن
چندان بسرت که زندگانی کردن
وین حرف معما نه تو خوانی و نه من
چون پرده برافتد نه تو مانی و نه من
قصدے دارد بجان پاک من و تو
تا سبزه برون دمد ز خاک من و تو
خشتی دو نهند بر مغاک من و تو
در کالبدے کشند خاک من و تو
بر درگه او شهان نهادندے رو
آواز همیداد که کوکو کوکو
وز تار وجود عمر ما پودے کو
میسوزد و خاک میشود و دودے کو
مگذار که بوسد لب ساغر لب تو
او خود که بود که لب نهد بر لب تو
صد سال بشوم بناز و نعمت تو
یا جرم منست بیش یا رحمت تو
بر گرد بگرد سبزه زار و لب جو
صد بار پیاله کرد و صد بار سبو
وانگاه فروخته عالم جو جو
می پیش من آر و هر کجا خواهی رو
وانکس که گنه نکرد چون زیست بگو
پس فرق میان من و تو چیست بگو
وان راحت روح و راح ریحانی کو
[illegible]

ای نزدیکی تن و توانم همه تو — جانی و دلی ای دل و جانم همه تو
۲۰۰ تو هستی من شدی از آنی همه تو — من نیست شدم در تو از آنم همه تو

ای رفته بچوگان قضا همچون گو — چپ می خور و راست بروی هیچ مگو
۲۰۱ کانکس که ترا فگند اندر تک و پو — او داند و او داند و او داند و او

در دیدهٔ تنگ مور نورست از تو — در پای ضعیف پشه زورست از تو
۲۰۲ ذات تو سزاست مر خداوندی را — هر وصف که ناسزاست دورست از تو

گر با خردی تو حرص را بنده مشو — در پای طمع خوار و سرافگنده مشو
۲۰۳ چون آتش تیز باش چون آب روان — چون خاک بهر باد پراگنده مشو

از هر چه بجز دوست کوتاهی به — ای هم رکعت بتان از گاهی به
۲۰۴ مستی و قلندری و گمراهی به — یک جرعهٔ می ز ماه تا ماهی به

ای یار زر و زرگار باش آسوده — و اندوه زمانه کم خور از بیهوده
۲۰۵ چون کسوت عمر بر تنت چاک شود — چه کرده و چه گفته و چه آلوده

ای نیک نکرده و بدیها کرده — وانگاه بلطف حق تولا کرده
۲۰۶ بر عفو مکن تکیه که هرگز نبود — ناکرده چو کرده کرده چون ناکرده

اندازهٔ عمر بیش از شصت منه — هر جا که قدم نهی بجز مست منه
۲۰۷ زان پیش که کلهٔ سرت کوزه کنند — تو کوزه ز دوش و کاسه از دست منه

این چرخ چو طاسیست نگون افتاده — در وی همه زیرکان زبون افتاده
۲۰۸ در دوستی شیشه و ساغر نگرید — لب بر لب و در میانه خون افتاده

ای من در میخانه بسبلت رفته — ترک بد و نیک هر دو عالم گفته
۲۰۹ گر بر دو جهان چو گوی افتد بکوی — بر من بجوی چو مست باشم خفته

قطره بگریست که از بحر جدائیم همه — بحر بر قطره بخندید که ماایم همه
۲۱۰ در حقیقت دگری نیست خدائیم همه — لیک از گردش یک نقطه جدائیم همه

تا کی غم آن خورم که دارم یا نه — وین عمر بخوشدلی گذارم یا نه
۲۱۱ پر کن قدح باده که معلومم نیست — کین دم که فرو برم بر آرم یا نه

۲۱۲ تن در غم روزگار بیداد مده — جان را ز غم گذشتگان یاد مده

دل جز بشکر لب پریزاد مده / بی باده مباش و عمر بر باد مده
تا چند ز مسجد و نماز و روزه / در میکده‌ها مست شو از دریوزه
۴۱۳ خیام بخور باده که این خاک ترا / گه جام کنند و گه سبو گه کوزه
بنگر ز صبا دامن گل چاک شده / بلبل ز جمال گل طربناک شده
۴۱۴ در سایهٔ گل نشین که بسیار این گل / از خاک بر آمدست و بر خاک شده
دنیا بمراد رانده گیر آخر چه / وین نامهٔ عمر خوانده گیر آخر چه
۴۱۵ گیرم که بکام دل بمانی صد سال / صد سال دگر بمانده گیر آخر چه
دانی ز چه روی او فتادست بر آه / آزادی سرو و سوسن اندر افواه
۴۱۶ این دارد ده زبان ولیکن خاموش / وان دارد صد دست ولیکن کوتاه
ساقی می خوشگوار بر دستم نه / وان باده چو نگار بر دستم نه
۴۱۷ آن می که چو زنجیر بپیچد بهم / دیوانه و هوشیار بر دستم نه
فریاد که رفت عمر بر بیهوده / هم لقمه حرام و هم نفس آلوده
۴۱۸ فرمودهٔ ناکرده سیه رویم کرد / فریاد ز کردهای نا فرموده
من توبه کنم از همه چیز از می نه / گر جمله گزیر باشدم از وی نه
۴۱۹ اما بود آنکه من مسلمان گردم / وین ترک می مغانه گویم هی نه
مائیم بلطف تو تولا کرده / وز طاعت و معصیت تبرا کرده
۴۲۰ آنجا که عنایت تو باشد باشد / ناکرده چو کرده کرده چون ناکرده
نقشیست که بر وجود ما ریختهٔ / صد بو العجبی ز ما برانگیختهٔ
۴۲۱ من زان به ازین نمیتوانم بودن / کز بوته مرا چنین فرو ریختهٔ
ای در ره بندگیت یکسان گرومه / در هر دو جهان خدمت درگاه توبه
۴۲۲ حکمت تو ستانی و سعادت تو دهی / یا رب تو بفضل خویش بستان و بده
ای رفته و باز آمده و خم گشته / نامت ز میان مردمان گم گشته
۴۲۳ ناخن همه جمع آمده و سم گشته / ریش از پس کون آمده و دم گشته
ای بیخبر از کار جهان هیچ نهٔ / بنیاد بباد است از آن هیچ نهٔ
۴۲۴ شد حد وجود در میان دو عدم / اطراف بود تو در میان هیچ نهٔ

انگشت فریدون و کف کیخسرو — بر چرخ نهاده چه بینداری
ای گل تو بروی دلربا میمانی — وی مل تو بلعل جانفزا میمانی
ای بخت ستیزه کار هر دم با من — بیگانه تری و آشنای مانی ۴۳۸
از مطبخ دنیا تو همه دود خوری — تا چند غمان بود و نابود خوری
دنیا که بر اهل او زیانیست عظیم — گر ترک زیان کنی همه سود خوری ۴۳۹
آزار دل خلق مجو نیم شبی — تا بر نکشند یار بی نیم شبی
بر مال و جمال خویشتن تکیه مکن — کان را بشبی برند و این را بشبی ۴۴۰
اول بخودم چه آشنائی کردی — آخر ز خودم چرا جدا می کردی
چون ترک منت نبود از روز نخست — سرگشته بعالم چرا می کردی ۴۴۱
ای کاش که جای آرمیدن بودی — یا این ره را بسر رسیدن بودی
کاش از پی صد هزار سال از دل خاک — چون سبزه امید نو دمیدن بودی ۴۴۲
از رفتن عشق میکشودم فالی — ناگاه ز سوز سینه صاحب حالی
میگفت خوشا کسی که در خانهٔ او — یا ریست چو ماهی و شبی چون سالی ۴۴۳
از آمدن بهار و از رفتن دی — اوراق وجود ما همیگردد طی
ای خور مخور اندوه که گفتست حکیم — غمهای جهان چو زهر و تریاکش می ۴۴۴
ای دل پی معشوق مکن دربانی — سالوس رها کن و مکن زراقی
گر پیرو احمدی خوری جام شراب — زان حوض که مرتضاش باشد ساقی ۴۴۵
بر سنگ زدم دوش سبوی کاشی — سرمست بدم که کردم این اوباشی
با من بزبان حال میگفت سبو — من چون تو بدم تو نیز چون من باشی ۴۴۶
بگرفت مرا ملالت از زراقی — برخیز و سبک باده بیار ای ساقی
سجاده و طیلسان بی ساز گرو — تا بو که شود لاف من اندر باقی ۴۴۷
برگیر ز خود حساب اگر باخبری — کاول تو چه آوردی و آخر چه بری
گوئی نخورم باده که می باید مرد — بیباید مرد اگر خوری یا نخوری ۴۴۸
بگشای در رحم که در کشاینده توئی — بنمای رهم که ره نماینده توئی
من دست بهیچ دستگیری ندهم — کاینان همه فانی اند و پاینده توئی ۴۴۹

تا من تو هر آنچه گوئی از کین گوئی		پیوسته مرا بملحد و بیدین گوئی
من خود مقرم بر آنچه هستم لیکن	۴۵۰	انصاف بده ترا رسد کین گوئی
با درد بساز تا دوائی یابی		وز رنج منال تا شفائی یابی
میباش بوقت بینوائی شاکر	۴۵۱	تا عاقبت الامر نوائی یابی
چشمی که لعل خواهم و شیوانی		ستر رمقی باید و نصفی نانی
وانگه من و تو نشسته در ویرانی	۴۵۲	خوشتر بود از مملکت سلطانی
تا چند حدیث پنج و چار ای ساقی		مشکل چه یکی چه صد هزار ای ساقی
خاکیم همه چنگ بساز ای ساقی	۴۵۳	بادیم همه باده بیار ای ساقی
تا چند ز یاسین و برات ای ساقی		بنویس بمیخانه برات ای ساقی
روزی که برات ما بمیخانه برند	۴۵۴	آن روز به از شب برات ای ساقی
تا در تن تست استخوان و رگ و پی		از خانهٔ تقدیر منه بیرون پی
گردن منه ار خصم بود رستم زال	۴۵۵	منت مکش ار دوست بود حاتم طی
تا در هوس لعل لب و جام مئی		تا در نیائی از دف و چنگ و نئی
اینها همه حشو است خدا میداند	۴۵۶	تا ترک تعلق نکنی هیچ نئی
تن زن چو بزیر فلک بی باکی		می نوش چو در عالم آفتناکی
چون اول و آخرت بجز خاکی نیست	۴۵۷	انگار که در خاک نه بر خاکی
چون واقفی ای پسر ز هر اسراری		چندین چه خوری بیهوده تیماری
چون می نرود باختیاری کاری	۴۵۸	خوش باش درین نفس که هستی باری
چندانکه نگاه میکنم هر سوئی		از سبزه بهشت است ز کوثر جوئی
صحرا چو بهشت شد ز دوزخ گوئی	۴۵۹	بنشین ببهشت با بهشتی روئی
در شعبده خانهٔ جهان یار مجوی		بشنو ز من این حدیث و زنهار مگوی
با درد بساز و هیچ درمان مطلب	۴۶۰	با غم بنشین خرم و غمخوار مجوی
دو چیز که هست مایهٔ دانائی		بهتر ز همه حدیث ناگویائی
از خوردن هرچه هست ناخوردنی		وز صحبت هرچه هست به تنهائی
در باغ چو بر غوره ترش اول دی		شیرین ز چه گشت در تلخ چون آمد می

از چوب به تیشه گر کسی کرد رباب — وز تیشه چنگی تو گر مینا زدی
دانی که سپیده دم خروس سحری — هر لحظه چرا همیکند نوحه گری
۲۶۳ یعنی که نمودند در آئینهٔ صبح — کز عمر شبی گذشت و تو بیخبری

در ده مئے لعل لالہ گون صافی — بگشائے ز حلق شیشه خون صافی
۲۶۴ کامروز برون ز جام دل نیست مرا — یکدوست که دارد اندرون صافی

در حکمت اگر ارسطو و جمهوری — در قدرت اگرچه قیصر و فغفوری
۲۶۵ مے نوش ز جام جم که گور آخر کار — گر بهرامی که عاقبت در گوری

در کارگه کوزه گری کردم رائے — در پایهٔ چرخ دیدم استاد بپائے
۲۶۶ میکرد دلیر کوزه را دسته و سر — از کلهٔ پادشاه و از پائے گدائے

رو بیخبری گزین اگر باخبری — تا از کف ساقی ازل باده خوری
۲۶۷ تو بیخبری بیخبری کار تو نیست — هر بیخبرے را نرسد بیخبری

زان پیشتر ای صنم که در رهگذرے — خاک من و تو کوزه کنند کوزه گرے
۲۶۸ زان کوزهٔ می که نیست در وی ضررے — پر کن قدحی بخور بمن ده دگرے

زنهار کنون که میتوانی بارے — بردار ز خاطر عزیزی بارے
۲۶۹ کین مملکت حسن نماند جاوید — از دست تو هم برون رود یکبارے

زان پیش که از جام اجل مست شوی — زیر لگد حوادث پست شوی
۲۷۰ سرمایه بدست آر اینجا کانجا — سودے نکنی اگر تهی دست شوی

سازندهٔ کار مرده و زنده توئی — دارندهٔ این چرخ پراگنده توئی
۲۷۱ من گرچه بدم خواجهٔ این بنده توئی — کس را چه گنه آفریننده توئی

ای تو بادهٔ ناب اے مئے مینائی — چندان بخورم که من شیدائی
۲۷۲ گر دور مرا هر که ببیند گوید — ای خواجه شراب از کجا می آئی

شیخی بزن فاحشه گفتا مستی — هر لحظه بدام دیگرے پابستی
۲۷۳ گفتا شیخا هر آنچه گوئی هستم — اما تو چنانکه می نمائی هستی

عالم همه گر چو گوے افتد بکوے — من مست و خراب خفته بمن بجوے
۲۷۴ دوشم بخرابات گرد می کردند — خمار همیگفت که [illegible]

ای پنهان رو بسے نمائی ‌ ‌ گه در صور کون و مکان پیدائی
این جلوه گری بخویشتن بنمائی ‌ ‌ خود عین عیانی و خودی بینائی
گر روے زمین بجمله آباد کنی ‌ ‌ چندان نبود که خاطرے شاد کنی
گر بنده کنی بلطف آزادے را ‌ ‌ بهتر که هزار بنده آزاد کنی
گر شادی خویشتن بدان میدانی ‌ ‌ کاسوده دلے را بغمے بنشانی
در ماتم عقل خویش باشی همه عمر ‌ ‌ سیدا ار مصیبت که عجب نادانی
گر زانکه بدست آید ازنے دو منے ‌ ‌ می خور تو بهر محفل و هر انجمنے
کانکس که چنان کرد فراغت دارد ‌ ‌ از سبلت چون توئے و ریش چو منے
گر دست دهد ز مغز گندم نانے ‌ ‌ وز می دو منے ز گوسفندے رانے
با لاله رخے نشسته در ویرانے ‌ ‌ عیشے بود این نه حد هر سلطانے
گر شهره شوی بشهر شر الناسی ‌ ‌ گر گوشه نشین شوے همه وسواسی
به زان نبود گر خضر و الیاسی ‌ ‌ کس نشناسد ترا تو کس نشناسی
با شمع و معشوق و صبوح ای ساقی ‌ ‌ از ما نبود توبه نصوح ای ساقی
تا کے خوانی قصه نوح ای ساقی ‌ ‌ پیش آر سبک راحت روح ای ساقی
تا سوے وصال تو مرا دست رسے ‌ ‌ نه طاقت هجران تو دارم نفسے
نه زهره که با که گویم این غم بکسے ‌ ‌ مشکل کارے طرفه غمے خوش هوسے
هنگام صبوح است بنوش ای ساقی ‌ ‌ ما در کوے میفروش ای ساقی
چه جاے صلاح ست خموش ای ساقی ‌ ‌ بگذر ز حدیث و نیز نوش ای ساقی
هنگام صبوح ای صنم فرخ پے ‌ ‌ بر ساز ترانه و پیش آور مے
کافگند بخاک صد هزاران جم و کے ‌ ‌ این آمدن تیر مه و رفتن دے
یاران تا بر ستان بدر رشتی نشوی ‌ ‌ یا از در نیکوان بزشتی نشوی
مے خور که بخوردن و بنا خوردن تو ‌ ‌ گر آلت دوزخی بهشتی نشوی
ایزدان خواهم جهان دگرگون کندے ‌ ‌ تا اکنون کندے تا نگرم چون کندے
یا نام من از جریده بیرون کندے ‌ ‌ یا روزی من ز غیب افزون کندے
یا رب بگشاے بر من از رزق درے ‌ ‌ بے منت مخلوق رسان ما حضرے

از باده چنان مست ... ار مرا   کز بیخبری نباشدم ور بیسے
ای سوخته سوخته سوختنی   وے آتش دوزخ از تو افروختنی
۴۸۸ تا کی گویی که بر عمر رحمت کن   حق را تو کجا و رحمت آموختنی
خوش باش که پخته اند سودای تو دی   ایمن شده از همه تمنای تو دی
۴۸۹ تو شاد بزی که بی تقاضای تو دی   دادند قرار کار فردای تو دی
گر آمدنم بمن بدی نامدمی   ور نیز شدن بمن بدی کی شدمی
۴۹۰ به زان نبدی که اندرین عالم خاک   نه آمدمی نه شدمی نه بدمی
آدم چو صراحی بود روح چو می   قالب چو نی بود صدای دروی
۴۹۱ دانی چه بود آدم خاکی خیام   فانوس خیالی و چراغی دروی
ای چرخ همه خسیس را چیز دهی   گرمابه و آسیا و کاریز دهی
۴۹۲ آزاده بنان شب گروگان نه اند   شاید که بر اینچنین فلک تیز دهی
بر کوزه گری بزیر کردم گذری   از خاک همی نمود هر دم هنری
۴۹۳ من دیدم اگر ندید هر بیبصری   خاک پدرم در کف هر کوزه گری
چون جنس مرا خاصه بد اندر ساقی   صد فصل ز بهر لوح بر اندر ساقی
۴۹۴ چون دامنم بر سم خود باده دهید   در رحلت خود دم در گذر اندر ساقی
ای دهر بگرد ها سے خود معترفی   در خانقه جور و ستم معتکفی
۴۹۵ نعمت بخسان دهی و زحمت بکسان   زین هر دو برون نیست خری یا خرفی
پیوسته ز بهر شهوت لقمانی   این جان شریف را همی رنجانی
۴۹۶ آگاه نه ای که آفت جان تو اند   آنها که تو در آرزوی ایشانی
ای آنکه خلاصه چهار ارکانی   بشنو سخنی از عالم روحانی
۴۹۷ دیوی و ددی و ملک و انسانی   با تست هر آنچه می نمائی آنی
خواهی که پسندیده انام شوی   مقبول قبول خاصه و عام شوی
۴۹۸ اندر پی مومن و جهود و ترسا   بد گوی مباش تا نکو نام شوی
ای چرخ چه کرده ام ترا راست بگوی   پیوسته فگنده مرا در تگ و پوی
۴۹۹ نانم ندهی تا نبری آب رخم   آبم ندهی تا نبری آب از روی
چندین غم بیهوده مخور شاد بزی   واندر ره بیداد تو با داد بزی
۵۰۰ چون آخر کار این جهان نیستی است   انگار که نیستی و آزاد بزی

تمام شد

حیات فردو [illegible]

مُصنّفہ

میرزا حیرت صاحب دہلوی ایڈیٹر کرزن گزٹ و مصنف تاریخ
محمدی و حیات طیبہ وغیرہ

جس کو باخذ حقوق
کارخانہ پیسہ اخبار لاہور نے شائع کیا

دوسری مرتبہ

۱۹۰۲ء

میں

کارخانہ پیسہ اخبار کے مطبع خادم التعلیم پنجاب لاہور میں منشی عبدالعزیز کے اہتمام سے چھپی

ترقی کے کیشنے پر ڈالا جاتا اور اُس کے ذاتی جوہروں کے ابھارنے کے لئے لاتعداد
تدبیریں کی جاتیں تو ضرور ان سے لاثانی قابل نتائج برآمد ہوتے۔ فطرت کبھی بخیل
نہیں ہوئی اور جو کچھ اس نے بخشا فراخی اور کشادہ دلی سے بخشا اور ہر زمانہ ہر قوم
ہر ملک۔ اور ہر قوم میں اپنی فیض بخش برکتیں بلا امتیاز و تفریق ملت وقوم الوالعزمی
سے پھیلائیں اور ان کو کافی وسعت دی۔ جس نے قدر اور وقعت کی نگاہ سے
اس کی فیاضانہ بخشش کو دیکھا اس نے بہت کچھ برتری اور افضلیت بزرگی کے
خزائن جمع کر لئے اور جس نے اپنی غلط فہمی یا بےعلمی سے اُس بیمثال فیضان
کو دیکھا زمانہ نے اسے سخت مذلت میں پھنسا کر وحشت اور جہالت کے ہمکنار کر دیا
نیچر کی انمول بخشش اور بیمثال فضیلتیں ان عظیم الشان اور ششدر کرنے والے
منظروں میں مضمر ہیں جو شب و روز ہماری آنکھوں کے آگے ہوتے ہیں۔ جن سے
ہم نے بہت کچھ علمیت کا خزانہ جمع کیا ہے اور شب و روز کرتے ہیں۔ نظام عالم کے
بینظیر تھیٹر اور فطرت کی کل بڑی بڑی قوتوں کا کائنات کی اسٹیج پر ایکٹ کرنا مبصر
کی نگاہ میں بہت بڑا سبق ہے۔ وہ انہیں متحیر نظروں سے تکتا ہے اور منظر کا اثر
اس کے ضمیری جوہروں کی لوح پر گوناگوں نقش و نگار میں پڑتا ہے۔ اس کا ضمیر
نئے نئے خیالات کا انبار جمع کرتا ہے اور ان میں روزمرہ تغیر و تبدل کر کے ہمیشہ
نئے نتیجے پیدا کرتا ہے۔ مگر یہ خیالات یا مختلف عظیم الشان منظروں کے عکس
نئے نئے لباس اور عجیب رنگوں میں معلوم ہوتے ہیں۔ کسی خیال کا رنگ روحانی
جذبوں کا پرجوش لباس زیب کئے ہوتا ہے اور کسی خیال کی صورت ششدر اور
متحیر کرنے والی ہوتی ہے اور کوئی خیال اپنے ساتھ شادمانی اور استراحت کا
سرمایہ رکھتا ہے۔ کسی خیال میں خطرناک خوف کی صورتیں دکھائی دیتی ہیں۔ دراصل یہ مختلف
قسم کے خیالات کیا ہیں صرف فطرت کی لاثانی عظیم الشان قوتوں کا تماشگاہ عالم
میں کائنات کی اسٹیج پر خوبصورتی سے ایکٹ کرنا ہے۔ ان قوتوں کے ایکٹ کی ایک دوسرے
کے ساتھ ہم آہنگی اور باہمی ربط کا ہو بہو نقشہ یا اس کا سچا فوٹو محض نظم کی ترقی اور

اس کے ساتھ صنائع بدائع اور علم فصاحت اور بلاغت کے وضع ہونے نے کھینچکر ان کی
آنکھوں کے آگے بنا دیا۔ اور جبراً ہم سے تعریف کرا دی۔ آفتاب کا کس آب و تاب سے طلوع ہونا
اور کن حسرت بھری کرنوں اور خونی صورت سے غروب ہونا روزمرہ ایک نئی دلچسپی دیتا ہے۔ حالانکہ ہم
ہزارہا بار دیکھ چکتے ہیں لیکن اسکی قدیمی گردش اور طلوع و غروب میں وہ لطف آتا ہے جس پر یہ قول
عاید ہو "کل جدید لذیذ"۔ فطری طور پر اسکے دونوں نظارے شدنی دلچسپی دیتے ہیں۔ انکے علاوہ ایکا
عجیب تر انقلاب چاند کے روشن دائرہ کی درخشانی تابانی۔ اور اس کا تغیر و تبدل آسمانی
شامیانہ کی ستاروں کی جگمگاتی ہوئی قندیلوں سے آراستگی یہ چیزیں اور یہ خوش منظر تو
تعجب اور تحیر کے نقوش لوح دل پر کندہ کرتے ہیں۔ اور ان سے ضمیری جوہروں کی خیالی دوڑ
میں انتہا درجہ کا حیرت افزا تماشہ پیدا ہوتا ہے اور یہ سو حیرت و استعجاب کا ہی سرچشمہ آیا بتا
معلوم ہوتا ہے۔ اور القائے ربانی کے طور پر ضمیر میں یہ گذرتا ہے اور خود بخود اس کیفیت کا
جام طبیعت سے چھلکنے لگتا ہے اور از خود زبان سے یہ سرزد ہونے لگتا ہے +

اے عظیم الشان ذو الجلال علم و دانش کے روشنی پھیلانے والے
چشم دنیا۔ اس روشنی کے سرچشمہ جو میرے قدموں کی راہنمائی
کرتی ہے۔ اس گرمی کی مجمر جو مجھے ایسی حالت میں گرم کرتی ہے جب
میں سردی میں ٹھٹر جاتا ہوں۔ تیرے ہی اثر سے نیچر کا چہرہ پسندیدہ
دلکش اور تروتازہ معلوم ہوتا ہے۔ کیا تو ہر شام ماندہ ہو کر تاریکی میں آرام
لیتا ہے؟ پھر تو کہاں سے ہر صبح اپنی از سر نو تابندگی پر جلال
نور سے طلوع ہوتا ہے؟ اور تیرے جلال میں کسی قسم کی کمی نہیں
ہوتی؟ کیا تو حکمران نہیں ہے؟ کیا تو عالم کا پیدا کنندہ خالق
مطلق اس خوشنما منظر کا جو مجھے دکھائی دیتا ہے نہیں ہے؟ میں
سجدہ کرتا ہوں تیرے آگے مثل تیرے بچہ یا تیرے خادم اور
تیرے غلام کے تجھ سے مستدعی ہو کر۔ میں تجھ سے تیری
حفاظت کی استدعا کرتا ہوں اور تیری نیکی کی مداومت چاہتا ہوں مجھے

تمہارے چھوڑ دینے کی بےدردی مجھے مار ڈالے۔ یا گھپ گھاپ ڈھیاں ماتا
پھروں۔ اپنی مقررہ غیر موجودگی کے بعد واپس آ۔ واپس آ۔ دیکھ
میں کتنی دیر سے انتظار کر رہا ہوں ۔

ندیده رفتی و مردم ہماں نفس فریاد
کہ بے تو مردم و آنگہ چنیں بآسانی
کسے کہ تشنہ لب ناز رست میداند
کہ ہیچ آب حیاتست چین پیشانی

اپنے آگے سے ان غلیظ دُھندلے بادلوں کو ہٹا دے جنھوں نے
نیچر کے چہرہ کو تیرہ و تار کر رکھا ہے۔ پرند چہچہانے لگے ہیں۔ اور
ہر جانور تیرے آنے کی کتنی خوشی کر رہا ہے نہ صرف جانور بلکہ
درخت۔ سرسبز پودے اور پتہ پتہ کیسا خندہ معلوم ہوتا ہے۔
اور تیرے آنے سے چہرے کیسے بشاش نظر آتے ہیں۔ تو
ہی ہے اے نور تجلّے کے سرچشمے ہمیں نور بخشنے والا۔ ہر
شخص تیرے آنے سے اپنے اپنے کام میں لگ جاتا ہے۔
کیونکہ وہ تیرے ہی صدقہ میں روزی پیدا کرتا ہے ؎

نقاب چہرۂ روشن سے جب اٹھاتا ہے
سحر ہر ایک کو ہر کام میں لگاتا ہے
کوئی حرم کو کوئی بتکدہ کو جاتا ہے
کوئی تلاش معیشت میں جی کھپاتا ہے
جو پوچھا میں نے تو اے دل کدھر کو جاتا ہے
تو بھر کے آنسو یہ مصرعہ مجھے سناتا ہے
علی الصباح جو مردم بکار و بار روند
بلاکشان محبت بکوئے یار روند

اس سے بخوبی ظاہر ہے کہ وحشی سے وحشی قوم میں بھی نظم اور فصاحت و بلاغت
اور صنائع و بدائع کا تیج مذہبی گیتوں اور دینی عبادتوں میں بکثرت ہوتا ہے۔ مذکورۂ
بالا جملے جس میں آفتاب کو خدا مانا گیا ہے ایک سورج پرست کے ہیں جو حضرت
عیسیٰ سے تین صدی پہلے ہمالیہ کے دامن میں کھڑا ہو کر یہ عبادت کیا کرتا تھا۔
اس سے یہ بخوبی ثابت ہو گیا کہ نظم القاء ربانی اور الہام غیبی ہے کہ جو از خود طبائع میں
پیدا ہوتی ہے مگر جب وہ زبان یا قلم سے ظہور میں آتی ہے تو ضمیر اور دل کے
سانچے میں ڈھلتی ہے۔ اس کی خوشنمائی ضمیری سانچہ کی عمدگی پر موقوف ہے۔
مادہ تو وہ ہمیشہ نیچر کی طرف سے ضمیر کے سانچہ میں ڈالا جاتا ہے لیکن بدنمائی سے
ڈھلنے کا گناہ فطرت کی بخشش کا نقصان یا اُس کی خامی نہیں ہو سکتی بلکہ سانچہ کی
مکروہ صورت کا یہ سارا قصور تسلیم کیا جا سکتا ہے +

ایسی حالتوں میں کہ جب آبائی محبت کا جوش دل میں اُبلتا ہے تو اپنے اپنے عقائد
کے موافق ضرور ہر قوم اپنی معاشرت رسم و رواج۔ عادات۔ وصفات۔ قوانین۔ اور مذہب
میں دخل دیا کرتی ہے۔ اور نظم کا ایسے موقعہ پر دخل ہر متنفس کو پسندیدہ معلوم ہوتا ہے
مثلاً اب قدیم مصری اپنے خدا آئے پس نامی کی عید میں ناچتے اور اس کی صفت و ثنا
میں اپنے شعرا کی موزوں کی ہوئی نظمیں پڑھتے تھے۔ یونانیوں کے ہاں جب کوئی
مذہبی تقریب ہوتی تھی اور وہ علاوہ پرشاد چڑھانے قربانی کرنے اپنے خداؤں کے پیرول
میں اکٹھے کے ناچتے تھے گاتے تھے اور بڑے بڑے نامی یونانی شعراء کی نظمیں اپنے
دیوتاؤں کی تعریفوں میں پڑھتے تھے۔ اور پھر گویا یہی جگہ بطور مشاعرہ کے سمجھنی چاہئے۔
یہ طریقہ نظمی عبادت اور رقص و سرود کا یونانیوں نے مصریوں سے لیا تھا۔ رومتہ الکبرے
کے باشندے بھی اپنے راہ نماؤں اور مقتداؤں کے ساتھ رومتہ الکبرے کے شاہراہوں
میں ناچتے اور گاتے ہوئے نکلتے تھے۔ وہ کوئی عاشقانہ غزل نہ گاتے تھے بلکہ مذہبی گیت
بچہ بچہ نہایت جوش و خروش میں پڑھتا تھا اسرائیلی بھی اپنے ان مذہبی گیتوں اور مذہبی تقریبوں
میں ناچنے اور گانے میں بہت مشہور ہیں مریم بنت ہارون کی بہن مردنگ ہاتھ میں لے

لیتی اور گال عورتیں اسے دیکھکر مردنگ اور طبلے لیکر ناچنے اور گانے [illegible] اور
وہ انہیں کہتی۔ گاؤ اے عورتو خداوند کی توصیف اور حمد کا گیت گاؤ حضرت داؤد نے
خدا کے آگے خود ناچے اور گائے ہیں۔ حضرت داؤد خود بہت سے بھجنوں کے مصنف
ہیں جو وہ نہایت جوش میں آکر جھوم جھوم کر گایا کرتے تھے۔ برلن اور گال میں بائبل
کی نظم میں بہت بڑا حصہ مذہبی بھجنوں کا ہے۔ گوتھس بھی سال میں دو بار
مذہبی تقریبیں کیا کرتے تھے جن میں سوائے رقص و سرود اور بھجن گانے کے
کچھ بھی نہ ہوتا۔ عرب اشاعت اسلام سے پہلے بانسلی میں اپنے دستی
خداوند کی حمد لہک لہک کر گاتے تھے۔ سننے والے ناچتے تھے اور اکثر وجد انگیز
مگر نامبارک جذبوں کے ساتھ ان کے شور و غل سنائی دیتے تھے۔ مسلمان پانچوں
وقت بہت دھوم دھام سے سچے پُرجذبہ جوش وحدت میں بھری ہوئی حالت میں
اپنے خدا کی حمد ایک جماعت کے ساتھ وقت مقررہ پر کرتے ہیں اسے سجدہ کرتے
ہیں اور اس کے جلال کی صفت و ثنا کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں +

"حمد تیرے ہی لئے ہے اے عالموں کے رب۔ اے رحمت بھیجنے والے
تو ہی قیامت کے دن کا مالک ہے۔ تیرے ہی عبادت کرتا ہوں اور
تجھ ہی سے مدد چاہتا ہوں تو مجھے سیدھی راہ دکھا۔ اُن لوگوں
کی جن پر تیرا غضب نازل نہ ہوا ہو"

پانچوں وقت دنیا کے ہر ہر گوشہ سے یہی موسیقی خیز آواز نظم قرآنی کا جامہ پہنکر
بلند ہوتی ہے اور ایٹما سفر میں جا کر گونجتی ہے اور پھر عجیب دلکش خلوص نیت
اور برحق عقیدتمندی کا دل لبھانیوالا سماں معلوم ہوتا ہے +

چینی اپنی مذہبی انجمنوں کو موسیقی آلوں اور نفیس نفیس نظموں سے آراستہ
کرتے ہیں تاتارنی۔ سیموئی دس۔ لیپ لینڈرس۔ حبشی۔ کافر۔ ہوٹن ٹوٹس اپنی
عبادت بھجنوں اور ناچوں پر منحصر جانتے ہیں۔ نظم ایک مرکب ہے کہ جس پر تمام
قومیں سوار ہو کر باقی منزل مقصود پر پہنچ جاتی ہیں +

[illegible] کہ وہ انسان کے [illegible] اور
اس کے باریک خیالات اور لطیف تصورات کے اظہار کا ایک آلہ ہے جب ایک
[illegible] فہیم لائق ضمیر اعلیٰ درجہ کے جوہروں سے پیراستہ نظم کی طرف متوجہ ہوتا
اور اس شریف فن میں پورا اور قوی درک پیدا کر لیتا ہے اور اس کے بعد فضلا کی
وقعت کی نظریں اس پر پڑنے لگتی ہیں تو جو کچھ یہ شخص چاہے قوم کی اصلاح کر سکتا ہے اور
[illegible] کی حالت کے ساکن سمندر میں تموج پیدا کر سکتا ہے اور کسی سے اتنی اصلاح نہیں
ہو سکتی۔ فطری طور پر نظم کا اثر انسانی طبیعت پر نثر سے زیادہ ہوتا ہے اور ہر کان
وحشی سے وحشی اور عالم سے عالم کا منظوم سننے کو جی چاہتا ہے۔ جب اُس کے کان
میں اس کی دلچسپی کا وہ شعر پڑا اور وہ رقص کرنے لگا خواہ جسمانی رقص کرے یا روحانی۔
وجد انگیز خوشی ضرور ہی پیدا ہو جاتی ہے اور جو روحانی لذتیں حاصل ہوتی ہیں
اُن کا ذکر نہیں۔ اس سے یہ بات بخوبی معلوم ہو گئی کہ نظم میں بہت بڑی قوت
رکھی گئی ہے اور جو کچھ سحر و جادو مشہور ہے وہ نظم ہی کا ایک جزو سمجھنا چاہیے
تیز طبع اور بلند خیال شعرا نے نظام فلکی پر بھی اپنے خیالات کے وسیع ہاتھ پیر دل
کو پھیلا دیا ہے اور ہر ستارہ کی نسبت انوکھی نئی نئی باتیں قائم کی ہیں۔ ع

آندھی کی طرح آئی طبیعت جدھر آئی

جس طرف جھکے اُسے انتہا تک پہنچا دیا بلکہ اُس سے بھی آگے بڑھا دیا۔ مثلاً مشتری
ناہید یا اولی فلک۔ مریخ عاشق مزاجاں فلک کے لئے۔ زناکاری۔ مباشرت
[illegible] مشتری کو پاک قرار دیدیا۔ عطارد کیلئے چوری کو خاص کر دیا۔ اسی طرح مختلف ستارہ
کے لئے نئی نئی باتیں قرار دیں۔ کسی کو شرابی بنا دیا اور کسی کی صفت بیرحم قرار
دیدی۔ یہ خیالات اِن لوگوں کے نہ تھے کہ جو معمولی تھے۔ بلکہ یہ وہ لوگ تھے کہ
جنہیں ساحل و دانش کا حصہ ملا تھا وہ اپنی قوم کے مصلح تھے۔ انہوں نے نئے نئے
[illegible] دل کی بنیاد ڈالی تھی۔ انہوں نے نئے نئے قوانین اپنے ملک اور قوم کے
لئے منضبط کئے تھے۔ اِن کی تہذیب نے اپنے جنس پر شائستہ اور قابل [illegible]

[illegible] تھا۔ اس [illegible] ہندو [illegible] کے ساتھ ایک خاص [illegible]
اسکی وجہ یہ ہے کہ جتنے پرانے مذہب تھے سب میں یہ عقیدہ تھا کہ جو کچھ [illegible]
ظاہر ہوتی ہے وہ صرف سیاروں کی گردش کی وجہ ہے۔ اور اسی وجہ سے ہر سیارے
اور ستارے کی پرستش بھی کرنے لگے تھے۔ مثلاً وہ اپیا کو بیرحم تسلیم کرتے تھے اس
سے انھیں لازم آیا کہ وہ اس کی پرستش کریں تاکہ اُن پر وہ اپنی مہربانی رکھے اور ظلم
نہ روا نہ کرے۔ اس کو جان بوجھکر اور یہ دیکھ کر کہ اس کا اثر مخلوق پر اچھا نہیں
پڑتا بے رحم قرار دیدیا۔ تو صاف ثابت ہوگیا کہ سیاروں کا نام اور اُن کی صفت [illegible]
پہلوؤں سے قایم کی گئی تھی۔ یہ صفتیں قایم کرکے اُن کو فصیح اور بلیغ نظم میں موزون
کرلیا گیا تھا اور وہ شب و روز مذہبی انجمنوں میں پڑھی جاتی تھیں۔ جو صفتیں کہ دیوتاؤں
کی مانی جاتی ہیں یہ سب شعرا ہی کی قرار دی ہوئی ہیں۔ اُنھوں نے مذہبی بنیادوں کو
دلوں میں جما دیا اور آپ گویا اپنی قوم اور ملک کے آئینہ بن گئے جن میں سے ہم ان
کے ابنا و جنس کی معاشرت۔ عقائد۔ اور مذہبی جوش کا صاف صاف فوٹو دیکھ
سکتے ہیں۔ آؤ ایک نظر ہی سود ( ) کی نظم پر ڈالیں جس میں بالکل
دیوتاؤں کی اصل نسل کا بیان ہے۔ اس فاضل شاعر نے اپنے اس نئے مضمون میں
کس قدر طبیعت کا زور دکھایا ہے اور اپنے ابنائے جنس کے مذہبی خیالات کو
دیوتاؤں کی اصل نسل بیان کرکے کس قدر وسعت دی ہے۔ اس سے شاعر کی
قوت کی نسبت یہ کہ سکتے ہیں کہ اسے القائے ربانی ہوتا تھا کہ جس نے اس کی
زبان اور اس کی قلم میں یہ تاثیر رکھی تھی پھر ہومر ( ) کے علم الٰہی کی
طرف توجہ مبذول کرتے ہیں جس نے علم معرفت کو در حقیقت چمکا دیا اور جو بہت بڑا
معرفت دان ہوا ہے۔ اس کی کل نظم سے اس کی قوم کے خیالات اِن کے مذہبی عقائد
معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے پاک اور مطہر ہوئے خیالات کی روانی اور اعلےٰ درجے
[illegible] موزون کرنے کی لیاقت نے تمام دنیا میں اس کا ڈنکا بجا دیا
اور وہ بیشمار مقولے جو صدہا شعرا [illegible] تمام جہان میں پھیلے اور [illegible]

[illegible] کی پیاس [illegible] ہے [illegible] وقت کے [illegible]
[illegible] ان مقولوں سے اپنی روحانی خوشی کی بقا تصور کرتی ہے اور اپنے زمانے کے
لئے اسی طرح بہشتی ہے آسمان سے وجد انگیز سرود حاصل کرتی ہے۔ یہ صحیح ہے
کہ ہومر کے تمام خیالات فیکٹس پر مبنی نہیں ہوتے ہیں۔ تاہم یہ نازیبا امر ہے کہ ہم ان کے
استعارات تشبیہات اور مبالغہ کی چاشنی پر جو ان کے اشعار میں پائی جاتی ہے اعتراض
کریں اور شاعر کو لغو گو قرار دیں۔ یہ سخت بے انصافی ہے۔ ہم جب کسی نظم کو دیکھتے ہیں تو
یہ سمجھ کر نہیں دیکھتے کہ ہم تاریخ دیکھ رہے ہیں۔ یا کسی قسم صنائع بدائع کا نام نہیں ہے۔
بلکہ شاعرانہ خیالات کا ایک انبار ہے جس میں علاوہ فیکٹ ہونے کے ان کا زیور بھی ضرور
ہوگا۔ اور وہ زیور صنائع بدائع ہیں۔ تشبیہات ہیں۔ مبالغہ ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ افلاطون
نے اپنے کامن ویلتھ میں سے ہومر کو صرف اس جرم میں کیوں خارج کر دیا۔ کہ اس نے اپنے
دیوتاؤں کی ناواجب مدح و ثنا کی ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اگر ہومر نے ایسی مدح
وثنا کی ہے کہ جو انسانی مخلوق کے اخلاق کو صدمہ پہنچانیوالی ہے۔ تو بیشک افلاطون
کا اعتراض بہت ٹھیک ہے۔ اور اگر اسکی صفت و ثناء سے اخلاق اور معاشرت پر
بڑا اثر نہیں پڑتا تو افلاطون کا اعتراض ناواجب ہے۔ اگر ہم اس تصنیف کو جو ہمیں ہومر
کی دستیاب ہوئی ہے۔ ایک نکتہ چین نظر سے دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہومر کے خیالات
نہایت شائستہ اور ستھرے ہوئے ہیں۔ اور ان میں کسی قسم کی بیہودہ نمائش نہیں ہے
کہ جو انسانی مخلوق کو خراب کرے ان کے اخلاق بگاڑے اور ان کے ضمیری جذبوں کو
ناپاک کرے۔ ہم افلاطون کی جانچ اور تردید پر کوئی قطعی رائے نہیں قائم کر سکتے لیکن
اس قدر ضرور کہ سکتے ہیں کہ خواہ افلاطون کا یہ ریمارک ہومر کی نسبت صحیح ہو لیکن اس
میں شک نہیں کہ ہومر شعرائے متقدمین کا باوا آدم ہے اور اس سے کسی نے بھی
انکار نہیں کیا ہے۔ ہومر پر کیا منحصر ہے اور صدہا شعرا نے اپنے اپنے دیوتاؤں
کو خوش لباس پہنا کر خوش کیا ہے۔ ان کے طیش انگیز غصہ کی آفت خیز گرمی کا نقشہ
کھینچا ہے۔ ان کے خونریز جنگوں کا غضب انگیز ذکر کیا ہے۔ ان کے دعوال

ہو سہے کہ جن میں چھوٹی چھوٹی باتیں اور بیاہ کے معمولی واقعات بیان ہوں اور جو باتیں یا واقعات زیادہ توجہ کے قابل نہیں ہیں اُن پر بحث کی جائے اور ان کو جامۂ نظم پہنا کر عام آدمیوں کے سامنے لایا جائے اب ایسے نظم پر خیال کیا جائے کہ جو ان مذاق طرح سے علیحدہ ہے۔ ان کو شاعر کی ناپاک دماغی جذبات کا ابال کہ سکتے ہیں۔ مثلاً کسی فرضی معشوق کے خال و خط اور زلف ناگن کا رونا اور اسی کو جیتے جانا ایسی نظم نہ دنیاوی فائدہ کی جسد دیتی۔ ہاں اگر کچھ حاصل ہوتا ہے تو روحانی مضرت وہ نقصان حاصل ہوتا ہے جو روحانی زندگی کے لئے ایسا ہی خوفناک ہے جیسے سنکھیا کا پیالہ جسمانی زندگی کے لئے اردو شاعری اسی پر مبنی ہے گو اس عیب سے ایرانی شاعری بھی مبرا نہیں ہو سکتی تاہم اس میں اب بھی بڑے بڑے حکیمہ مطالب موجود ہیں۔ اور جب ہم ان کے نیچرل مضامین کو مغربی شعراء کی تصنیف سے ملاتے ہیں تو موخرالذکر شعرا کے خیالات اور اشعار کی لطافت پاکیزگی اپنے مغربی دوستوں سے بہت بڑھ جاتی ہے ٭

چنانچہ ہم نظیر المشرقی اور مغربی بعض شعرا کا باہم قریب قریب یکساں مضامین میں مقابلہ کرتے ہیں۔ اور دکھاتے ہیں کہ پر مغز مضامین لطافت کے ساتھ کس کے ہوتے ہیں ٭

شیکسپیر

"آؤ اب ہم قبروں۔ کیڑوں اور بوسیدہ ہڈیوں کی بابت ذکر کریں"
"اپنے نوشتہ پر خون کی آنسو بہائیں"
"زمین کے جگر پر اپنے غموں کے نقوش کر دیں"
"وصیوں کو منتخب کریں اور ان سے اپنی مرضی کا ذکر کریں"
"یہ بھی کچھ نہیں۔ بھلا کس کے لئے ہم وصیت کر جائیں"
"اب ہمارے خارج شدہ اجسام کو بحفاظت تمام زمین کے سپرد کر دو"
"ہمارے باقیات ہماری زمین ہماری جائداد اور تمام ہمارا مال و متاع"
"ان میں سے ہم کسی کی نسبت اپنے ہونے کا دعوے نہیں کر سکتے۔ کوئی چیز ایسی"
"نہیں ہے کہ جو ہماری بن سکے۔ سوائے ایک قبر کے جو بیشک ہماری ہے"

"اور وہ بنجر زمین کا ایک چھوٹا سا قطع ہے"
"جس میں ہمارا گوشت پوست آمیز ہوگا اور یہ قطع ہمارے جسموں کو بالکل ڈھانپ لیگا"
"خدا کے لئے آؤ ہم زمین پر بیٹھیں"
"اور شاہوں کی غمناک موتوں کی کہانیاں کہیں"
"شاہوں پر کیا کیا گزری جس کے بیان سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں ان میں سے اکثر جنگلوں میں قتل ہوئے"
"بعض ان کے دوست نما دشمنوں نے جن کو مار آستین کی طرح پرورش کیا قتل کر ڈالا - بعض شاہوں کو ان کی بیویوں نے زہر ہلاہل دیدیا اور بعض اپنی خوابگاہ میں ایسی حالت میں مارے گئے کہ جب وہ بیہوش پڑے سوتے تھے۔
"سب نے اسی مخوف تاج پر اپنی جانیں قربان کر دیں"
"ان شاہوں کے یہ فانی مقابر سامنے افسردہ رنگت میں دکھائی دیتے ہیں"
"اب انکے دربار میں درباری موت ہے اور خیالی صورت تخت پر جلوہ فرما ہوتی ہے"
"انکی حالت قابل تحقیر ہے اور ان کی جاہ و حشم کا طمطراق زیر لب خندہ کر رہا ہے"
"اس کی مخوف بادشاہت آن کی آن کے لئے چشم حسرت سے اُن کی طرف دیکھتے ہے لیکن موت کا خوف پھر اُس کو نظر میں واپس کر دیتا ہے"
اس میں شک نہیں کہ یہ خاتمی اور دنیا کی بے ثباتی کا مضمون اگر شکسپیئر کی اصلی انگریزی زبان میں پڑھا جائے تو اس ترجمہ سے ہزار حصہ زیادہ لطف آوے۔ پھر بھی الفاظ کا مفہوم کچھ نہ کچھ تو ضرور ہی اس ترجمہ سے بھی سمجھ میں آتا ہے جو اوپر درج ہوا اب اس کے مقابلہ میں ہم اُس عالی دماغ شاعر کے وہ اشعار جو اسی کے ہم مضمون ہیں کہ جس کے سوانح عمری کا یہ مقدمہ ہے درج کرتے ہیں۔ جس سے خیالات کی ہم آہنگی اور روانی کلام معلوم ہوجائیگی +

فردوسی

الا اے خریدار مغز سخن ۔۔۔ دلت برگسل زین سرای کہن

که او چون من و چو تو بسیار دید — نخواهد همی با کسی آرمید
اگر شهریاری وگر پیشکار — تو ناندر گذاری و او پایدار
چو با رنج باشی چه با تاج و تخت — ببایدت بستن بفرجام رخت
اگر ز آهنی چرخ بگدازدت — چو گشتی کهن باز ننوازدت
چو سرو دلارای گردد بخم — خروشان شود نرگسان دژم
همان چهرهٔ ارغوان زعفران — سبک مردم شاد گردد گران
بخسپد روان چونکه بالا بخفت — تو تنها بمانی زانکه همراه رفت
اگر شهریاری اگر زیردست — جز از خاک تیره نیابی نشست
کجا آن بزرگان با تاج و تخت — کجا آن سواران بیداربخت
کجا آن خردمند و کنداوران — کجا آن سرافراز جنگی سران
همه خاک دارند بالین و خشت — خنک آنکه جز تخم نیکی نکشت

فردوسی کے ان اشعار سے کسی قدر مطابقت پائی جاتی ہے مگر آگے آنے والے اشعار بہت ہی کچھ مناسبت شیکسپیئر سے رکھتے ہیں •

چو من بگذرم زین جهان فراخ — بر آورد باید مرا خوب کاخ
بجائی کزو دور باشد گذر — نپرد بر او کرگس تیز پر
سر آورده بر چرخ گردان بلند — ببالا فزون باید از ده کمند
نشسته بر آن بارگاه مرا — بزرگان و جنگی سپاه مرا
فراوان ز هر گونه افگندنی — هم از رنگ و بوی پراگندنی
بکافور تن را تو نیکو کنید — ز مشک از بر تارک افسر نهید
ز دیبای چینی و زربفت و گنج — بیارید ناکار دیده ز رنج
چو خورشید بر ما بر سم کیان — ندیدند هرگز بدی را میان
بسازید از این هم نشان تخت عاج — بیاویخته از بر عاج و تاج
همان هرچه زرین به پیش اندر است — اگر طاس و جام است اگر مجمر است

ے و زعفران جام نیست — زمشک و کافور و عنبر تہی ست
نهاده بدست چپ و دست راست — زفرمان فروزی شاه نگاشت
زخون گرد باید ہمی گاه خشک — بدو اندر آگند کافور و مشک
از آں پس برارید درگاه را — نباید که بیند کسے شاه را
دگرگوں بود کار آں بارگاه — نباید کسے نیز و مانیز راه
زفرزند و از دوده ارجمند — کسے کش زمرگ من آید گزند
بیاساید از بزم و شادی دو ماه — که این باشد آئین پس از مرگ شاه

اندونو لاثانی شعرا کے مفہوم ملانے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان کی کلام میں درد اور اثر کس درجہ کا ہے اور کیسا پُرزور کلام ہے کہ جو جبراً مخاطب کا دل اپنے اوپر مائل کر لیتا ہے اس میں شک نہیں کہ جب ہم شیکسپئر کی ناٹکی نظم پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اس میں ایسے ایسے زبردست اور مشکل نکات شاعری کے ملتے ہیں جن کو ہندی انگریزی خوانوں کی عقل نہیں سمجھتے حتے کہ یورپین پروفیسر بھی رہجاتے ہیں۔ یہ ماننا پڑے گا کہ دنیا میں اپنے رنگ میں اپنا ثانی آپ ہی تھا۔ اسی طرح فردوسی کی نظم ہے جس کی خوبیاں چند ہی عقول سمجھ سکتے ہیں گو پڑھنے ہزاروں ہیں۔ یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں نے فردوسی اور شیکسپئر کی نادانی سے مشابہت کی ہے۔ فردوسی رزمی نظم کا استاد تھا پھر دونوں کا مقابلہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ ہاں ہومر سے فردوسی کا مقابلہ ہوتا تو ٹھیک تھا لیکن ہمارا یہ خیال نہ تھا بلکہ ایک خاص مضمون میں دونوں کی طباعی کا مقابلہ کرکے دکھانا ہماری یہ غرض نہیں ہے کہ دونوں کی نظموں کا رنگ ایک ہی ہے اور یہ دونوں راہ پر قدم زن ہوئے ہیں *

ہمارے خاقانی ہند مرزا غالب نے بھی شیکسپئر کے مفہوم کو نہایت پر اثر نظم میں ادا کیا ہے جو ہدیہ ناظرین اس لئے کیا جاتا ہے تاکہ وہ مشرقی اور مغربی نظم کا اس کے خیالات اور ان کی لطافت پاکیزگی کے ساتھ مقابلہ کر سکیں *

اے دل بچشم زخم حوادث فگار شو — اے چشم از تراوش دل اشکبار شو

اے خون بدیدہ و شدگان از جگر برست — اے عادم بسینہ بود و چراغ مزار شو
اے لب بجوش نالہ جانگاہ سازدہ — اے سر بغصہ خاک سر رہگذار شو
اے خاک چرخ گرنتوان در جادر آئے — اے چرخ خاک گرنتوان شد غبار شو
اے نوبہار چون تن بسمل بخون بغلط — اے روزگار چون شب بے ماہ تار شو
اے ماہتاب روئے بسیلے کبود کن — اے آفتاب داغ دل روزگار شو
اے فتنہ از صبح دمید [illegible] — اے رستخیز وقت رسید آشکار شو

آہ اینچہ سیل بود کہ ما را ز سر گذشت
تنہا نہ سر گو کہ ز دیوار و در گذشت

اے رہ نورد [illegible] — ما بی تو [illegible] تو بی ما چگونہ
از سایہ [illegible] پوش [illegible] — اے خفتہ [illegible] تنہا چگونہ
زاں پیش کہ باتو [illegible] — در روشنہ جہاں تماشا چگونہ
با گلرخان دہر وفائی نداشتی — با حوریان آئینہ سیما چگونہ
ما بیتوان بحلقہ ماتم نشستہ ایم — از خویشتن بگو کہ تو تنہا چگونہ
بے مطرب و ندیم و غلامان خورد سال — بے باغ و قلعہ و لب دریا چگونہ
بعد از تو شاہ خیل ترا برقرار داشت — اینجا عزیز بودی آنجا چگونہ

اے بعد مرگ راتبہ خوار تو عالمے
پروانہ چراغ مزار تو عالمے

یہ ایک مسلّم امر ہے کہ جب تک شاعری کا پورا پورا مذاق نہ ہو۔ اور اس زبان میں کامل ادراک نہ ہو کبھی لطف شاعری نہیں سکتا۔ یہ ناممکن ہے کہ ہر ناخواندہ شخص اس سے دلچسپی حاصل کرنے کی کوشش کرے اور اس میں کامیاب ہو جائے۔ موجودہ ترقی کناں زمانہ میں جبکہ مغربی تعلیم کے سیلاب نے تمام ہندوستان کو ہڑپ کر لیا ہے چند ناخواندہ او علوم مشرقی سے محض نابلد جنہوں نے کسی قدر انگریزی پڑھی یا انگریزی خوانوں کی صحبت میں بیٹھے ہیں انہوں نے جوں ہی علوم مغربی کے روشن آفتاب کو دیکھا ان کی نگاہیں ایسی چکاچوند ہوئیں کہ پھر انہیں کچھ نہ

سمجھا اور لعنت ہماری مشرقی شاعری اور علوم پر انہوں نے ڈھنڈورا پیٹے اور قدما اور متقدمین کا طعن
طعن شروع کردی۔ اُردو کو اثر اگر اس وقت عربی اور سنسکرت اور فارسی کی شاعری سے
بحث ہے۔ سوال یہ ہے آیا ان واجب التعظیم زبانوں کی شاعری انگریزی شاعری سے
کتنی پیچھے ہے اور باہم کیا مناسبت ہے۔ اس امر کا فیصلہ کرنا بہت مشکل امر ہے جب تک کہ نمونہ
کُل زبانوں کے پیش کئے جاویں۔ یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ کونسی زبان کی شاعری اچھی ہے۔ چونکہ
میں اس کی بابت ایک مستقل رسالہ شاعری میں لکھ چکا ہوں اس لئے اس مطلب کے حل کرنے کے
لئے زیادہ وقت نہ لونگا۔ صرف الفنسٹن[1] صاحب کا ریمارک جو انہوں نے مشرقی
اور مغربی شاعری پر کیا ہے نقل کر دیتا ہوں۔ اس سے نکل جائیگا کہ قابل نفرت کسی زبان
کی شاعری نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں +

"جو شخص زبان سنسکرت سے واقف نہیں ہے وہ کسی طرح سے اس کی نظم
پر رائے نہیں دے سکتا۔ سنسکرت کی نظم میں موزونیت پر کمال توجہ کی گئی ہے
مگر وہ اس کے ترجمہ میں باقی نہیں رہ سکتے ہے سنسکرت میں ارکان کے
بنانے میں جو آسانی ہے اس سے زبان کی فصاحت و بلاغت بہت کچھ زیادہ
ہو جاتی ہے لیکن دوسری زبان میں جو اس سے بنائی گئی ہوتا ہے رکنوں میں
ثقالت اور بد اسلوبی ہونا لابدی امر ہے +

"ہندوؤں کی نظم کے مضمون بھی یورپ کے خیالات سے ایسے غیر ہیں کہ ان سے ہم کو
پورا لطف حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ ہماری نظم کے واقعات (یعنے استعارہ و تشبیہ
وغیرہ) سے اس کے سمجھنے میں کچھ مدد نہیں ملتی ہندوؤں کے خیالات اور فکر
کی خصوصیت سے ہم کو ان کی نظم کی مراد سمجھنی دشوار ہے اور تمام قدرتی مظہروں
اور اشیاء کے مختلف ہونے سے ہمارے اور ان کے استعاروں اور تشبیہوں
میں اختلاف ہے اس سے ہمارے پاس ان کی نازک خیالیوں کی رنگینی آدھی رہ جاتی ہے
اور اہل مشرق کیلئے جس بات سے کلام کو زینت ہوتی ہے ہمارے حق میں وہ
تاریکی اور الجھاؤ کا باعث ٹھہرتی ہے۔ مثلاً اگر یہ کہا جاوے کہ ایک معشوق کے

[1] تاریخ الفنسٹن مطبوعہ لندن ۱۸۶۶ء صفحہ ۱۶۲ و ۱۶۳۔

نگارم ابروش نازک بتے شوخ سے ستمگارے　　بتے سنگین دل و گلگون و شوخ و شنگ رعنا
یا ہم مشرقی معشوق کی یوں تعریف کریں ۔

دو ابرو کماں و دو گیسو کمند　　ببالا بکردار سرو بلند
دو برگ گلش سوسن می سرشت　　دو شمشاد عنبر فروش از بہشت
بناگوش تابندہ خورشید وار　　فرو ہشتہ زو حلقہ گوشوار
لبان از طبرزد زبان از شکر　　دہانش مکلل بدر و گہر
ستارہ نہاں کردہ زیر عقیق　　تو گفتی ز دانہ بہرہ آمد رحیق
روانش خرد بود و تن جان پاک　　تو گفتی کہ بہرہ ندارد ز خاک

جو شخص ان زبانوں کو بخوبی جانتا ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ مشرقی خیالات کی موزونیت کے لئے مشرقی زبانیں موزون ہیں اور مغربی زبانوں کو مغربی خیالات سے زیب و زینت ہوتی ہے۔ انگریزی زبان میں شاہنامہ سکندرنامہ اور دیوان حافظ یا کلیات سعدی کا ترجمہ ہو گیا ہے کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ان کی وہ اصلیت بجا رہی یا اصلی خوبی باقی رہی۔ ہاں اس قدر ضرور ہوا کہ خیالات معلوم ہو گئے اور کچھ لطف نہیں آیا۔ اسی طرح جب انگریزی شعرا کی نظموں کا اردو یا فارسی نظموں میں ترجمہ ہو گیا ہے تو کون کہہ سکتا ہے کہ اصلی زبان کی خوبی کا ایک سوال حصہ بھی قائم رہا ہوگا۔ اس پہلو سے کوئی زبان قابل نفرین ہو سکتی ہے نہ اُس کی شاعری۔ ہاں فضائل کے جانچ کرنے کے دوسرے پہلو ہیں اور وہ کشادگی خیالات اور وسعت ذہن ہے ۔

مثلاً اگر ہم اس پہلو سے اردو فارسی شاعری کی انگریزی شاعری کے آگے مذمت کریں کہ اُردو فارسی کے شاعروں نے اپنی قوت متخیلہ کی وسعت، طبیعت کی جودت۔ ذہن کی تیزی۔ اور قوت متفکرہ کی بلند پروازی کو زیادہ تر بالکل فرضی دلبر کی سیاہ زلفوں میں الجھا دیا ہے اور آگے نہیں بڑھے ہیں۔ یا امرا و رئیسوں کی بیجا تعریفوں میں اپنے کو لت پت کر دیا ہے۔ اور اُس سے آگے نہیں نکلے ہیں تو یہ مذمت کسی قدر صحیح ہے تاہم یہ ضرور دیکھنا پڑیگا آیا اردو فارسی کے کل شعرا ایسے ہی تھے جو ایسی نظم لکھنا پسند کرتے تھے۔

بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو تماشا گاہ تھیٹر کے اسٹیج پر ایکٹ کرنا پسند کرتے ہیں۔ ایسی
پیچیدہ بات کی حقیقت دریافت کرنے کے لئے بہت بڑی واقفیت درکار ہے ایسے دقیق
مسئلہ پر اٹکل پچو رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔

اگر ہم ان ہی تعداد شعرا کا تذکرہ کریں جو ایران میں گزر گئے ہیں تو تحریر کو انتہا درجہ
طول ہو جائیگا اور لطف سخن جاتا رہے گا۔ اس لئے مناسب ہے کہ چند مختصر جملوں میں اس
کی بابت بیان کر دیا جائے صرف بحث اُن شعرا سے ہے جو بہت مشہور ہیں اوّل ہم
سعدی کو پیش کرتے ہیں کہ جو واقعات کے نظم میں موزون کرنے میں اُستاد کامل تھا۔
اس کی شاعری عجیب و غریب دلکش سین اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ اس کی شاعری میں
تمدنی اور بڑے بڑے پیچیدہ مسائل حل ہو گئے ہیں۔ اس کا ایک ایک شعر لطافت اور
حکمت و معنی کا مخزن ہے۔ وہ حکیمہ سائل جو لاینحل تھے۔ اس فاضل شاعر نے انہیں نظم میں
بآسانی حل کر دیا۔ وہ جیسا واقعات بیان کرنے میں کمال رکھتا ہے اسی طرح انسانی
جذبات کو ہر پہلو اور ہر رنگ سے ظاہر کرنے میں اسے ید طولیٰ حاصل ہے۔ وہ تمام افعال
انسانی کا اس عمدہ طور سے مختلف پیرایہ میں فوٹو اُتارتا ہے کہ سخت حیرت و استعجاب معلوم
ہوتا ہے کبھی مایوس و حرمان نصیب کا افسردہ نقشہ کھینچتا ہے۔ اور کبھی شادی و فیروزمندی کا
ہو بہو خاکہ اُتارتا ہے۔ کبھی دو ایک شعروں میں علم سیاست مدن بیان کر جاتا ہے۔
کہیں معمولی اشعار میں سوشیل اور مایل کے مہذب قواعد کو بند کر دیتا ہے۔ اس نے امرا اور
شاہوں کی تعریف بھی کی تو اور پیرایہ پر تا اُن کو تنبیہ کر کے بُری باتوں سے بچائے اور عدل و انصاف
کی طرف اُن کو متوجہ کرے۔ کیا کوئی معمولی گلستاں بوستاں پڑھنے والا شخص سعدی کے کلام
کی خوبی سمجھ سکتا ہے؟ ہر گز نہیں۔ اس کے لئے علم معانی اور فصاحت و بلاغت کا بہت بڑا
علم چاہئے۔ جب کہیں اس کے کلام کی خوبی معلوم ہو سکتی ہے۔ سعدی کے بعد ہم انوری
اور خاقانی کو پیش کرتے ہیں یہ دونو شاعر بھی بڑے پائے کے ہوئے ہیں خاقانی نے
اُصول تصوف کو اپنے اشعار میں زینت دی ہے اور اپنی پند و نظم سے اس کے پیچیدہ اور
قریب قریب لاینحل مسائل کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ اور اکثر جگہ وہ کامیاب بھی ہو گیا ہے

مگر انوری کا کلام ادق اور حکیمانہ اور اس کا زیادہ تر منطقی پیرایہ ہے۔ اس لئے کہ وہ خود بہت بڑا حکیم تھا۔ ان شعرا کے رنگ بہت کچھ ملتے ہیں اور زیادہ تر قصائد میں زیادہ نام آور ہوئے ہیں۔ لیکن غزلیات میں بڑے نامور حافظ۔ سعدی۔ خاجو اور شمس تبریز ہیں۔ جن کی نظیر اس رنگ میں دنیا بھر میں نہ ملے گی۔ حافظ خود لکھتے ہیں ؎ شعر

استاد غزل سعدی پیش ہمہ کس اما ۔۔۔ دارد سخن حافظ طرز سخن خاجو

غرض یہ ہے کہ نظم۔ نے جو درحقیقت ایک رحمت اور القائے ربانی ہے اپنے عاشقوں کا ڈنکا مشرق و مغرب میں بجا دیا ہے۔ ہر شخص ان کے اشعار پڑھتا ہے اور رقص کرتا ہے میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ القائے ربانی کا نزول یکساں ہر ایک کے دماغ میں ہوتا ہے کسی قسم کا ہرگز تفاوت نہیں ہوتا صرف ضمیر کے سانچے میں ڈھلکر جس صورت میں اس کا ظہور ہوتا ہے اکثر جگہ اصل سے سخت تباین کلی پڑ جاتا ہے اور کہیں اپنی اصلی ہیئت سے القائے ربانی منصہ ظہور پر جلوہ پذیر ہوتا ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس کا ضمیر پاک اور بہتر تعصب سے خیالات سے پاک ہوتا ہے تو القائے ربانی اسی کے خیالات کا جامہ پہنکر جلوہ کرتا ہے اور اور جس کا ضمیر نفسانی بیہودہ جذبوں سے بھرا ہوا ہے وہ جب شاعری کرے گا۔ ویسے ہی مضرت وہ اشعار اس کی زبان سے نکلینگے اور لوگوں کو سوائے نقصان کے فائدہ کچھ نہیں ہوگا۔ اکثر ایسے ہیں کہ جن پر القائے ربانی کا اثر پڑتا ہے لیکن ضمیر کے تاریکی سے وہ بھی سیاہ ہو جاتا ہے۔ غرض یہ ہے کہ نظم الہام ہے جو صحیح الضمیر کو ہوتا ہے اور نئے نئے اور اعجوبہ رنگوں میں جلوہ کرتا ہے ✦

فردوسی کا نام نسب ولادت بچپن تعلیم

منصور نام۔ حکیم لقب ابو القاسم کنیت فردوسی تخلص۔ فردوسی شاداب میں سنہ ۳۲۵ھ میں پیدا ہوا۔ شاداب مواضع طوس کا ایک موضع تھا۔ فردوسی کا باپ بہت بڑا فاضل اور مذہبی پیشوا تھا اور اس کو مولانا فخر الدین احمد مولانا فخر الفردوسی کہتے

[illegible] ادباء اپنے ہمچشموں میں خاصی وقعت حاصل تھی۔ سر جارج ہملٹن کی تحریر کے بموجب یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسے سلطنت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ صرف اس کی وجہ معاش خوش اعتقادوں پر منحصر تھی۔ اس کے علم و فضل پر ہم کوئی قطعی رائے نہیں قائم کر سکتے صرف اس قدر تواریخی حالات سے کھلتا ہے کہ وہ مذہبی گروہ کا بڑا رکن تھا۔ سُنا جاتا ہے کہ بعض وجوہ سے اس نے اپنے کو شیعہ بنا لیا تھا ورنہ درحقیقت وہ بڑا سُنی المذہب تھا یہ اپنے کو سید بتاتا تھا اور اس کا دعویٰ تھا کہ میں حضرت زین العابدین کی اولاد میں سے ہوں۔ اس کی تصدیق کے لئے ہمارے پاس شہادتیں موجود نہیں ہیں صرف ہم سر جارج ہملٹن کی تحریر پر تکیہ کر کے اس کو صحیح مان لیتے ہیں۔ فردوسی کے پیدا ہونے پر اس کے باپ فخرالدین نے ایک خواب دیکھا جو درج کیا جاتا ہے "فخرالدین نے خواب میں دیکھا کہ منصور ایک بلند کوٹھے پر چڑھ گیا اور قبلہ رو ہو کر ایک نعرہ مارا اور سجدہ کیا۔ چاروں طرف سے مرحبا و صد مرحبا کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔" یہ خواب دیکھ کر اس کی آنکھ کھل گئی اور وہ شیخ نجیب الدین معبّر کے پاس گیا۔ یہ شخص تعبیر کہنے میں بہت مشہور تھا اور اکثر دور دور سے لوگ دریافت کرنے کے لئے اس کے پاس چلے آتے تھے۔

فخرالدین نے جب شیخ سے اپنی خواب کی کیفیت بیان کی تو اس نے یہ تعبیر دی "وہ آواز جو قبلہ رو سجدہ پر تیرے بیٹے منصور نے لگائی تھی وہ آوازِ آوازۂ سخن ہے جو بڑی عمر میں اسے حاصل ہوگا اور ان آوازوں سے جو اس کی آواز لگانے سے چاروں طرف سے بلند ہوئیں مطلب صرف یہ ہے کہ چاروں طرف اسی کے سخن کا ڈنکا بج جائیگا اور ہر شخص اس کو تسلیم کریگا۔ یہ خوش آیندہ پیشین گوئی جو تعبیر کے لباس میں جلوہ پذیر ہوئی تھی عجیب و غریب افسون اپنے میں رکھتی تھی خصوصاً ایک باپ کے لئے تو یہ روحانی شادمانی تھی جو سُنتے ہی خوش ہو گیا اور اسے اس قدر شادمانی ہوئی کہ اپنے اسی وجد انگیز شادی میں ایک ٹیکا اور ایک قبا اور کچھ زر نقد شیخ نجیب الدین کو دیکر یہ کہا "خدا کرے آپکی یہ تعبیر صحیح نکلے اور میرا بچہ ایسی ہی شہرت علمی دنیا میں حاصل کرے"۔ فخرالدین کی علمی اعلیٰ ظرف کا اندازہ یہاں سے بخوبی

ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنے بیٹے کے عالم ہونے پر اتنی خوشی ظاہر کی۔ یہ چاہا کہ وہ دولتمند ہو اور علمیت پر اس کی دولتمندی غالب ہو *

سر جارج ہملٹن ہی نے تحریر کیا ہے کہ فردوسی کی ماں نے جو بہت دیر سے منتظر بیٹھی ہوئی تھی فخرالدین اپنے خاوند سے دریافت کیا کہ تعبیر کیا بتائی۔ اس نے جو کچھ شیخ معبّر نے بتائی تھی بیان کر دی ماں نے گھبرا کر دریافت کیا کہ دولتمندی کی بابت بھی کچھ بیان کیا فخرالدین نے ترش ہو کر جواب دیا الحمد اللہ کہ میرا بیٹا دولتمند نہیں بلکہ عالم بنیگا۔ اس زمانہ میں تعلیم و تعلم کا سلسلہ شاداب میں بخوبی جاری تھا۔ اکثر شرفائے وہ فخرالدین کے پاس مذہبی علوم پڑھنے کے لئے آیا کرتے تھے۔ فردوسی کا بچپن نہایت خوبصورت اور لطیف تھا۔ یہ جب تین ساڑھے تین برس کا تھا اپنے باپ کے پاس طلبہ کا سبق سننے کے لئے بیٹھ جاتا تھا اور کئی کئی گھنٹے بغیر روئے خاموش بیٹھا ہوا سنتا اور ہوں ہاں نہ کرتا۔ جب زیادہ دیر ہوتی تو وہیں اونگھنے لگتا اور باپ اپنی گود میں سلا رکھتا۔ گو فردوسی کی عمر ابھی اتنی بھی نہ ہوئی تھی کہ وہ صاف باتیں کر سکتا کیونکہ بموجب تحقیق سر جارج ہملٹن کے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فردوسی کی زبان ساڑھے پانچ برس میں بخوبی کھل گئی تھی۔ اس سے پہلے وہ میٹھی میٹھی باتیں کرتا تھا۔ لیکن بہت ہی ٹوٹی پھوٹی۔ بچپن میں اس نے اپنی ماں کو کبھی نہیں ستایا۔ رونا جانتا ہی نہ تھا کسی چیز پر ضد نہیں کی اور نہ کسی کی دی ہوئی چیز بغیر کئی انکار کے لی۔ عموماً جتنی باتیں کہ عام بچوں کو خوش کرتی ہیں فردوسی کے لئے وہ ہی باعث نفرت تھیں۔ وہ خود نہ سمجھتا تھا کہ کیا پڑھا جا رہا ہے لیکن یہ نظارہ اس کے دل بہلانے کے لئے کافی تھا۔ دوسرا شوق جو فردوسی کو چار پانچ برس کی عمر سے ہو گیا تھا پانی کے پاس بیٹھنا تھا۔ خصوصاً آب رواں اس کی روانی کے لئے دگنی شادمانی کا باعث ہوتا تھا وہ اکثر چلتے چلتے پانی کے چشموں۔ تالابوں کو انگلی سے بتانے لگتا۔ دیکھو وہ پانی دکھائی دیتا ہے اور وہ نہر بہہ رہی ہے *

فخرالدین کی آنکھیں اپنے ہونہار بچہ کی طرف اٹھ رہی تھیں وہ اس کی طرز ادا کو بغور ملاحظہ کرتا اور اس کی دلچسپی کو دیکھتا۔ اسے خوب معلوم تھا کہ یہ طبیعت ضرور اپنے

[illegible] بھی ہے سمجھا جاتا تھا کہ [illegible] سے دلچسپی اس کی طبیعت کی
[illegible] ہے ۔ فخرالدین کے پاس کافی سرمایہ تھا کہ وہ اپنے بچے کو باقاعدہ تعلیم دے
اور اسے اپنی زندگی میں فاضل بنادے ۔ شاداب میں باقاعدہ کوئی سکول نہ تھا کہ جہاں بچہ
بہت شائستہ تعلیم پاتا اور اپنے طبعی جوہروں کی جلا کرتا اور انہیں چمکاتا اس لئے فخرالدین
نے یہی مناسب جانا کہ پہلے اسے خود ہی تعلیم دے اور شفقت سے پڑھائے لیکن فخرالدین کے
اس خیال نے درجہ تکمیل حاصل نہ کیا اور اسے مجبوراً ایک دوسرا استاد فردوسی کے لئے
مقرر کرنا پڑا ۔ فردوسی نے جس شخص کے آگے کہ پہلے زانوئے شاگردی تہ کیا ہے
اس کا نام علامہ قطب الدین تھا جو دمشق کا رہنے والا تھا اور اب چند سال سے شاداب
میں اپنی زندگی کے دن زمانہ سے بیداغ ہو کر پورے کر رہا تھا ۔ یہ دراصل شیعہ تھا لیکن
اپنے کو سُنّی ظاہر کرتا تھا اور صرف مذہبی وجہ سے یہ اپنے کنبہ سے لڑ جھگڑ کر طوس چلا
آیا تھا اور مواضع طوس میں اسے شاداب فرحت بخش معلوم ہوا ۔ قطب الدین پوری تحصیل
کا شخص تھا اور دراصل وہ بڑی بڑی کتابیں پڑھاتا تھا ۔ لیکن فخرالدین کے ساتھ ایک
خاص تعلق ہونے کی وجہ سے اس نے فردوسی کو ابتدائی تعلیم دینا منظور کر لیا ۔ اور اس کو
پڑھانا شروع کیا ۔ گو وہ ذہن معمولی بچوں کا سا تھا لیکن اس کا حافظہ بہت بڑا تھا اور وہ
جو کچھ پڑھتا اسے حفظ یاد کر لیتا تھا ۔ معمولی ابتدائی تعلیم کے بعد اس نے قرآن شریف پڑھا
اور ڈیڑھ برس میں اسے ختم کر لیا ۔ بعد ازاں اس نے قرآن شریف کو حفظ کرنا چاہا کیونکہ
نظم قرآنی اسے بہت بھا گئی ۔ وہ اس کی فصاحت و بلاغت پر دل سے مٹا ہوا تھا لیکن
وا امید اس کی بر نہ آئی اور وہ بہت جلد ناکام ہو کر بیٹھ رہا اور اس سے خواہ مخواہ اسے
دست بردار ہونا پڑا ۔ گو عظیم سمرقندی نے یہ تحریر کیا ہے کہ اس نے نصف قرآن حفظ
یاد کر لیا ۔ لیکن اس نے بھی معقول وجہ اس کی کوئی نہیں لکھی کہ فردوسی نے قرآن مجید سارا
کیوں نہیں حفظ کیا ۔ ہم تاریخی واقعات پر خیالی رائے قائم نہیں کر سکتے اس لئے اس کی
بابت کوئی بحث نہ کریں گے ۔ واقعات سے اس قدر ظاہر ہوتا ہے کہ جب اس کی عمر
[illegible] برس کی تھی وہ خواجہ نصیرالدین کے پاس ریاضی تحصیل کرنے گیا ۔ پہلے اس نے

اقلیدس بھی اور تھوڑے ہی دنوں میں حصہ خوبی اقلیدس کو سمجھ لیا اور اس کی تکمیل کرنے لگا۔ پانچویں چھٹے مقالہ کی شکلوں نے اسی مجبور کیا کہ وہ کچھ حساب بھی سیکھے اور اس میں بھی دستگاہ پیدا کرے چنانچہ اس نے حساب میں بھی جلد ملکہ پیدا کر لیا۔ یہ نہیں کھلتا کہ نصیر الدین سے فردوسی نے کس شہر میں جا کر ریاضی تحصیل کی ان واقعات سے اس قدر تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاداب میں نہ رہتا تھا لیکن اور کچھ نہیں پایا جاتا۔ نہ کسی خاص مقام کا پتہ چلتا ہے سر جارج ہملٹن بھی اس ذکر کو صاف اڑا گئے ہیں کہ فردوسی نے دوبارہ کس شہر میں نزاولئے شاگردی تہ کیا۔ صرف اتنا لکھا ہے۔ کہ وہ نصیر الدین کے پاس ریاضی پڑھنے گیا ۔

ریاضی کی بعد اس نے اپنے باپ کے کہنے سے دوبارہ مذہبی دنیا میں قدم رکھا اور تحصیل علوم دین شروع کی۔ مختلف واقعات سے جو اس کی نسبت بیان ہوئے ہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بہت جلد ہی مذہبی علوم میں دستگاہ پیدا کر لی اور آپ اس نے چند کتابیں مذہب شیعی میں تصنیف بھی کیں۔ ساتھ ہی اس کے جوں جوں عمر بڑھتی گئی فردوسی کو شعر شاعری کا شوق ہوتا گیا اور آخر اس نے اپنی زندگی ہی میں وہ نام پیدا کیا کہ بڑے بڑے سلاطین اس کے قدردان ہو گئے "

ہمیں افسوس ہے کہ کسی نے فردوسی کے پورے پورے حالات کا تذکرہ نہیں کیا اور اس کے باقاعدہ سوانح عمری لکھے۔ جن لوگوں نے کہیں کہیں شعراء کے تذکرہ میں اس کا ذکر کیا ہے اُنھوں نے اس کی نسبت ایسے ناممکن الوقوع حکائتیں بیان کی ہیں کہ جنہیں عقل سلیم کبھی طرح تسلیم نہیں کر سکتی۔ ان نقلی حکائیتوں اور مختلف تذکروں سے ہم اس قدر مطلب نکال سکتے ہیں کہ فردوسی نے شاعری میں مشہور ہونے سے پہلے مذہبی علوم میں دستگاہ پیدا کر لی تھی اور بعض فقہی مسائل کی کتابیں تصنیف کر چکا تھا۔ ہم ان واقعات کا تعقب نہیں کریں گے جو بہت کم مشہور ہیں۔ اور معمولی مصنفوں کی قلم سے نکلی ہیں صرف چند مشہور مشہور باتوں پر بحث کرتے ہیں جو زیادہ دلچسپی کے قابل ہیں ۔ جب فردوسی نے اپنا رہجان نظم کی طرف دیکھا تو اس نے اور کل باتوں کو چھوڑ

[illegible] تاریخ نظم میں [illegible]
لیکن اس کی تکمیل کے لئے کسی شاہ کی سرپرستی [illegible]
[illegible] بھی ضروری تھا +

شاہنامہ کے تصنیف کی تحریک

ایک دن فردوسی اپنے ایک دوست کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور ادھر اُدھر کی باتوں سے اپنا خوش وقت گزار رہا تھا۔ باتوں باتوں میں یہ ذکر آیا کہ اگر ایرانی گزشتہ شاہوں کی تاریخ نظم میں لکھی جائے تو نہایت مقبول ہوگی۔ اے فردوسی اگر تو اس عظیم الشان کام کی تکمیل اپنے ذمے لے تو تجھے شایاں ہے۔ تیری تیز طبعی سے مجھے امید ہے کہ تو بہت کچھ نظم میں نئے واقعات کو تازگی بخشیگا اور کیا عجب ہے کہ اس کی مقبولیت تجھے آسمان عزت پر پہنچا دے +

فردوسی نے جواب دیا اے محمد لشکری یہ خیال کئی مہینے سے میرے دل میں آرہا ہے لیکن مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس سرمایہ تاریخ نہیں ہے کہ میں ان واقعات کو نظم میں لاؤں۔ اس نے نہایت سرگرمی سے جواب دیا کہ میرے پاس تاریخ ایران موجود ہے آپ مستقل طور سے اس کام کو شروع کریں۔ فردوسی یہ سن کر بہت خوش ہوا اور اپنے دوست محمد لشکری سے کتاب لیکے شیخ محمد معشوق طوسی علیہ الرحمۃ کے پاس گیا جو اس زمانہ میں بہت بڑے صاحب کشف اور بزرگان دین میں سے تھے۔ سر جان سر جی جلش لکھتا ہے کہ فردوسی اس شیخ کا مرید بھی تھا۔ غرض وہ کتاب شیخ کے پاس لے گیا اور سامنے پیش کی اور عرض کیا کہ میں یہ چاہتا ہوں اور میرا یہ ارادہ ہے آپ مجھے برکت دیں اور میرے لئے دعا کریں کہ یہ کام انجام پذیر ہو جائے +

بزرگ شیخ نے فردوسی کے لئے دعا کی اور ایک رقعہ والی طوس ابو منصور کو لکھ دیا جو اُن کے معتقدین میں سے تھا۔ اس رقعہ میں فردوسی کی سفارش لکھی ہوئی تھی۔ پھر ارشاد ہوا کہ تم حاکم طوس کے پاس یہ رقعہ لیجاؤ وہ ہر امر میں سے اپنا امداد و ظاہر کرو۔

دو گیتی که هیچ وفادار نیست | همه رنج را کس خریدار نیست

زمانہ سرائے پر از جنگ بود | بجویندگاں بر جہاں تنگ بود

بدیں گونہ یک چند بگذاشتم | سخن را نہفتہ ہمیداشتم

ندیدم کسے کش سزاوار بود | بگفتار ایں مر مرا یار بود

ز نیکو سخن بہ چہ اندر جہاں | بر و آفریں از کہان و مہاں

اگر نبودے سخن از خدائے | نبی کے بُدے نزد ما رہنمائے

بشہرم یکے مہرباں دوست بود | تو گفتی کہ با من بیک پوست بود

مرا گفت خوب آمد ایں رائے تو | بہ نیکی خرامد مگر پائے تو

نوشتہ من ایں نامہ پہلوی | بہ پیش تو آرم مگر نغنوی

کشادہ زبان و جوانیت ہست | سخن گفتن پہلوانیت ہست

شو ایں نامہ خسروی باز گوے | بدیں جوئے نزد مہاں آبروے

چو آورد ایں نامہ نزدیک من | برافروخت ایں جان تاریک من

مختصر طور پر فردوسی نے محمد لشکری کا ذکر کرکے تاریخ ایران کا ذکر کیا ہے کہ جب میرے پاس وہ نامہ آیا تو میرے تاریک جان روشن ہوئی۔ یعنی میں مغموم تھا تو خوش ہوگیا۔ اور مارے خوشی کے کھل گیا۔ کتاب حاصل ہونے کے بعد جب ابومنصور کی درگاہ میں پہنچا ہے تو اس کو اس طرح بیان کرتا ہے۔ پہلے فاضل شاعر اس کی تعریف کرتا ہے۔

بدیں نامہ چوں دست کردم دراز | یکے مہترے بود گردن فراز

جواں بود از گوہر پہلواں | خردمند و بیدار و روشن رواں

خداوند رائے خداوند شرم | سخن گفتن خوب آوائے نرم

مرا گفت کز من چہ آید ہمے | کہ جانت سخن برگراید ہمے

بچیزے کہ باشد مرا دسترس | بکوشم نیازت نیارم بکس

ہمیداشتم چوں یکے تازہ سیب | کہ از باد نامد بمن بر نہیب

بجیوں رسیدم زخاک نژند	ازاں نیک دل نامور ارجمند
بجشش جہاں خاک ہم سیم زر	کریمے بدو یافتہ زیب و فر
سراسر جہاں پیش او خوار بود	جوانمرد بود و وفادار بود

فاضل شاعر نے کس عمدہ پیرایے میں اپنے آقائے نامدار گورنر طوس ابو المنصور کی تعریف کی ہے اس سے یہ پایا جاتا ہے کہ خود ابو المنصور نے فاضل شاعر سے تحریک کی اور کہا حتے الوسع میں تیری مدد دینے میں کوشش کرونگا۔ مگر افسوس زمانہ نے فردوسی کو زیادہ خوش نہ رہنے دیا اور ابو المنصور آخر کار انتقال کر گیا۔ اس کی جانکاہ وفات پر ہمارا فاضل شاعر یوں قلم فرسائی کر کے اپنے دردناک خیالات کا اظہار کرتا ہے *

چناں نامور گم شد از انجمن	چو از باد سرو سہی در چمن
دریغ آں کمر بند آں گردگاہ	دریغ آں کئی برز بالائے شاہ
نہ زو زندہ بینم نہ مردہ نشاں	بدست نہنگاں مردم کشاں
گرفتار دل زو شدہ نا امید	رواں لرز لرزاں بکردار بید
ستم باد بر جاں آں شاہ و سال	کجا بر تن شاہ شد بد سگال
یکے پند آں شاہ یاد آورم	ز کسرے رواں سوئے داد آورم
مرا گفت کایں نامۂ شہریار	اگر گفتہ آید بشاہاں سپار
دل من بگفتار او رام شد	روانم بدیں شاد و پدرام شد

ابو المنصور مرتے وقت یہ وصیت کر گیا تھا کہ جب تک تو شاہ گردن فراز کو اپنا سرپرست نہ بنا دیگا یہ محض ناممکن ہے کہ تو اپنے ارادہ پر کامیاب ہو چنانچہ فردوسی نے یہی کیا اور اسی حیلہ سے محمود کے دربار میں پہنچا *

جب منصور کی وفات کی خبر دار الخلافہ میں پہنچی تو محمود نے ارسلاں خاں کو گورنر طوس بنا کر روانہ کیا۔ جب فردوسی ارسلاں خاں کے پاس پہنچا اور اس سے اپنی سرگزشت بیان کی تو وہ بھی بہت خوش ہوا اور اس نے قدر افزائی فرمائی۔

ابو المنصور کی سی قدر شناسی اس میں نہ تھی۔ غرض فردوسی نے یہی غنیمت جانی اور
ایک عرضی چند روز کے بعد ارسلاں خاں کی معرفت دربار محمود میں روانہ کی۔ محمود جیسا
کہ عموماً تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے علم و ہنر کا دلدادہ تھا وہ فردوسی کی درخواست
دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اس نے ارسلاں خاں کو حکم بھیجا کہ فردوسی کو بہت جلد
روانہ کرو چنانچہ اس نے فردوسی کو غزنی روانہ کر دیا ۔

مگر عظیم سمرقندی نے فردوسی کے غزنی روانہ ہونے کو یوں لکھا ہے۔ کہ
جب ارسلاں خاں گورنر طوس ہو کر آیا تو فردوسی کئی دن کے بعد اس کی خدمت
میں حاضر ہوا۔ اول تو اسے یہ ناگوار معلوم ہوا دوسرے فردوسی کا کوئی قصیدہ اس
کی تعریف میں نہ پیش کرنے نے اور بھی اس کی مشتعل غصہ کی آگ کو بھڑکایا۔ اس
نے فردوسی کو عین دربار میں بہت سخت و سست کہا اور یہ الفاظ زبان پر لایا کہ
شاہوں کے داب سے بالکل واقف نہیں ہے اور تو نہیں جانتا کہ کیونکر خدمت
عالی میں حاضر ہوا کرتے ہیں۔ تجھے اپنے علم کا بہت زعم ہے اور یہ زعم تجھے ایک دن
ذلیل و خوار کریگا۔ تو میرے دربار سے چلا جا اور پھر کبھی مجھے منہ نہ دکھائیو۔ یہ بیجا
باتیں سن کر فردوسی عرق عرق ہو گیا اور اس قدر ذلیل ہوا کہ جس کا ٹھکانا نہیں۔ اور
خاموشانہ نیچے نگاہیں کئے ہوئے واپس چلا آیا۔ ارسلاں خاں نے اس تذلیل پر
ہی قناعت نہ کی بلکہ اس نے تنخواہ بھی بند کر دی اور طرح طرح سے ستانا شروع کیا ۔
ناچار فردوسی دق ہو گیا اور ایک شب ارسلاں خان کے مظالم سے تنگ آکر طوس
کو چھوڑا اور غزنی کی راہ لی۔ عظیم سمرقندی کی اس تحریر پر ہم کچھ رد و قدح نہیں معلوم
کر سکتے بلکہ اس کے مقابلہ میں اس قدر لکھ سکتے ہیں کہ یہ بات زیادہ قرین قیاس
نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ ابو المنصور کے مرنے کے بعد جب ارسلاں خاں آیا ہے۔
تو محمود کی پہلی ہدایت یہ تھی کہ فردوسی کو ہمارے دربار میں روانہ کر دینا۔ اس لئے
ممکن ہے کہ عظیم سمرقندی کی تحقیق غلط ہو۔ غرض فردوسی غزنی کی طرف روانہ

ہوگیا ۔

فردوسی کا دربار محمود میں پہنچنا

طوس سے فردوسی ہرات پہنچا- دربار شاہی میں فردوسی کی آمد آمد کی خبریں گرم ہوئیں بدیع الدین پیرمنشی دربار نے رودکی اور عنصری سے کہا تمہیں کچھ خبر بھی ہے۔ کہ فردوسی آرہا ہے۔ وہ ہکا بکا اس کی طرف دیکھ کر یہ کہنے لگے کہ ہمیں اس کی کچھ اطلاع نہیں بدیع الدین نے کہا کہ حضرت ظل سبحانی سلطان محمود کی طلب پر وہ یہاں آرہا ہے یہ سنتے ہی عنصری اور رودکی کے چار عنصر ولن میں خلل عظیم برپا ہوگیا اور وہ فردوسی کا نام سن کر بہت گھبرائے تو گو انہوں نے اب تک فردوسی کے اشعار نہ دیکھے تھے تاہم انہوں نے اس کی شہرت اور تعریف بہت سنی تھی اس لئے وہ دم بخود تھے کہ کیا کریں۔ بدیع الدین نے ان کی پیشانی تاڑ لی اور یہ گویا ہوا۔ حضرت سلطان المعظم کو یہ یقین ہو گیا ہے کہ میرے ارادہ کی تکمیل میرے درباری شعرا میں سے کوئی بھی نہیں کر سکتا اگر کچھ کر سکیگا تو فردوسی کر سکیگا اور حقیقت میں وہ بڑے پلہ کا شاعر ہے۔ عنصری اور رودکی نے کہا کہ یہی موقع مدد کرنے کا ہے کوئی ایسی تدبیر کرو کہ وہ واپس چلا جائے اور پھر رُخ نہ کرے تاکہ ہماری وقعت میں کچھ فرق نہ آجائے تاہم بڑی دیر تک مشورہ ہو کر یہ امر طے پایا کہ عنصری اور رودکی اپنے طرف سے خط لکھیں اور اسے اس بات میں فریب دیں کہ سلطان محمود کو شاعری سے کچھ شوق نہیں ہے۔ ہم جتنے شعرا کہ دربار میں حاضر رہتے ہیں ہم سے بھی کبھی یہ ارشاد نہیں ہوتا کہ اپنی اپنی تصنیف کے اشعار سناؤ۔ ہم محض بیکار یہاں پڑے ہوئے ہیں۔ بلکہ عنقریب تم سن لوگے کہ ہم یہاں سے چلے جائینگے۔ اس لئے دوستانہ تمہیں لکھتے ہیں کہ تم ادھر کا قصد نہ کرنا اور کسی ایسے سلطان کی سرپرستی ڈھونڈھنا کہ جو قدردان سخن ہو۔ یوں ہی کسی نے تمہارا ذکر کر دیا تھا تو حضرت سلطان المعظم کی زبان سے یہ نکل گیا تھا کہ اچھا اسے بلا لو مگر پھر حضور ظل سبحانی اور خداوند زمین و زمان نے تمہارا ذکر

بھی نہیں کیا چونکہ تم ہمارے ہم پیشہ ہو اس لئے ہمیں تم سے محبت ہے ہم یہ ہرگز
نہ چاہیں گے کہ ایسا زبردست فاضل شاعر دربار سلطانی میں آکر خفیف کیا جائے اس لئے
ہم نے یہ خط دوستانہ بھیجا ہے اور اپنی طرف سے تمام درباری رنگ صاف صاف
دکھا دیا ہے۔ آیندہ تمہیں اختیار ہے اگر اس طرف آنے کی جرات کرو تو اپنی جان
پر رحم کھا کر واپس چلے جاؤ۔ فقط۔ راقم عنصری و رودکی و عسجدی و فرخی وغیرہ۔ بولے
ہی یہ امر طے پایا اور مشورہ ہوا فوراً اسی مضمون کا خط فردوسی کو لکھا گیا۔ یہ بیچارہ
شخص بے خبر ہرات میں قیام پذیر تھا جوں ہی اس نے یہ افسردہ کرنے والا خط دیکھا
وہ سناٹے میں آگیا۔ وہ امنگیں اور امیدوں کے جوش جو اس کی مزاج میں موجزن
ہو رہے تھے سرد پڑ گئے۔ اس نے کبھی یہ مناسب نہ جانا کہ ایسے نافہم شاعر کے
دربار میں جا کر اپنی عزت ریزی کراؤں۔ اس کی خوش آیندہ آرزوں پر پانی پھر
گیا اور وہ سخت مایوسی کی حالت میں گم صم رہ گیا۔ اس کے وہ دلی اور ضمیری جذبے
جو اپنی ترقی اور عزت افزائی کے لئے طبیعت میں جوش مار رہے تھے ناپید ہو کر افسردہ
حیرانیوں اور ٹھٹھری ہوئی مایوسیوں سے بدل گئے۔ جس کی غمناک حالت کا اصلی فوٹو
نہیں اتر سکتا۔ اسی شکست دلی اور بجھے ہوئے دماغ سے اس نے یہ مصمم ارادہ
کر لیا کہ یہاں سے پھر چلو۔ مگر پیشتر اس کے کہ وہ اپنی جائے مقصود سوچ لیتا اسے
ہرات کو چھوڑ دینا امر محال تھا۔ اسی شش و پنج میں اسے کئی دن گزر گئے۔ نہ پا
رفتن نہ روئے ماندن کا مضمون ہوا۔ اس نے سوچا کہ گورنمنٹ ہرات کے ہاں کوئی
ملازمت حاصل کروں۔ پھر اسے یہ خیال آیا کہ جب سلطان خود شعر اشعار اور علمی اہل
سے دلچسپی نہیں رکھتا۔ تو گورنر ہرات کیوں میری قدر کرنے لگا ٭

بیچارہ سخت پریشانی کی حالت میں اپنے دوست سید ابو الحسن کے ہاں ٹھہرا۔
اس اثنا میں دربار غزنی میں نیا واقعہ پیش آیا جس کی کبھی امید نہ ہو سکتی تھی۔ یعنے
بدیع الدین میر منشی دربار اور عسجدی۔ عنصری۔ رودکی میں بگڑ گئی۔ یہاں تک باہمی
رنجش ہوئی کہ بدیع الدین نے فوراً ایک خط ہرات میں فردوسی کو لکھا کہ جو کچھ تمہیں بارگ

شعرا نے لکھا تھا وہ سوائے دھوکہ دینے والے نوٹ کے اور کچھ قیمت نہیں رکھتا
اس کو تم محض لغو سمجھو اور بہت جلد دربار غزنی کی طرف روانہ ہو جاؤ کیونکہ حضرت
سلطان المعظم روزمرہ دریافت فرماتے ہیں کہ ابھی فردوسی نہیں آیا۔ یہ رقعہ بدیع الدین
کا دیکھتے ہی فردوسی کھل گیا اور سیدھا غزنی روانہ ہوا۔ مگر غزنی روانہ ہونے سے
پہلے فردوسی نے بدیع الدین کے رقعہ کا جواب لکھا اور جو سوار لایا تھا اسی کو دیدیا۔
پہلے بہت کچھ شکریہ ادا کیا گیا ہے پھر اپنے شوق اور قوت شاعری کا مجملاً بیان ہے
بعدازاں رقعہ میں یہ اشعار تحریر کئے ہیں*

بگوش از سروشم بسے مژدہاست | دلم گنج گوہر زبان اژدہاست
چہ سنجد بمیزان من عنصری | گیا چو کشد پیش گلبن سری
زبے دانشی باشد و کودکی | کہ رائے فزونی زند رودکی۔

ادھر یہ رقعہ قاصد کو دیا اور ادھر آپ بھی منزل بمنزل روانہ غزنی ہو گیا۔ ان ہی
دنوں میں محمود نے تواریخ ملوک عجم کو منظوم کرانا چاہا تھا۔ اس نیت سے اس نے کچھ کچھ
مضامین سات شعرا کو جو اس کے دربار کی زینت تھے مرحمت کیا تھا اور حکم دیا تھا
کہ اس کو منظوم کراؤ جس کی نظم پسند آئے گی اسی کو پوری کتاب کے نظم کرنے کا
حکم ہو گا گو محمود یہ جانتا تھا کہ میری خواہش کے مطابق ان میں سے ایک شاعر
بھی نظم نہ کر سکیگا پھر بھی اس کے شوق علم نے اسے مجبور کیا کہ وہ خواہ کیسے ہی
نظم میں مرتب ہو تواریخ عجم کو منظوم دیکھے۔ اس لحاظ سے اس نے شعرا کو تاکید
کر دی تھی کہ جہاں تک ممکن ہو ان گزشتہ واقعات کو نہایت برجستہ اور پُرزور نظم
میں موزون کرنا۔ یہ گرامی شعرا اپنے عظیم الشان فرض کی انجام دہی میں جان لڑا
رہے تھے اور ہر شاعر یہ چاہتا تھا کہ میں ہی سب سے اول نمبر پاؤں۔ مگر انہیں معلوم
نہ تھا کہ اول نمبر کا شاہنامہ شکفتہ زمانہ سے صرف اس شخص کو ملنا قرار دیا گیا ہے کہ
جو ہم میں سے نہیں ہے۔ وہ اس سے بالکل آگاہ نہ تھے کہ ہم اس فرض کی انجام
دہی کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔ جو شعرا کہ محمود کے دربار میں نہایت وقعت کی نگاہ

سے دیکھے جاتے تھے اور جنہیں اس دشوار فرض کی انجام دہی سپرد ہوئی تھی ان کے
گرامی نام حسب ذیل ہیں +
عنصری فرخی زینبی عسجدی منجک چنگیزن خرمی ترمذی یہ سات شاعر تھے
جنہیں کچھ کچھ حصہ کہیں کہیں سے سپرد ہوا تھا۔ اگر ہم ان شعرا کی لیاقت اور شاعری
پر نظر ڈالیں گے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ یہ سپہر سخنوری کے سات سیارے ہیں۔ اس
میں شک نہیں کہ ہر شاعر اپنے رنگ میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا اور ہر متنفس کی علمی
قابلیت اعلے درجہ پر بڑھی ہوئی تھی۔ ان کی لاثانی لیاقت کی شہادت خود محمود جیسے
فاضل قدردان پر ہی ہے۔ محمود انہیں آنکھوں پر بٹھاتا تھا اور ان کی بڑی بڑی
تنخواہیں کر رکھی تھیں اور جتنی عزت کہ ایک لائق قدردان حکمران اپنے فاضل کی
کر سکتا ہے وہ ان کی محمود کے دربار میں ہوتی تھی۔ محمود کا دربار صرف شعرا ہی سے
بھرا ہوا نہ تھا۔ بلکہ ہر علم و فن کے کامل اس کے دربار کے زیور بن رہے تھے۔
بوعلی سینا جیسا حکیم بھی اس کا آستانہ بوس ہو چکا تھا۔ تمام ہنروں اور فنون کے
ماہر حاضر خدمت رہتے تھے اور محمود ان کی بہت عزت کرتا تھا۔ مشرقی شاہوں کی فہرست
میں محمود کا نام بھی شامل ہے کہ جو قدردان علم و ہنر ہو گئے ہیں۔ اسی لئے فردوسی کو
جرات بھی ہوئی تھی کہ وہ اس شوق سے اس کے دربار میں حاضر ہو اور طرح طرح
کی آرزؤں کے پوٹ کندھے پر رکھ کر آستان بوسی کرے۔ چنانچہ وہ پرشوق
قدموں میں ہرات سے روانہ ہو کر غزنی پہنچا اور ایک باغ کے کنارہ پر اس نے اپنا
قیام کیا تاکہ کچھ ساعت یہاں آرام لے۔ اور بعد ازاں کپڑے بدل کر بارگاہ سلطانی
میں حاضر ہو۔ اپنا اسباب رکھا ٹٹو پر سے اپنا بستر اور کتابیں اتروائیں کنارہ آب
پر بیٹھ کر وضو کیا اور شکرانہ کی نماز پڑھی کہ بخیر و عافیت خدا نے غزنی پہنچا دیا۔
کچھ ناشتہ کیا جب ہر طرح فارغ ہو گیا تو ایک شخص کو دہ ملید کی طرف روانہ کیا کہ فردوسی
کے آنے کی خبر شہر میں مشتہر کی جائے تاکہ سلطانی سواری آئے۔ آدمی ادھر روانہ
ہوا اور آپ باغ کی خنک ہوا میں پھولوں کے تختوں کے پاس ٹہلنے لگا بلغ

کی بارہ دری میں اتفاق سے عنصری فرخی عسجدی یہ تین شاعر تنہا بیٹھے ہوئے پرائیوٹ گفتگو کر رہے تھے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے شہر کی چپقلش سے آکر پناہ لی ہے۔ فردوسی ٹہلتے ٹہلتے جو اُدھر پہنچا تو اس کی نگاہ ان تین شخصوں پر پڑی چونکہ یہ پردیسی تھا اس لئے اس نے یہ چاہا کہ آؤ ان ہی سے جب تک کوئی سلطانی سواری آئے دو چار باتیں کرو شائد اور کچھ بدیع الدین اور عسجدی وغیرہ کی نئی کیفیت معلوم ہو۔ دربار کا حال کھلے کہ کس نہج پر ہے یہ سوچ کر فردوسی بارہ دری کی طرف بڑھا اور ادھر ان تین شعراء نے اس کی طرف دیکھا۔ انہیں برا معلوم ہوا کہ یہ معمولی شخص ہماری خوش صحبت میں مخل ہونے کیوں آتا ہے اس اجنبی کو دیکھ کر ان پر ایک بے چینی سی طاری ہو گئی۔ عنصری نے تو یہ کہا کہ ملازم سے کہدیا جائے کہ یہ اجنبی یہاں نہ آنے پائے۔ دوسرے نے کہا کہ نہیں یہ لغویات ہے آنے دو مگر منہ نہ لگاؤ۔ خود بخود چلا جائیگا۔ تیسرے نے کہا یہ ساری باتیں خلاف انسانیت اور وحشی پنے کی ہیں ہمیں چاہئے کہ ہم خندہ پیشانی سے اس کے آنے پر مبارک باد دیں اپنے پاس بٹھائیں اور اس کا دل اپنی کسی حرکت سے آزردہ نہ ہونے دیں۔ ہاں صرف ہم تین شخص تین مصرعے کہیں اور اس سے التجا کریں کہ چوتھا وہ بھی کہے غالباً اس سے نہ کہا جائیگا۔ جب نہ کہا جائے تو ہم اسے صاف کہدیں کہ ہم شعراء دربار ہیں ہمیں شاہ کا حکم ہے کہ فلاں گزشتہ واقعہ کو منظوم کرو تو ہم اپنا وہ فرض انجام دے رہے ہیں بہتر ہوگا اگر آپ ہم سے فرصت کے وقت ملیں گے۔ بس یہ آدمیت اور تہذیب کی بات ہے ہمیں اس سے نجات بھی ہو جائے گی اور اس کا دل بھی نہ دکھیگا۔ تینوں نے اس بات پر اتفاق کیا۔ اتنے میں فردوسی نے آکر سلام علیکم کہا سب اٹھ کھڑے ہوئے اور بخندہ پیشانی اس کے پیش آئے۔ پہلے دو تین ادھر اُدھر کی باتیں ہیں بعد ازاں مصرعہ بازی ہوئی۔ پہلے عنصری نے کہا ؎ چوں عارض تو ماہ نباشد روشن پھر فرخی نے گوہر فشانی کی ؎ مانند رخت گل نبود در گلشن ؎ اس کے بعد عسجدی نے یہ گوہر پرویا ؎ مژگانت گزر ہمی کنند در جوشن۔ یہ تین مصرعے کہکر فردوسی

کی طرف استدعائیہ نظروں سے تکنے لگے۔ جب فردوسی نے ان کی نظروں کو دیکھا
تو یہ گویا ہوا۔ کیا آپ اجازت دیتے ہیں کہ چوتھا مصرعہ میں موزوں کروں؟ انہوں نے
جواب دیا۔ ہاں ہماری یہ التجا ہے کہ چوتھا مصرعہ آپ موزوں کریں۔ یہ سنتے ہی فردوسی
نے اسی وقت یہ مصرعہ کہا۔ ماننده سنان گیو در جنگ پشن ۔ یہ سنتے ہی ان کے حواس
باختہ ہو گئے اور وہ پریشان نظروں سے فردوسی کو تکنے لگے اور ہکا بکا رہ گئے
انہیں سخت صدمہ ہوا کہ ایک اجنبی نامعلوم الاسم نے ان کی ہمسری کی۔ بارے
انہوں نے اپنے کو ضبط کیا اور اپنے چہروں پر ملال نہ ظاہر ہونے دیا اور فردوسی سے
گیو اور پشن کی بابت دریافت کیا کہ اس کا بیان کیونکر ہے فردوسی نے فر از سارا واقعہ
سنا دیا پھر انہوں نے شاعری پر نئے نئے اور مشکل سوال کئے فردوسی نے سب کے
جواب دئے گفتگو میں انہیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ فردوسی ہے ان کے چھکے چھوٹ
گئے اور اب انہیں یقین ہو گیا کہ ضرور ہماری وقعت اور عزت میں فرق آئیگا۔
انہوں نے کر کے اپنا نام نہ بتایا لیکن ان کے باغ سے چلے جانے پر فردوسی کو ایک
شہری کی زبانی معلوم ہو گیا کہ یہ تین شعرا تھے ۔

ان ناخدا ترس غیر منصف شعرا نے کوشش کی کہ فردوسی باریاب نہ ہو سکے جس
شخص کو فردوسی نے بھیجا تھا کہ درباریوں میں سے کسی کو خبر کرے اس کو بھی بہکا
دیا گیا تھا۔ ایک دن اور رات تو فردوسی نے رستہ دیکھا بعد ازاں بیچارہ ایک سرائے میں
مقیم ہو گیا۔ فردوسی نے یہ کوشش کی کہ بدیع الدین سے ملوں لیکن بعد ازاں معلوم
ہوا کہ وہ کسی تحقیق کے لئے کل ہی قندہار روانہ ہوا ہے۔ اس خبر سے اور بھی
فردوسی کا دل افسردہ ہو گیا اور اس نے اپنی ناکامی کی تصویر اپنی آنکھوں کے
آگے پھرتی ہوئی دیکھی۔ شاہی دربار میں پہنچنا بغیر کسی بڑے زبردست توسط کے
محال تھا دوسرے تمام شعرا اس کوشش میں تھے کہ فردوسی دربار تک نہ پہنچنے پائے
یہ اور بھی ظلم تھا جو شخص عرض کرنا چاہتا تھا اسے یہ منع کر دیتے تھے۔ اسی اثنا میں
فردوسی کی خبر عوام میں مشہور ہونے لگی اور پندرہ سولہ دن میں خواص کے کانوں

میں بھی اس کی شہرت کے آوازے گونجنے لگے - چنانچہ پہلے جس شخص سے ملنا
وہ مصاحب سلطان ماہک نامی تھا - وہ سنتے ہی فردوسی کی قیام گاہ پر آیا اور بڑی
عزت سے اپنے مکان پر لے آیا اس کا ہر طرح اطمینان کیا اور کہا تم گھبراؤ نہیں میں
تمہیں بارگاہ سلطانی میں پہنچا دونگا +

فردوسی نے اتنی پریشانی کے بعد یہاں آرام پایا - نوکر چاکر خدمتگار مکان تمام
راحت کے سامان مہیا - اس سے زیادہ فردوسی کو اور چاہئے ہی کیا تھا سوا اس کے
کہ وہ سلطانی دربار کے آستانہ پر جبیں نیاز رگڑے ماہک نے دربار اور اہل دربار کی
کیفیت سے آگاہ کیا اور شعرا کا بھی تذکرہ کیا کہ آج کل فلاں فلاں حصہ تواریخ عجم کا
منظوم کر رہے ہیں - یہ سن کر فردوسی کے منہ میں پانی بھر آیا اور اس نے اپنے شفیق
میزبان سے کہا اگر میں باریاب بارگاہ سلطانی ہو جاؤں اور حضرت سلطان معظم مجھے
اشارہ ہو - تو میری مراد حاصل ہو اور میں شاعری کی پوری بانگی دکھاؤں اور بتاؤں کہ
واقعات کو منظوم یوں کیا کرتے ہیں +

اس میں شک نہیں کہ فردوسی کی جودت طبع ان شعرا کو جنہیں دربار میں بہت عروج
حاصل تھا کچھ حال نہ سمجھتی تھی - وہ مغرور نہ تھا بلکہ اس کی علمیت اور لاثانی لیاقت
سے یہ کہنے پر مجبور کرتی تھی - سر جارج ہملٹن کا یہ ریمارک فردوسی کی نسبت بہت
درست ہے کہ اور شعرا سوچ سوچ کر اشعار موزون کرتے تھے اور وہ اسی فن کے
اشعار بدیہہ کہدیا کرتا تھا اور اسے ذرا بھی تکلیف نہ کرنی پڑتی تھی - تمام شاہنامہ پر
ایک نظر ڈال جاؤ آورد کا نام بھی ایک مصرعہ میں نہ معلوم ہوگا - سر جارج ہملٹن
نے اس کی توصیف میں سے یہ اشعار انگریزی میں ترجمہ کرکے لکھے ہیں - جو
ہدیہ ناظرین ہیں +

چو گشتے باسپ بدیہہ سوار - بر آوردے از خیل فکرۃ و مار - برحم سخن در صف
ارتحال شکستے بیک حملہ قلب رجال + فردوسی کو ماہک کے پاس آنے سے اطمینان تو
ہوا لیکن اسے گرید یہ رہی کہ کیونکر سلطان محمود کے پاس پہنچوں گا اور شعرائے دربار

میں یہ نظم کب لکھا جائیگا۔ آخر ایک دن عنصری نے سلطان محمود سے عرض کیا کہ رستم
وسہراب کی داستان نظم ہو گئی۔ حضور اجازت دیں تو حاضر خدمت کروں۔ حکم ہوا کہ لائے۔
کل شعرا اور درباری جمع تھے وہ نظم پڑھی گئی محمود کو بہت پسند آئی اور اس نے عنصری
ہی کو شعرا میں اول نمبر گنا۔ دربار سے خلعت اور نقد روپیہ ملا اور نہایت عزت سے
عنصری رخصت کیا گیا۔ ماہک نے شام کو فردوسی سے یہ ساری کیفیت بیان کی فردوسی
نے کہا کہ تجھے ایک آدھ شعر یاد بھی ہے اس نے دو شعر فردوسی کو سنائے جو
حسب ذیل ہیں +

ہر آنگہ کہ تشنہ شدی تو بخوں　　بیالودی از خنجر آب گوں

زمانہ بخون تو تشنہ شود　　باندام تو موے دشنہ شود

پھر ماہک نے کہا کہ یہ اس موقعہ کے شعر ہیں کہ جب رستم نے دھوکا دیکر سہراب کو پچھاڑ دیا
اور اس کے سینہ پر چڑھ بیٹھا اور اس نے قتل سہراب کا ارادہ کیا تو سہراب نے اس نظر
سے کہ میں نے اُسے چھوڑ دیا تھا اور یہ ظالم مجھے نہیں چھوڑتا یہ حسرت ناک الفاظ بددعا
کے طور پر مذمت کے لباس میں زبان سے نکالے +

فردوسی نے کہا اگر تو صلاح دے تو میں رستم اور افراسیاب کی جانکاہ اور حیرت
افزا واقعہ کو منظوم کروں۔ ماہک نے تعجب خیز لہجہ میں دریافت کیا آیا تیرے پاس تاریخ
شاہان عجم ہے۔ فردوسی نے اپنے صندوق میں سے نکال کر وہ تاریخ دکھائی۔ ماہک
بہت خوش ہوا۔ اور اس نے فردوسی کو مشورہ دیا کہ وہ ضرور اس واقعہ کو منظوم
کرے۔ چنانچہ فردوسی نے چند روز میں اس واقعہ کا کچھ حصہ منظوم کیا تھا کہ ماہک
نے ایک دن موقعہ پاکر سلطان المعظم کی خدمت میں پیش کیا۔ محمود دیکھ کر بہت خوش
ہوا اور اس نے ماہک سے دریافت کیا کہ یہ اشعار کس کے ہیں۔ ماہک نے فردوسی
کی کیفیت عرض کی۔ سلطان محمود خفت کے ساتھ خوش ہوا اور اس نے کہا کہ ہم
نے فردوسی کو بلایا تھا افسوس ہے کہ اب تک اس کے آنے کی ہمیں خبر نہ ہوئی۔ کل حضور
اسے دربار میں حاضر کرنا۔ اسی دن سے محمود نے ایک صندوق محل کے دروازہ پر رکھوا دیا

اور حکم دیا کہ جو شخص کوئی فریاد کرے یا عرض معروض کرنا چاہئے اپنی تحریری عرضی اس صندوق
میں آکر ڈال جائے۔ محمود نہایت رحیم اور کریم فطرت کا شخص تھا۔ انصاف اس کی گھٹی
میں آمیز ہوچکا تھا جہاں تک اس کے فیصلے دیکھے گئے ہیں ہم ان سے یہ حکم لگا سکتے
ہیں کہ اس کی قلم سے نامنصفانہ تحریریں بہت ہی کم نکلتی تھیں۔ دوسرے دن فردوسی
پیش کیا گیا۔ سلطان نے صورت دیکھتے ہی اس سے معذرت کی اور معافی چاہی۔ فردوسی
اور بھی تعریف میں جھک گیا اور آداب دربار بجا لایا۔ پھر محمود نے فردوسی کو حکم دیا کہ تو خود مجھے
رستم اور اسفندیار کی منظوم داستان سنا۔ فردوسی نے نہایت خوش لہجہ میں پڑھ کر سنائی۔
محمود بہت خوش ہوا اور خلعت فاخرہ سے ممتاز کیا۔ پھر محمود نے دریافت کیا کہ تیرا اصلی وطن
کہاں ہے۔ عرض کیا گیا کہ طوس۔ ارشاد ہوا کہ طوس کس نے آباد کیا تھا فردوسی نے اس
سوال پر دست بستہ یہ گذارش کی۔ یہ مقام طوس در اصل طوس پسر نوذر کا آباد کیا ہوا ہے
اور یہ واقعہ تواریخ عجم میں یوں بیان ہوا ہے کہ جب کیخسرو نے طوس نوذر کو افراسیاب سے
جنگ کرنے کے لئے ترکی افغانی کی طرف روانہ کیا تو یہ ہدایت کردی تھی کہ راہ قلات سے نہ
جائیو۔ اس لئے کہ میرا بھائی فرود [illegible] دختر پیران ویسہ سے وہاں مقیم ہے اور سر کوہ پر ایک
گھاٹی میں رہتا ہے۔ چونکہ وہ تند و تیز اور سودائی مزاج ہے خوف ہے کہ تجھ سے جنگ پر آمادہ
ہوجائے اور پھر خون خرابہ اگر واقع ہو اور میرا بھائی چشم زخم اٹھائے۔ یہاں تو طوس نے
یہ اقرار کرلیا تھا کہ جو کچھ حضور نے ارشاد کیا ہے اس کے خلاف نہ ہوگا لیکن بعد ازاں اس نے
عدول حکمی کی اور راہ قلات سے جاکر روانہ ہوا۔ جب اس گھاٹی کے قریب پہنچا۔ تو
فرود آمادۂ جنگ ہوا اور کہا کہ یہاں سے میں طوس کو نہ جانے دونگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ باہم
جنگ ہوئی اور آخر فرود مارا گیا۔ کیخسرو کو اپنے مختلف البطن بھائی کے قتل ہونے
کی خبر جب پہنچی اس نے سخت ماتم کیا اور کہا کہ کمبخت طوس کو میں نے بھیجا تھا کہ میرے
باپ کے خون کا عوض افراسیاب سے لے اس بدبخت نے الٹا میرے بھائی کو مار ڈالا
[illegible] سے سخت عتاب کا ایک فرمان روانہ ہوا طوس نے فرمان کو دیکھ کر ترکی افغانی
سرحدوں کی طرف بڑھنا چاہا نہ اپنے شاہ کے دربار میں حاضر ہونا مناسب جانا۔

[illegible] نے اس شہر کی بنیاد ڈالی اور اپنے نام سے اسے آباد کیا
پھر جہاں کا ہیچیش میں اسے بھا گیا۔ جب سے یہ شہر آباد ہے اور اس کے نام سے مشہور
ہے۔ یہ سن کر محمود خوش ہوا اور اس نے فردوسی کی اس واقفیت پر مرحبا کہا۔ اور
مبارکباد دی اور حکم دیدیا کہ روز بارگاہ سلطانی میں حاضر ہوا کرے۔ دوسرے دن کے لئے
دربار کو حکم دیدیا گیا کہ کل شاعر حاضر دربار ہوں تاکہ فردوسی کے اشعار گوش گذار کریں
فردوسی نے اپنی پہلی باریابی کا حال سلطانی بارگاہ میں اس طرح لکھا ہے +

چو خورشید خرگاه بنمود تاج	زمین شد بکردار تابنده عاج
چه گوئی که خورشید تابان کبود	کزو در جهان روشنائی فزود
ابوالقاسم آن شاه پیروز بخت	نهاد از بر تاج خورشید تخت
زخاور بیاراست تا باختر	پدید آمد از فرّ او کان زر
مرا اختر خفته بیدار گشت	بمغز اندر اندیشه بسیار گشت
چو دانستم آمد زبان سخن	کنون نو شود روزگار کهن
بر اندیشهٔ شهریار زمین	بخفتم شبی دل پر از آفرین
دل من چو نور اندرین تیره شب	نخفته گشاده دل و بسته لب
چنان دید روشن روانم بخواب	که رخشنده شمعی برآمد ز آب
همه روی گیتی شب لاجورد	ازان شمع گشتی چو یاقوت زرد
در و دشت بر سان دیبا شدی	یکی تخت پیروزه پیدا شدی
نشسته برو شهریاری چو ماه	یکی تاج بر سر بجای کلاه
ز دل برکشیده سپه از دو میل	بدست چپش هفت صد ژنده پیل
یکی پاک دستور پیشش بپای	بداد و بدین شاه را رهنمای
مرا خیره گشتی سر از فر شاه	وزان ژنده پیلان و چندین سپاه
چو آن چهره خسروی دیدمی	ازان نامداران بپرسیدمی
که این چرخ و ماهست یا تاج و گاه	ستارست پیش اندرش یا سپاه

یکے گفت ایں شاہ روم است و ہند — ز قنوج تا پیش دریائے سند

بایران و توران ورا بندہ اند — برائے بفرمان او زندہ اند

بیاراست روئے زمیں را بداد — بپرداخت زاں تاج بر سر نہاد

جہاندار محمود شاہ بزرگ — بآبشخور آرد ہمے میش و گرگ

ز کشمیر تا پیش دریائے چیں — برو شہریاران کنند آفریں

چو کودک لب از شیر مادر بشست — ز گہوارہ محمود گوید نخست

تو نیز آفریں کن کہ گویندۂ — بدو نام جاوید جویندۂ

نپیچد کسے سر ز فرمان او — نیارد گذشتن ز پیمان او

چو بیدار گشتم بجستم ز جائے — چہ مایہ شب تیرہ بودم بپائے

براں شہریار آفریں خواندہ ام — نبودم درم جاں برافشاندہ ام

بدل گفتم ایں خواب را پاسخ است — کہ آواز او در جہاں فرخ است

برو آفریں کو کند آفریں — براں بخت بیدار و تاج نگیں

ز فرش جہاں شد چو باغ بہار — ہوا پر ز ابر و زمیں پر نگار

ز ابر اندر آمد بہنگام نم — جہاں شد بکردار باغ ارم

بایراں ہمہ خوبی از داد اوست — جہاں شادماں از دل شاد اوست

ببزم اندروں آسمان وفاست — برزم اندروں تیز دم اژدہاست

بتن ژندہ پیل و بجاں جبرئیل — بکف ابر بہمن بدل رود نیل

سر بخت بدخواہ با خشم او — چو دینار خوار است بر چشم او

نہ کندآوری گیرد از تاج و گنج — نہ دل تیرہ دارد ز رزم و ز رنج

ہر آنکس کہ دارد ز پروردگاں — از آزاد و از نیکدل بردگاں

شہنشاہ را سر بسر دوستدار — بفرماں ببستہ کمر استوار

شدہ ہر یکے شاہ بر کشورے — رواں نام شاں بر ہمہ منبرے

یہ اشعار اول ہی دن سلام کرکے فردوسی نے دربار میں پڑھکر سنائے اور بعد ازاں

[illegible] اسفندیار کی داستان اشعار پڑھی اس دن تو خوشی خوشی فردوسی رخصت ہوکر چلا آیا۔ دوسرے دن جس وقت دربار میں حاضر ہوا تو تمام شعرا کو دست بستہ کھڑا ہوا دیکھا کیا سلطان المعظم کا ارشاد ہوا کہ ان شعرا کو بھی اپنے اشعار سنا۔ حکم ہوتے ہی فردوسی نے سنائے اشعار کا سننا تھا کہ سب سے زیادہ عنصری بیتاب ہوگیا۔ چاہتا تھا کہ خاموش کھڑا رہے لیکن نہ رہا گیا۔ اور اس نے دوڑ کر فردوسی کے لبوں پر بوسہ دیا۔ اس کے ہاتھ چومے اور بیساختہ اس کی زبان سے یہ سرزد ہوا ✦

سخن گرچہ آید ز چرخ بلند	تو بارش بروں بردی اے ہوشمند
تو دادی دریں عرصہ داد سخن	کہ بادی ستودہ بہر انجمن
نبودہ ہنر عنصرت بے شمار	بماند چو نامت سخن یادگار
تو شاہنشہ ملک نظم دری	بہ بندت بہ پیشت کمر عنصری

چاروں طرف سے مرحبا و صد مرحبا کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ اور ہر شخص واہ واہ کرنے لگا۔ سب سے زیادہ محمود خوش تھا کہ اسے ایسا شاعر ہاتھ لگ گیا۔ آخر محمود نے حکم دیدیا کہ کل تواریخ عجم فردوسی ہی نظم کرے ✦

فردوسی کا شاہنامہ تصنیف کرنا اور رنجش کا

یہ مسلم امر ہے کہ علم اور لیاقت انسان کی سلاطین کی بارگاہ میں خود سفارشی بن جاتی ہے۔ محمود جو علما اور فضلا پر مٹا ہوا تھا اس قدر فردوسی کے آنے سے خوش ہوا کہ پھولا نہ سمایا۔ ایک دن چند بیتیں محمود نے پڑھیں اور شعرا سے چاہا کہ اپنی اپنی تعریف میں اسی مضمون پر کچھ کہیں۔ بھلا کس کی مجال تھی کہ فردوسی کے آگے زبان کھولتا۔ سب نے متفق ہوکر فردوسی کی طرف اشارہ کیا۔ فردوسی نے فی البدیہہ دو تین بیتیں عرض کیں اور وہ یہ ہیں ✦

مست است بتا چشم تو و تیر بدست	بس کس کہ ز تیر چشم مست تو بخست

مگر پیشه دار صفت ندو عند [illegible] پست — کز تیغ تیز [illegible] کین ناصر پست

یہ دو بیتیں سلطان کو اتنی اچھی معلوم ہوئیں کہ وہ نہایت انبساط سے [illegible]
الفاظ میں یہ گویا ہوا۔ تندورک یا فردوسی کہ مجلس ما را چون فردوس ساختی
یہ تعریفی الفاظ ایسے زبردست حکمران کی زبان سے فردوسی کے حق میں سوائے
اس کے اور کچھ ثابت نہیں کرتے کہ فردوسی ایک غیر معمولی لیاقت کا شخص تھا۔
اور نظم میں اسے وہ دستگاہ حاصل تھی کہ نہ کسی کو ہوئی اور نہ ہوگی۔ دوسرے
سلطان المعظم کی انتہا درجہ کی علم دوستی معلوم ہوتی ہے کہ وہ علما پر کیسی جان فدا
کرتا تھا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ ہمارے محلوں میں فلاں محل جو ہماری خوابگاہ کے
قریب ہے فردوسی کے لئے آراستہ کیا جائے اور تمام سامان عیش وہاں مہیا ہوں۔
فردوسی نے عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں تمام آلات حرب وہاں موجود ہوں اور گذشتہ
شاہوں کی بڑی قد آدم تصویریں کھینچی جاویں۔ محمود نے حسن میمندی کو حکم دیا
کہ فردوسی کی خواہش کے مطابق سب تیاری ہو جائے۔ حکم کی دیر ہی تھی ہر شے فردوسی
کی رائے کے موافق تیار ہو گئی۔ اب فردوسی شاہنامہ تصنیف کرنے بیٹھا۔ سوائے
ایاز اور حسن میمندی کے پرندہ پر نہ مار سکتا تھا۔ چند خدمتگار تھے۔ جو سلطان کی طرف
سے مقرر ہوئے تھے۔ ایاز فردوسی کو باپ کہا کرتا تھا اور وہ اسے اپنا فرزند سمجھتا
تھا۔ سلطان نے حسن میمندی کو حکم دیا تھا کہ جب ہزار بیتیں فردوسی تصنیف
کر لیا کرے تو ہزار اشرفی فوراً دیدیا کرو۔ یہ ہزار اشرفیاں وہ تھیں کہ جو تنخواہ سے
علیحدہ بطور انعام کے دئیے جانے کا حکم ہوا تھا۔ ایک دن دربار میں کل شعرا کی نظموں
کا ذکر ہو رہا تھا محمود نے اپنی زبان سے یہ الفاظ کہے ✦

بانه‌ها داستان شنیده ام اما نظم فردوسی چیزے دیگر است و عبارت
ادایش از دیگر [illegible] و در رزم و بزم و غیرہ از سخن او فصاحت و مفاخر
و دلیری و مروت و تہور و عیش و طرب مے انگیزد و در مقام ضعف و کسر
و حسرت و تحزن او رقت و تحبن مے آمد و در ہمہ حال تسکین طبع و تسلی

[illegible]

یہ ہے بار ذکرِ خاص سلطان محمود کا فردوسی کے اشعار کی نسبت ہے۔ ان تمام
باتوں سے یہ کھلتا ہے کہ فردوسی پر محمود فریفتہ تھا اور اس طرح جوش و جذبہ میں اس
کی مدح کرتا تھا کہ آج تک کسی کو یہ نصیب نہ ہوا تھا کہ محمود جیسے سلطان سے ایسی مدح
کر سکے اور جبراً اس کا دل اپنی طرف کھینچ لے۔

فردوسی شاہ نامہ کی تصنیف میں مشغول ہوا اس عرصہ میں اس کا استغنا بڑھتا
گیا اور بڑھتے بڑھتے یہاں تک نوبت پہنچی کہ گستاخانہ بے پروائی رنگینی اس کی
طبیعت میں آگئی جو اس کے لئے ہرگز زیبا نہ تھی۔ اس لئے یہ نہ جانا کہ جو کچھ مجھے
حاصل ہوا ہے یہ محض انکساری اور عاجزی سے۔ سرکشی سے اس نے کوئی بات حاصل
نہ کی تھی مگر پھر بھی افسوس یہ ہے کہ وہ اپنی اس حالت کی طرف متوجہ نہ ہوا اور دن
بدن اس بری عادت کو بڑھاتا گیا۔ گو اس کا ہم اعتراف کرتے ہیں کہ یہ ساری حسن میمندی
کی شرارت تھی پھر بھی اسے بہت کچھ ضبط کرنا تھا۔ شاہ نامہ تصنیف ہونے کے
درمیان جس بات پر حسن میمندی اور فردوسی کی بگڑ گئی۔ وہ درج ذیل کی جاتی ہے تاکہ
ثابت ہو جائے کہ سلطان محمود بالکل بے قصور تھا۔ حسن میمندی دربار کی وزرا میں
سے تھا اور اس کی بہت بڑی عزت تھی۔ جس کو سر جارج ہلٹن اور عظیم سمرقندی نے
فارن سیکرٹری لکھا ہے۔ اور یہی فردوسی کی خدمت کے لئے مقرر ہوا تھا۔ یعنی
تمام انتظام اسی کے سپرد تھا۔ سلطانی حکم ہو گیا تھا کہ فردوسی کو جس چیز کی ضرورت
ہو حسن میمندی فوراً اس کے بہم پہنچانے کی کوشش کرے۔ فردوسی دراصل سنی
تھا۔ لیکن پھر بھی شیعہ مذہب کا اثر کچھ نہ کچھ اس کی طبیعت پر باقی تھا۔ عظیم سمرقندی
لکھتا ہے کہ تفضیلیہ تھا۔ خیر کچھ ہو ہمارے پاس ایسی کوئی شہادت موجود نہیں
ہے کہ ہم اسے شیعہ مان لیں۔ بایں ہمہ اہلبیت کی پاک محبت کے نقوش اس کے
دل پر گہرے گہرے ہو رہے تھے۔ وہ خوارج کا دلی دشمن تھا اور ان سے نفرت
کیا کرتا تھا۔ حسن میمندی اصل میں تو خارجی تھا لیکن بظاہر وہ سنی المذہب بنا ہوا تھا

ہونا اس کے دل میں فردوسی کے مقابلہ میں اہلیت سے عداوت تھی۔ مگر ایک وقت تک فردوسی کو یہ ظاہر نہ ہوا کہ حسن میمندی خارجی ہے اس کے خلاف حسن میمندی کو بخوبی معلوم تھا کہ فردوسی شیعہ ہے حالانکہ وہ شیعہ نہ تھا۔ حسن میمندی اول ہی دن سے فردوسی سے دلی عداوت رکھتا تھا اور وہ اس موقع کی تلاش میں تھا کہ فردوسی چشم اعتبار سے گرا دیا جائے۔ اسی اثنا میں فردوسی کو بھی یہ معلوم ہو گیا کہ حسن میمندی خارجی ہے یہ خیال آنا تھا کہ فردوسی کو سخت نفرت ہونی شروع ہوئی اور اس نفرت کے آخرکار نمایاں آثار صورتوں پر ہویدا ہونے لگے۔ پھر بھی فردوسی اپنے عظیم الشان غرض کی انجام دہی میں کچھ ایسا سرگرمی سے مصروف تھا کہ اسے عداوت کرنے اور دشمنی کا پہلو سوچنے اور حریف کو زک دینے کے خیال کرنے کے لئے بہت کم وقت ملتا تھا۔ دوسرے فردوسی میں اپنے علم کے زور پر گھمنڈ اس قدر تھا کہ وہ حسن میمندی کو کچھ مال نہ سمجھتا تھا اور ذرا بھی نہ جانچتا تھا کہ یہ مجھے کچھ اذیت دے سکیگا۔ فردوسی کی اس بےخبری اور بیجا تحقیری نے اسے آخر پشیمان کیا۔ اور اسے آئندہ بہت کچھ دقتیں اٹھانی پڑیں۔

حسن میمندی شب و روز تاک میں لگا رہتا تھا کہ کوئی موقعہ ایسا نکلے تو فردوسی کو نیچا دکھاؤں مگر وہ جلدی اپنے اس ارادہ میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا وجہ یہ تھی کہ فردوسی کو انتظام امور جہانداری کی کوئی شاخ سپرد نہ تھی کہ اس سے خواہ مخواہ لغزش ہوتی اور وہ ماخوذ ہوتا۔ اس کا کام ہی ایسا تھا کہ اس میں قدم رکھنے کی بھی جگہ نہ تھی۔ بھلا یکایک وہاں حسن میمندی کی دشمنی کیا چل سکتی تھی۔ فردوسی کا قاعدہ تھا کہ جمعہ کے دن بالکل کام نہ کرتا تھا گویا یہ دن چھٹی کا تھا۔ اس دن اسے امرا سے ملنا باغوں میں جانا شکار کھیلنا یہ ساری تفریح کی باتیں امرا کے ساتھ ملکر فردوسی کیا کرتا تھا۔ کچھ عرصہ میں فاضل شاعر کا اکثر امرا سے تعارف ہو گیا۔ قاعدہ ہے کہ جب دو شخصوں میں دوستی ہو جاتی ہے تو ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق تحفے پیشکش کیا کرتا ہے۔ امرا فاضل شاعر کو قیمتی قیمتی سوغاتیں دیتے اور فاضل شاعر

اس کے بدلے میں کچھ اشعار ان کی مدح میں موزوں کرکے پیشکش کردیتا۔ حسن میمندی نے دل میں سوچا کہ میں ایک رکن اعلیٰ ہوں اور دوسرے ہر وقت اس کی خوشامد کے لئے حاضر رہتا ہوں اس نے میری مدح میں کبھی ایک شعر بھی نہیں لکھا اور ادھر ادھر اپنی تیزی طبع کی بانگی دکھاتا پھرتا ہے۔ یہ خیال گو ایک کمینہ اور ادنےٰ خیال تھا۔ لیکن پھر بھی حسن میمندی کے دل پر ایک اہم اور پیچیدہ اور قابل غور امر کی صورت میں نقش ہوگیا۔ اور وہ اسے ایک بڑا کام یا عظیم الشان فرض سمجھتا تھا کہ کسی طرح فردوسی سے اس توہین کا انتقام لوں +

شاہ نامہ کی تکمیل فردوسی کی محمود سے ناراضگی اور اس کا کوچ

ایک دن حسن میمندی بخندہ پیشانی عاجزانہ ہیئت بناکر فردوسی کے پاس آیا اور یادِ ادھر ادھر کی باتیں اس کی صفت و ثنا کے ساتھ کرنے لگا مگر بعض الفاظ حسن میمندی کی زبان سے ایسے بھی نکل گئے جو فردوسی کو ناگوار گذرے۔ یہاں تک کہ اسے جوش آگیا اور وہ یہ گویا ہوا۔ مجھے اپنی لیاقت اور قابلیت پر ناز ہے۔ محمود پر کیا مقرر ہے جہاں جاؤں گا میرا علم مجھے آسمان عزت پر بٹھائیگا۔ مجھے ہرگز کسی کی پرواہ نہیں ہے۔ یہ سنتے ہی حسن میمندی خوش ہوا اور اب اسے پورا یقین ہوگیا کہ فردوسی کا دام میں پھنسنا کوئی بات ہی نہیں ہے حسن میمندی نے فردوسی کے خلاف کہکر اور بھی اُسے گرمایا یہاں تک کہ فردوسی کی زبان سے بیساختہ یہ نکل گیا جو اس کے حق میں بہتر اثر کرنے والا نہ تھا۔ جس نے فردوسی کی تباہی کی بنیاد قایم کردی +

من پیش کو مبادی فطرت نبودہ ام	مایل بمال ہرگز و طامع بجاہ نیز
سوئے در وزیر چرا ملتفت شوم	چوں فارغم ز بارگہ پادشاہ نیز

قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حسن میمندی نے فردوسی سے اپنی اطاعت کرانا چاہی تھی اور یہ بھی عیاں ہوتا ہے کہ فاضل شاعر نے یہ اشعار حسن میمندی کے پیچھے تصنیف فرمائے ممکن ہے کہ فاضل شاعر کے کسی دوست نے حسن میمندی کو سفارش کی ہو۔ اس پر اس نے یہ اشعار تصنیف کئے ہیں اپنے فاضل شاعر پر بحرو ہے کہ اس نے کس اولو العزمی سے اپنے عالی ہمم طبیعت کا فوٹو کھینچ دیا اور ذرا بھی کسی کسی کی پرواہ نہ کی گو شخصی حکومت کی مصلحت اس قول کو نفرت کی نظر سے دیکھتی ہے پھر بھی یہ عجیب بات ہے کہ فاضل شاعر کا استغنا اپنے علم اور لیاقت پر پورا بھروسہ ظاہر کرتا ہے۔ اس مذکورہ بالا قطعہ کے ہر ہر لفظ سے بیا ختگی غضب کی ٹپکتی ہے اور یہ صاف کھلتا ہے کہ بناوٹی اشعار نہیں ہیں بلکہ فاضل شاعر کی طبیعت نے مجبور کیا کہ وہ یہ زبان سے نکالے یہاں تو بے اختیاری کی یہ کیفیت ہے اور وہاں حسن میمندی اپنے موقع کی تاک میں تھا کہ ذرا سبب بنے تو بادشاہ کے کان میں فردوسی کی اس مغرورانہ طبیعت کا نقشہ کھینچوں +

باہمی مخالفت نے اس قدر طول کھینچا کہ اکثر اہل دربار کو معلوم ہوگیا کہ فردوسی اور حسن میمندی کی چشمک رہی ہے۔ چونکہ امرا اور وزرا فردوسی کو زیادہ عزیز رکھتے تھے اس لئے انہیں گوارا نہ تھا کہ فردوسی کو کوئی چشم زخم پہنچے۔ وہ سب ایک دن جمع ہو کر فردوسی کے پاس آئے اور یہ چاہا کہ دونوں کی مصالحت کرادی جائے انہوں نے آکر اونچ نیچ دکھائی حسن میمندی کا اختیار اور درباری عزت بیان کی اور یہ کہا۔ ہمارے خیال میں کسی طرح بہتر نہیں ہے کہ تو حسن میمندی سے عداوت رکھے۔ یہ مانا کہ تیرا وہ کچھ کر نہیں سکتا پھر بھی شاہ اور دربار پر اس کا بہت اثر ہے۔ مبادا بیٹھے بیٹھے تجھے کچھ گزند پہنچے اور ہمارے دلوں پر صدمہ کی چوٹ لگے تو خواہ کوئی عذر پیش کر بہرحال ناراضگی اور عداوت سے میل جول زیادہ مفید ہے۔ اس کے جواب میں فردوسی نے کہا کہ ابھی تک حسن میمندی نے میرا کوئی نقصان نہیں کیا میری کسی قسم کی مخالفت نہیں کی۔ اس لئے ظاہرا کوئی وجہ حسن میمندی سے ناچاقی اور نفرت کی نہیں معلوم ہوتی مگر

میں اپنی دلی کرید کو کیا کروں جو لمحہ بلمحہ اس کی طرف سے میرے دل میں اٹھتی ہے۔
اور جس وقت اس کی صورت دیکھتا ہوں میری آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔ فردوسی
کی اس گفتگو کو مصالحہ کرانے والوں نے بغور سنا وہ سمجھ گئے کہ دنیاوی وجہ سے
دشمنی نہیں ہے صرف دینی معاملات کی وجہ ہے اس پر بھی انہوں نے فردوسی کو خوب
سمجھایا اور جتنا ان سے ہوسکا زمانہ کا اونچ نیچ دکھایا۔ بھلا وہاں یہ باتیں فراہمی
اثر کرنے والے نہ تھیں۔ فردوسی نے آخر کار بگڑ کر انہیں یہ جواب دیا ✦

بدل ہر کہ بغض علی کرد جائے ۔۔۔ زمادر بود عیب آن تیرہ رائے
کہ ناپاک زادہ بود خصم شاہ ۔۔۔ اگرچند باشد بایوان گاہ
زہمیندی آئین مردی مجوی ۔۔۔ زنام دنشانش مکن جستجو

ناچار جو درباری سمجھانے گئے تھے وہ اٹھ کر چلے آئے اور انہوں نے سمجھ لیا کہ
مذہبی عداوت کبھی کم نہیں ہوسکتی۔ رفتہ رفتہ یہ اشعار حسن میمندی کے کان تک پہنچے
وہ اور بھی برافروختہ ہوا اور اب اس نے مصمم ارادہ کرلیا کہ جہاں تک ممکن ہو اس کی
بیخ کنی کی جائے مگر وہ ظاہرا کوئی موقع ایسا نہ پاتا تھا کہ جو اس کے لئے کامیابی کی
خوشخبری سناتا حسن میمندی کا انفلیوائینس درباریوں پر خصوصا گروہ علما پر بہت زیادہ
تھا۔ اس نے اپنے ارادہ میں کامیاب ہونے کے لئے علما اور بعض درباریوں کو فردوسی
کی طرف سے بھڑکانا شروع کیا اور ہوتے ہوتے یہاں تک نوبت پہنچی کہ انہیں اپنی طرف
کرلیا۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ ایسی صورت میں طالب دماغ زیادہ متعصب بن جاتا ہے
کیونکہ اس گروہ میں بعض اس فطرت کے ہوتے ہیں کہ اسلام اور اس کی حقیقت کو
صحیح صحیح سمجھ سکتے ہیں مگر اکثر نہیں جانتے کہ اسلام کا مفہوم کیا ہے اور اس کی اصلی
حقیقت کیا ہوتی ہے۔ اب فردوسی پر چاروں طرف سے مذہب کی ٹٹی کی آڑ میں حملے
ہونے لگے۔ اور نئی نئی باتیں اس پر چھٹنے لگیں۔ اس کے اشعار میں سے جو محض
شاعرانہ رنگ و بو سے پڑھتے نئے نئے نتائج نکلنے لگے۔ اور ان پر نکتہ چینی ہونے لگی۔
کوئی کہتا تھا کہ یہ فلسفی ہے جب فلسفی ہوا تو اسے اسلام سے کچھ سروکار نہیں ہوسکتا

کوئی اسے معتزلی کہتا تھا اور کوئی اس بیچارہ کو رافضی گردانتا تھا گو حقیقت میں ان
سب الزامات سے پاک تھا اور اس کا سیدھا سادہ اسلامی مذہب تھا۔ جو لوگ اسے
فلسفی کہتے تھے وہ اپنی تائید میں اس کے یہ اشعار پیش کرتے تھے *

نگہ کن بایں گنبد تیز گرد — کہ درماں ازویست ونیز درد

ازو دار گردی ازو سرفراز — وزو داں فزونی وہم زو نیاز

بقول ان کے ان اشعار سے پایا جاتا ہے کہ وہ فلسفی ہے اس لئے کہ اس نے
یہ ظاہر کیا ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے اس گنبد تیز گرد سے ہوتا ہے۔ اور یہی فلسفیوں کا
مذہب ہے۔ حالانکہ اسلام اس عقیدہ سے ہزاروں کوس دور ہے بلکہ وہاں یہ اصول
ہے کہ ہر شے پر اللہ قادر ہے جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کی قدرت سے ہوتا ہے *
جو کٹ ملا اس کے مخالف تھے۔ وہ ان سارے اشعار میں سے اس کی فلسفیت
کی دلیل دیتے تھے حالانکہ یہ محض لغو ہے۔ مشرقی شعرا نے ہمیشہ آسمان کی گردش کو
اپنے اعمال اور نیکی بدی کی ڈیوٹی سونپ دی ہے جب وہ مفارقت کا مضمون باندھتے
ہیں تو آسمان پر منہ آتے ہیں اور اپنے معشوق کی بے وفائی کا الزام بالکل آسمان اور
اس کی گردش پر رکھتے ہیں۔ کیونکہ ان کی حمیت اور محبت کے خلاف ہے کہ وہ بیوفائی کا
الزام اپنے معشوق پر رکھیں۔ ایسی ایسی رکیک شاعرانہ تشبیہوں سے یہ ثابت کرنا کہ
فردوسی فلسفیانہ مذہب رکھتا تھا سخت ناکارہ بات ہے *
جو لوگ اسے دہریہ اور لامذہب کہتے تھے۔ وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں یہ
اشعار پیش کرتے تھے جو پہلے اشعار سے بھی رکیک تر ہیں *

نہ گشت زمانہ بفرسایدش — نہ از رنج و تیمار بگزایدش

نہ از جنبش آرام گیرد ہمی — نہ چوں ما تباہی پذیرد ہمی

بقول ان کے یہ اشعار آسمان کی قدامت اور لازوال ہونا ثابت کرتے ہیں۔
حالانکہ قیامت کے دن آسمان کے ٹکڑے اڑ جائینگے اور کوئی چیز ایسی نہ رہیگی کہ
جس پر فنا کا برقع نہ پڑے۔ فردوسی کے مجنوں دشمنوں کے یہ اعتراض کیسے لغو اور

[illegible] تعصب انسان کو اندھا کر دیتا ہے
اور لئے کچھ نہیں دکھائی دیتا۔ ان اشعار میں فردوسی نے اپنی حسرت و یاس کا
نقشہ کھینچا ہے اور نہایت افسوس سے کہتا ہے کہ ہم تو یوں تباہ ہوتے جاتے ہیں
لیکن فلک جیسا تھا ویسا ہی دکھائی دیتا ہے۔ ہمارے ستانے کا دل پر کچھ بھی اثر
نہیں پڑتا۔ اگر ان اشعار سے بھی ہم یہ سمجھ لیں کہ فردوسی دہریہ تھا تو ہماری سخت
حماقت ہے اگر ایسی ہی باتوں سے دہریہ پن ظاہر ہوتا ہے تو دنیا میں شاید ہی
کوئی مسلمان ملے ✦

ان لوگوں کے علاوہ جو لوگ اس پر رفض کا الزام قایم کرتے تھے وہ اپنے دعوے
کے ثبوت میں یہ اشعار پیش کرتے ہیں ✦

اگر چشم داری بدیگر سرائے — بنزد نبی و ولی گیر جائے
گرت زیں بد آید گناہ منست — چنیں است ایں رسم و راہ منست

یہ تماشا کی بات ہے کہ ایک ہی شخص فلسفی ہوا اور وہ ہی دہریہ ہوا اور وہ ہی رافضی
ہوا اول تو یہ ہی امر محال ہے۔ جب یہ امر محال ہوا تو پھر وہ ان میں سے ایک بھی نہ ہوا
اور آخر سنی المذہب اُسے ماننا پڑیگا۔ پہلے شعر کے دوسرے مصرعہ میں جو نبی و ولی
کا لفظ ہے اس سے انحصار نہیں پایا جاتا ہو گا ہم کسی شئے خاص کی دو ایک
صفتیں بیان کر کے کل صفتوں کا انحصار اس پر کر دیتے ہیں۔ مثلاً حدیث میں آیا ہے"
المومن لا یکذب" مومن جھوٹ نہیں بولتا۔ یہاں مومنیت کا انحصار صرف جھوٹ نہ بولنے
پر ہوتا ہے حالانکہ مومن کی اور بھی لازمی صفتیں ہیں جو اس میں ضرور ہونی چاہئیں۔
اگر وہ صرف سچ بولتا ہے اور کوئی صفت اسلام کی اس میں نہیں ہے وہ کبھی
مسلمان نہیں ہو سکتا۔ اور دوسری جگہ یہ آیا ہے کہ جو اپنے ہمسایہ سے محبت رکھتا
ہے جنت میں جائیگا۔ کیا اس کے صرف ہم یہی معنے سمجھ لیں کہ جنت میں جانے کے لئے
صرف ہمسایہ سے محبت کرنا کافی ہے۔ تو ہماری یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ اکثر کافر وغیر اسلام
بھی اپنے ہمسایہ سے محبت کیا کرتے ہیں کیا وہ جنت میں چلے جائینگے ✦

ان اشعار پر [illegible] [illegible] کے معنی [illegible] [illegible]
پیدا ہوئے لگیں اور چاروں طرف [illegible] [illegible] [illegible] بانجام رسید [illegible] یک
ان رکیک اعتراضوں کی آوازیں جلد پہنچیں۔ محمود [illegible] [illegible] باتیں فردوسی کے متعلق
کی نسبت سنتا تھا مگر اسے ذرا بھی پروا نہ تھی اور اس کی توجہ کبھی اس کی طرف
منعطف نہ ہوتی تھی۔ کیونکہ وہ ایک قدردان اور روشن دل حکمران تھا۔ بلکہ ایک دن
تو یہاں تک ہوا کہ اس نے سرِ دربار برملا یہ کہدیا دمیں فردوسی کو اس کی لیاقت کی
وجہ سے چاہتا ہوں مجھے اس کے مذہب سے کوئی بحث نہیں ہے میں نے اسے تلقین
اسلام کے لئے نہیں رکھا ہے۔"
محمود کے اس جواب سے سب کے چھکے چھوٹ گئے [illegible] فاضل شاعر کے دشمنوں
نے آخر موں کی کھائی۔ اور وہ اپنا سا منہ لیکر رہ گئے اور اپنی [illegible] کوششوں میں
سخت ناکام ہوئے۔ اس موقعہ پر سرجارج ہملٹن نے جو کچھ لکھا ہے وہ قابل قدر ہے
چنانچہ وہ لکھتے ہیں محمود جیسے حکمران کے لئے یہ [illegible] کہ مولویوں کی اس بیجا
کاوش کی فطرت کو دسمجھ سکتا اور اُن کے کہنے پر اپنے فاضل شاعر کو علیحدہ کردیتا
گو وہ ایک قہار فاتح اور جری حکمران تھا لیکن ان کی صفتوں کا ظہور زیادہ میدان
جنگ میں ہونا پسند کرتا تھا دربار میں علما اور فاضل شعراء کے لئے وہ منکسر
مزاج شریف الطبیعت اور قدردان تھا حقیقت یہ ہے کہ وہ لائق شخصوں کا ہر حالت
میں نازبردار تھا وہ مذہب کی طرف سے نہایت سخت مزاج تھا لیکن اس کی سخت
مزاجی محض ہم پلہ حکمرانوں کے مقابل میں ہوتی تھی نہ کہ اپنے ملازمین کے لئے۔ وہ
اپنے لاثانی فضلا کا کشادہ دل سے دوست تھا اور اُسے اُن کے مذہب سے کوئی
تعرض نہ تھا۔ محمود کے ہاں بہت سے نصرانی بھی اعلیٰ اعلیٰ مدجوں پر ممتاز تھے
جن میں سب سے بڑا مسٹرسی مین تھا جو آسمانی کہلاتا تھا۔ یہ در اصل اطالیہ کا باشندہ
تھا اور فیل خانہ کا داروغہ تھا۔ اس کے مرنے پر محمود نے بہت افسوس کیا۔ اس
کے بال بچوں کو بہت کچھ دیکر بحفاظت اس کے ملک میں پہنچوا دیا جس کی ویسی

جاتا۔ بعد قدرشناس حکیم طبیعت سے یہ توقع ممکن ہو سکتا کہ وہ ان مذہبی اعتراضات کی کچھ پروا کرتا جو نیک خواہی کی آڑ میں محمود کے آگے فردوسی پر کئے جاتے تھے۔
سرجان میلکم کی محمود کے کیریکٹر کی نسبت یہ منصفانہ رائے واقعی بہت قدر کے قابل ہے۔ میں بھی اس کی ہسٹوریکل فیکٹس کے مطابق اس کی تائید کرتا ہوں اور میں یقین کرتا ہوں کہ اگر فردوسی کی طرف سے اور زیادہ بے اعتدالیاں ہوتیں۔ تو کبھی فردوسی کو اپنی زندگی کا غیر خوش آیندہ زمانہ نہ دیکھنا پڑتا۔ فاضل شاعر کی بیجا بے پروائی
• جب فردوسی کے کان میں یہ آواز پہنچی کہ سلطان اس کی طرف سے اور اس نے چغلی خوردن کو جھڑک دیا ہے تو اب اور بھی اس نے بے پروائی اور بے اعتدالی اور غلط فہمی سے قدم آگے بڑھایا۔ اور اب وہ کھلم کھلا وہ ناروا حرکتیں کرنے لگا جو محمود جیسے غیور کے لئے زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوئیں۔

سلطان محمود نے حکم دیدیا تھا کہ بیس ہزار اشعار کے بعد بیس ہزار اشرفیاں فردوسی کو ملجایا کریں۔ لیکن عظیم کی رعایت کے بموجب محمود نے یہ حکم دیدیا تھا کہ ایک ہزار پر ایک ہزار اشرفی خزانہ سے حسن میمندی کی معرفت دیدی جایا کریں۔ مگر فردوسی نے ٹکڑے ٹکڑے لینے سے انکار کردیا تھا بلکہ اس نے یہ درخواست کی تھی کہ میں اکٹھی لونگا کیونکہ اسے شاداب اپنے مولد کی نہر بنوانی تھی جس کا اس نے محض ناداری کی حالت میں ارادہ کیا تھا۔

فردوسی کو سردست روپیہ لینے کی کچھ پروا بھی نہ تھی اس لئے کہ ہزار ہا روپیہ کے تحفے تحائف امرا، وزرا کے پاس سے چلے آتے تھے۔ اسی اثنا میں کسی نے رستم و اسفندیار کا منظوم واقعہ فخرالدولہ دیلمی کو لیجا کر دیا اس نے لیجانے والے کو بھی انعام دیا اور فردوسی کو بھی ہزار دینار بھیجے۔ فردوسی نے بخوشی غیر حکمران کا انعام محمود کو مطلع کئے بغیر قبول کرلیا۔ یہیں سے گویا فردوسی کی بدنصیبی کی تاریخ شروع ہوئی۔ یہ عجیب پیچ آ پڑا تھا کہ محمود کی اور فخرالدولہ کی باہم سخت عداوت تھی۔ فخرالدولہ کو لوگ معتزلی مشہور کرتے تھے اور محمود ایسے حکمران سے نفرت کرتا تھا۔ دوسرے یہ بھی سخت

نامناسب بات تھی کہ بغیر سلطانی حکم کے فردوسی مختلف مقاموں واقعات کو جگہ جگہ بیان کررہا ہے اور وہاں سے اس کے لئے انعام آرہا ہے۔ یہ واقعی نہایت بے عنوانی فردوسی سے ہوئی اور یہی بہت بڑی وجہ تھی کہ جس سے سلطان فردوسی سے ناراض ہوگیا۔
جونہی لوگوں نے سلطان کو فردوسی کی طرف سے کشیدہ خاطر دیکھا اب ان کا موقع بنا اور انہوں نے فردوسی کی طرف سے نئی نئی باتیں لگانی شروع کیں۔ ایسی حالت میں جو کچھ فردوسی کی نسبت کہا گیا وہ محمود کو یقین آگیا اور سنا گیا ہے کہ دن بدن محمود برافروختہ ہوتا جاتا تھا اور اس کی برافروختگی حقیقت میں بے بنیاد نہ تھی۔ محمود نے جیسا سراج الدین نے لکھا ہے۔ فی شعر ایک اشرفی مقرر کرنا یہ تو ایک معمولی صلہ اور بہانہ تھا لیکن اس کے علاوہ جو غیر معمولی صلے بعد از اں فاضل شاعر پر بخشے جاتے ان کا حساب پہلے ہی سے کرلیا تھا اور کئی اپنی سواری کے عربی گھوڑے دو ہاتھی معہ ساز و سامان کے شاعر کے دینے کے لئے پہلے ہی سے نامزد کر رکھے تھے۔ لیکن بدقسمتی اس کے سر پر منڈلا رہی تھی اور اس نے فاضل شاعر کو آخرکار ذلیل و خوار کیا۔
عظیم سمرقندی نے اس معاملہ میں فردوسی کی بابت اچھا ریمارک پاس کیا ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے "فردوسی کا اپنی بیش بہا نظم کا محمود سے چھپا کر فخر الدولہ دیلمی کو بطور نذرانہ کے بھیجنا اور اس سے صلہ کی امید کرنی پوشیدہ گویا محمود کی پرجلال شان اور لاثانی قدردانی پر ایک سخت حملہ تھا۔ او ضرور تھا کہ قہار سلطان کا غضب انگیز طیش فردوسی کی جان پر ٹوٹ پڑتا اور اس کو بالکل پامال کردیتا مگر اس بہر جاہ و عظمت اور کوہ تحمل و بردباری نے اپنے کو ضبط کیا اور اس خیال کو اپنے دل سے بالکل مٹا دیا۔ لیکن یہ خیال اپنے ہجو لی واقعہ سے پھر تازہ ہوگیا اور اب اس میں برابر ترقی ہونی شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ محمود پورا برافروختہ ہوگیا۔ اور یہ خبر دربار سے سارے شہر میں مشتہر ہوگئی کہ محمود فردوسی سے ناراض ہوگیا ہے۔ ایک دن دربار میں فردوسی کی برائیاں بیان ہورہی تھیں اسی اثنا میں ایک شخص نے یہ کہا "فردوسی کے عقاید کی نسبت جو کچھ رائے زنی اب تک کی گئی ہے وہ صحیح نہیں ہے نہ وہ دہریہ ہے نہ

نسلی ہے نہ ناقصی ہے بلکہ وہ آتش پرست ہے اور اپنے بزرگوں کا عقیدہ چھوڑا
نہیں ہے۔ پھر اس شخص سے ثبوت دریافت کیا گیا تو اس نے یہ کہا۔ فردوسی کا قاعدہ
ہے کہ جہاں یہ آتش پرستوں کا ذکر کرتا ہے تو ان پرزور اور فخریہ اشعار میں ڈھونڈا۔
(شاہ کیخسرو کہتا ہے)

جہاندار پور سیاوش منم | ز تخم کیاں شاہ روئیں تنم
نبیرہ جہاندار کاؤس کے | دل افروز و پردانش و نیک پے
زمادر ہم از تخم افراسیاب | کہ با خشم او کم شدے خورد و خواب
نبیرہ فریدوں و پور پشنگ | کہ بر پیل و شیراں جہاں کردہ تنگ

اس کے علاوہ اور بہت سی جگہ شاہنامہ میں کسی نہ کسی پہلوان کی زبانی اپنی گزشتہ
قوم کی تعریف کروا دیتا ہے جیسے کہ اسکی اسفندیار کی زبانی کہتا ہے۔

نژاد من از تخم گشتاسپ است | کہ گشتاسپ خود پور لہراسپ است
کہ لہراسپ بُد پور آں زندشاہ | کہ او را بُدے آنزماں تاج و گاہ
بداد ر نژاد گوہر کے پشین | کہ کردی پشین بر پسر آفریں
پشین بود دن تخمہ کیقباد | ہنرمند شاہے دلش پرنداد
ہمے دل برو تا فریدوں شاہ | کہ اصل کیاں بود و زیبائے گاہ

یہ تو اپنے بزرگوں کی صفات فخریہ اشعار میں بیان کی ہیں لیکن جب مسلمان
عربوں کا ذکر آیا اس حالت میں کہ جب سعد بن وقاص نے قادسیہ کے میدان میں
صف بندی کی اور یزدجرد شاہ ایران کو نامہ بھیجا تو اس آتش پرست شہنشاہ کی
زبانی مسلمان عربوں بلکہ صحابہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت یہ جلے بھنے
اشعار کہتا ہے۔

ز شیر شتر خوردن و سوسمار | عرب را بجائے رسید ست کار
کہ تاج کیاں را کنند آرزو | تفو باد بر چرخ گرداں تفو

حضور خود ملاحظہ فرما سکتے ہیں کہ مسلمان کی قلم سے یہ درشت اور نا ملائم الفاظ کبھی

نہیں نکل سکتے۔ پے در پے کے ان حملوں نے محمود پر اچھا اثر نہ کیا۔ بعد وہ فردوسی سے
کشیدہ خاطر ہوگیا۔ مگر مرحبا اس قدردان سلطان کی متحمل طبیعت پر کہ اس نے پھر بھی
اپنے طیش کو کھلم کھلا کام میں لانا نہ چاہا اور اس کی مروت نے یہ تقاضا نہیں کیا کہ وہ
منہ بمنہ فردوسی سے کچھ کہتا ۔

علاوہ اور حملوں کے جو اس کے عقائد کی نسبت کئے جاتے تھے اس کی نظم پر بھی
نکتہ چینی ہونے لگی اور عین دربار میں اس کی برائیاں نکلنے لگیں۔ کوئی کہتا تھا کہ فردوسی
کی نظم میں حشو بہت ہوتا ہے۔ کوئی کہتا تھا کہ مبالغہ زیادہ ہوتا ہے۔ کوئی کسی محاورہ پر
اعتراض کرتا تھا اور کوئی فصاحت و بلاغت پر۔ کہیں سے دربار میں یہ آواز آئی خلقی "در
سخن او نکتہ و لطیفہ نیست" اس پر سلطان محمود نے یہ کہا "تمام عیب ہی فردوسی کی
شاعری میں ہیں یا کچھ ہنر بھی ہیں" سلطان کا اشارہ پاتے ہی جو لوگ فردوسی کے
معتقدوں میں سے تھے وہ یہ کہنے لگے "قیمت نظم از سخن آسانی فردوسی است" پھر ان
دونوں متضاد گروہ کی چھڑنے لگی۔ کچھ فردوسی کے موافق بول رہے تھے اور کچھ فردوسی کے
خلاف لیکن بحث بڑے مزہ کی تھی۔ جب بڑی دیر تک سر پھٹول (زبانی) ہوتی رہی تو
سلطان نے موافقین سے کہا۔ کہ فردوسی کی کوئی تازہ تصنیف پڑھو ابھی معلوم ہو جائیگا
کہ فردوسی کا کیا پایہ ہے اور آج ہی اس جھگڑے کا فیصلہ ہو جائے (دربار کی طرف
مخاطب ہو کر) میں فردوسی کے مخالفوں کو اجازت دیتا ہوں کہ جاہے جس آزادی سے
وہ اعتراض کریں تاکہ بعد ازاں اُنہیں اطمینان کے ساتھ ثابت ہو جائے کہ ہمارا خیال
غلط ہے یا صحیح۔ دونوں گروہ نے اس سے رضامندی ظاہر کی اور فوراً فیصلہ کرنے
کے لئے مستعد ہو گئے۔ کہیں سلطان کے حکم سے ان لوگوں میں سے ایک شخص
نے جو فردوسی کے موافق تھے یہ اشعار پڑھے جو اپنا نظیر ہر صفت میں کہیں
نہیں رکھتے ۔

اشعار لکھنے سے پہلے دو چار جملوں میں یہ بھی بیان کر دینا چاہئے کہ یہ ایک
کونسے مقام کی ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ ترکی افغانوں کی فوج میں کمانڈر انچیف کاموس

[illegible] کو پیلسون کے مقابلے کے لئے روانہ کیا۔ ایرانیوں کی طرف سے اس کے
مقابلہ کرنے کے لئے رہام روانہ ہوا۔ کچھ دیر کے جنگ کے بعد رہام بھاگ کر اپنی
فوج سے پہاڑ کی طرف جا چھپا۔ یہ دیکھکر ایرانی سپہ سالار طوس بہت آشفتہ ہوا
اسے سخت چشم زخم پہنچا اور عین میدان میں ایک خفت سی ہو گئی۔ اور اس نے اپنے
گھوڑے کو پھیر کر کے چاہا کہ نفس نفیس اشکبوس کے مقابلہ کے لئے روانہ ہو۔ رستم
نے طوس سے کہا تو سپہ سالار ہے تجھے زیبا نہیں ہے کہ تو میدان جنگ میں جائے
تو اپنی سپاہ کو سنبھالے رکھ اور ان کی ہوشیاری سے کمان کر اور مجھے اس کے مقابلہ
کے لئے جانے دے۔ بس یہ حکایت ہے رستم گیا اور اس نے تیر سے اشکبوس کو
مار ڈالا۔ اس واقعہ کو فاضل شاعر اس طرح نظم کرتا ہے جس سے پایا جاتا ہے کہ فردوسی
سے بہتر اور کوئی اس موقع کو زبردست اور لاثانی نظم میں نظم نہیں کر سکتا ۔

وہ اشعار یہ ہیں

تو قلب سپہ را بآئین بدار
من اکنون پیادہ کنم کارزار

یہ کہکر رستم پیادہ اشکبوس کی طرف جھپٹا اور تیر و کمان سے مستعد ہوا کیونکہ اس کا
ارادہ تیر ہی سے ہلاک کرنے کا تھا چنانچہ اس ارادہ کے مطابق رستم نے

بمالید چاچی کمان را بدست — بچرم گوزن اندر آورد شست
ستون کرد چپ را و خم کرد راست — خروش از خم چرخ چاچی بخاست
چو سوفارش آمد بپہنائے گوش — ز چرم گوزناں بر آمد خروش
چو بوسید پیکاں سر انگشت او — گذر کرد از مہرۂ پشت او
بزد تیر بر سینۂ اشکبوس — سپہر آنزماں دست او داد بوس
کشانی ہم اندر زماں جاں بداد — تو گفتی کہ ہرگز ز مادر نزاد

سلطان محمود کو یہ ابیات ایسی بھلی معلوم ہوئیں کہ اس نے بار بار اپنی زبان سے پڑھ
کر فردوسی کی بہت تعریف کی وہ کدورتیں جو فردوسی کی بے اعتدالیوں سے محمود کے

ظاہر ہوتی تھیں بالکل جاتی رہیں اور اس نے تعریف کر کے اپنے اشعار
جوش بیخ میں یہ فقرہ کہا سپہر مرا زکابلستان وزابلستان رستم بس است ایں چنین شاعرے
را زند۔ ہر شخص خیال کر سکتا ہے کہ اتنا بڑا حکمران اور وہ اس قدر شناسی سے تعریف
کرے اس سے زیادہ قدردان کون ہو سکتا ہے۔ ادھر محمود کی فردوسی کی قابلیت پر یہ
فریفتگی اور ادھر فردوسی کی بے اعتدالی کیونکر بمیلہ ہو سکتی +
عظیم سمرقندی اور سر جارج ہملٹن شہ سی بی ایف آر ایس یونانی مورخ نے فردوسی
کے خواب کی نسبت لکھا ہے اور مختلف رائیں ہر شخص نے اس کے خواب پر دی
ہیں لیکن میں فردوسی کے خواب پر کچھ رائے دینا نہیں چاہتا صرف اس کا جواب
نقل کر دیتا ہوں تاکہ ہر شخص اس پر اپنی رائے قائم کرنے کے لئے آزاد ہے +
فردوسی نے جب رستم کی جرات اور دلیری۔ جہانگیری۔ قوت۔ ہمت کے ظاہر کرنے
پر بہت زور لگایا اور اس کو حد تک پہنچا دیا اسی اثنا میں فردوسی نے رستم کو خواب
میں دیکھا کہ دروازہ کھلا اور سے پیادہ آ رہا ہے۔ خود فولادی سر پر ہے۔ زرہ بکتر
پہنے ہوئے وہ ہی چارچی ہیبت ناک کمان ہاتھ میں۔ غرض بالکل اسی صورت سے
وہ اس کے سامنے آیا جو حالت جنگ اشکبوس میں رستم کی بیان کی تھی۔ چہرہ پر
رعب اور خونخواری برس رہی ہے اور ایک عجیب مہیب صورت تھی کہ ایسی کبھی
دیکھی نہ سنی۔ یہ دیکھتے ہی فردوسی اس کے پاس گیا سلام کیا۔ رستم نے نہایت
لطف سے بخندہ پیشانی جواب دیا اور بہت نوازش کی۔ پھر ہنسا اور چند ہی منٹ
کے بعد زار زار رونے لگا اور کہا کہ تیری خدمت کی حق گذاری چاہتا ہوں مگر
میں محض تہی دست ہو گیا ہوں مجبوری میرا اوڑھنا بچھونا ہے حسرت و یاس
باقی ہی میرے ندیم ہیں افسوس ہے کہ میں کچھ نہیں کر سکتا اور کچھ بھی نہ کر سکنے پر روتا
ہوں خیر پھر بھی جو کچھ میری قدرت میں ہے وہ میں تیری خدمت میں پیش کرتا
ہوں گر قبول افتد زہے عز و شرف۔ ہاتھ سے اشارہ کر کے فلاں مقام پر میں نے
ایک دشمن کو قتل کیا تھا جواہرات کا سامان اس کے پاس کثرت سے تھا چونکہ

میں دفن ہے نے لینا مناسب سمجھا اس لئے اس جگہ دفن کر دیا تھا میں
تم سے التجا کرتا ہوں کہ تو اس جگہ سے کھود کر نکال لیجو۔ یہ کہکر رستم نے اسی جگہ ایک
تیر مارا اور کہا کہ وہ جگہ یہ ہے۔ اتنے میں فردوسی کی آنکھ کھل گئی ؛

فردوسی نے اس خواب کی فطرت پر غور کیا تو اسے صرف اپنے ہر لحظہ کے خیالات
کا پرتو معلوم ہوا کیونکہ یہ ظاہر تھا کہ رستم کو دو ڈھائی ہزار برس ہو چکے تھے۔ اتنی
مدت میں ملک کا کیا سے کیا رنگ پلٹ گیا ہوگا صدہا گز مٹی چڑھ گئی ہوگی اور جہاں
ٹیلے اور پہاڑیاں ہونگی وہ مسمار ہو کر زمین کی سطح کے برابر ہو گئی ہونگی۔ پھر کیونکر
ممکن ہو سکتا ہے۔ کہ وہاں رستم کا دبایا ہوا زر و جواہر اب تک موجود ہوگا۔ اس خیال
نے فردوسی کے دماغ میں قوت پکڑی اور اب اسے یہ یقین ہوا کہ اگر میں نے اس خواب
کا بیان کسی سے کیا تو لوگ کہینگے کہ فردوسی کو مالیخولیا ہو گیا ہے۔ گو یہ محض خواب و
خیال تھا پھر بھی فردوسی کے دل میں ایک گرید سی باقی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ اس کا
اظہار پرائیویٹ طور پر کسی سے کروں۔ سوچتے سوچتے فردوسی نے ایاز کو اس راز
کے بوجھ کو اٹھانے کے موزوں پایا۔ حقیقت میں یہ امر ہے کہ ایاز کو فردوسی سے دلی
محبت تھی اور یہاں تک نوبت پہنچی تھی کہ وہ اسے اپنا باپ کہتا تھا اور جہاں تک
اس سے ممکن ہو سکتا تھا فردوسی کی دربار میں سفارش کرتا تھا فردوسی نے خواب دیکھنے
سے تیسرے دن ایاز کو پاس بلایا اور کہا کہ میں تجھ سے اپنا ایک خواب بیان کرنا چاہتا
ہوں لیکن التجا یہ ہے کہ تو کسی سے اس خواب کا اظہار نہ کرے۔ ایاز نے نہایت
استواری سے عہد کیا اور کہا تو خاطر جمع رکھ اس کی بھنک بھی کسی کے کان تک
نہ پہنچے گی۔ یہ سن کر فردوسی نے جو کچھ گذرا تھا سارا حال بیان کر دیا۔ ایاز ایک بہت
پڑھا اور تربیت یافتہ خادم محمود کا تھا۔ اس نے یہ خواب سن کر اپنے منہ بولے باپ
فردوسی کی تردید نہ کی اور وہ فاضل شاعر کی صورت سے پہچان گیا کہ اس کے
چہرہ پر بیچینی سی چھا رہی ہے اور ایک تذبذب سا پایا جاتا ہے۔ شاید یہ اس جگہ
کو کھدوانا چاہتا ہے۔ یہ خیال کر کے اس نے فوراً اقرار کیا اور کہا کہ کیا عجب تیرا خواب

صحیح ہو۔ اپنا کیا ہی سچ ہے۔ اس جگہ کو کھدوا ڈالینگے جو کچھ ہوگا آپ کو کل [illegible] [illegible]
فردوسی کو اطمینان ہوا اور پریشان تذبذب نے اس کے دل و دماغ سے روگردانی کی
ایاز نے پھر یہ کہا کہ ابھی تو موقع نہیں ہے ہاں گرمیوں میں ٹھیک کارروائی
ہو سکتی ہے۔ چونکہ سلطان موسم گرما میں بلندی پر چڑھ جاتے ہیں اور ان کا راستہ
کنارہ مکناباد سے ہوتا ہے اور ایک دن بندگان عالی قیام بھی یہاں کیا کرتے ہیں
اس وقت میں اس جگہ کو کھدوا ڈالوں گا۔ باہم یہ سمجھوتا ہوگیا۔ اور موقع پر وہ جگہ
کھدوائی گئی تو اس میں سے وہی چیزیں برآمد ہوئیں جن کی بشارت خواب میں
رستم نے دی تھی۔ جونہی فردوسی نے ان چیزوں پر نظر کی اس قدر خوش ہوا کہ
اگر لاکھوں روپیہ کوئی بخش دیتا تو اتنا خوش نہ ہوتا۔ بعد ازاں ایاز نے محمود کے آگے
فردوسی کے مشورہ سے وہ کل چیزیں فردوسی کو بخشدیں۔ فردوسی ایک اولوالعزم
اور قانع شخص تھا۔ اس نے ایک پیسہ بھی اس میں سے نہیں لیا اور اس کی قیمت
کا زر مسکوک شعرا کو تقسیم کر دیا۔ اس خواب کی شہرت تمام زمانہ میں ہوئی۔ خواہ
اسے اتفاق کہا جائے یا کچھ سمجھا جائے لیکن یہ واقعہ ہرگز غلط نہیں ہے۔ وہ
مقام اب تک نہایت دلچسپی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ مسٹر ہربرٹ نے اپنے سفر میں
اس مقام کو دیکھا جہاں ایک عمارت پختہ بنی ہوئی ہے اور اس میں ایک پتھر
چسپاں ہے جس پر خواجہ علی کی مفصلہ ذیل ابیات کندہ ہیں۔ خواجہ علی بھی محمود
کے بڑے عہدہ داروں میں تھا اور اس نے فی الفور یہ ابیات موزوں کر کے
وہاں کندہ کرا دئے ہیں +

قطعہ

اے روزگار از چہ سبب بے مروت اند	این سروآساں دہر بدور زمان ما
رستم کہ در نبرد نگفتی کہ از شرف	بہرام بوسہ داد رکاب عنان ما
یک شب بخواب گفت بفردوسی عزیز	در بند حق گذار دل تست جان ما

گلہ مہ نہادہ فلاں جا نہ الیست — از سعی گرز و خنجر گیتی ستان ما
ہر دار زانچہ دست رس او گر نماند — ہر چند شرمسار بود زباں دان ما
از مردگاں حکایت احسان چنیں کنند — بے التماس باوجود بے امکان ما
معلوم ہے شود کہ درین دور دل نواز — این زندگان کم اند از ان مردگان ما
سرگیں سالخوردہ آن خواجگان مصر — بہتر زریش و سبلت این خواجگان ما

اس طرح فردوسی نے ساٹھ ہزار ابیات پر پینتیس برس کے عرصہ میں شاہ نامہ کو ختم کر دیا۔ اس پینتیس برس میں بڑی بڑی اکھیڑ پچھاڑ ہوئی رہی اور محمود کے دل پر کئی کئی بار فردوسی کی طرف سے نقش کدورت جمے اور مٹ مٹ گئے۔ غرض اس عرصہ میں دشمنوں نے بھی بہت بہت کچھ زور مارا لیکن فردوسی کا بال بانکا نہ ہوا۔ اور کبھی ایسا نہ ہوا کہ محمود نے یوں ہی سی بھی فردوسی کو چشم نمائی کی ہو۔ وہ اس کی قدر بخوبی جانتا تھا اور اسے یہ معلوم تھا کہ ان بے اعتدالیوں سے جو فاضل شاعر سے پیش آئی ہیں ان درباری شکایتوں سے جو شب و روز کی جاتی ہیں اس کی لیاقت زیادہ قیمتی ہے۔ گو محمود کا دل اس سے صاف تھا مگر فردوسی درباریوں کے بہکانے سے کھٹک گیا تھا اور وہ یہ جانتا تھا کہ میری ۳۵ سالہ محنت کا مجھے صلہ نہ ملیگا۔ لوگوں کا قاعدہ تھا کہ محمود سے تو فردوسی کی شکایت کرتے تھے اور فردوسی سے محمود کی۔ ان کی یہ شکائتیں محمود کے آگے تو محض بے وقعت ثابت ہوئیں لیکن فردوسی کے دل پر ان کا نقش ہوتا گیا اور ہم افسوس سے دیکھتے ہیں کہ جس شوق سے اس نے شاہ نامہ لکھنا شروع کیا تھا اسی حسرت و ناکامی سے اس کے اختتام پر اسے اپنے دل کی حیرانی اور شکستگی ظاہر کرنی پڑی اور اپنی اس لاثانی تصنیف کو ان بکھے ہوئے اور رقت انگیز اشعار میں ختم کرتا ہے:

چو بگذشت سال از برم شصت و پنج — فزوں کردم اندیشۂ درد و رنج
بتاریخ شاہاں نیاز آمدم — بہ پیش اختر دیر ساز آمدم

بزرگان و با دانش آزادگان ——— نبشتند یکسر همه رایگان
نشسته نظاره من از دورشان ——— تو گفتی بدم پیش مزدورشان
جز احسنت ازیشان نبد بهره‌ام ——— بکفت اندر احسنتشان زهره‌ام
ازان نامور نامداران شهر ——— علی دیلمی بود کو راست بهر
که همواره کارم بخوبی روان ——— همی داشت آن مرد روشن روان
حسین قتیب است آزادگان ——— که از من نخواهد سخن رایگان
ازویم خور و پوشش و سیم و زر ——— ازو یافتم جنبش و پا و پر
نیم آگه از اصل و فرع خراج ——— همی غلتم اندر میان دواج
چو سال اندر آمد بهفتاد و یک ——— همی زیر شعر اندر آمد فلک
سی و پنج سال از سرای سپنج ——— بسی رنج بردم بامید گنج
چو بر باد دادند رنج مرا ——— نبد حاصلی سی و پنج مرا
کنون عمر نزدیک هشتاد شد ——— امیدم بیکبار بر باد شد
سرآمد کنون قصهٔ یزدگرد ——— بماه سفندارمذ روز ارد
ز هجرت شده پنج هشتاد بار ——— که گفتم من این نامهٔ شاهوار
تن شاه محمود آباد باد ——— سرش سبز باد و دلش شاد باد
چنانش ستودم که اندر جهان ——— سخن ماند از آشکار و نهان
مرا از بزرگان ستایش بود ——— ستایش ورا در فزایش بود
که جاوید باد آن خردمند مرد ——— همیشه بکام دلش کار کرد
بدو ماندم این نامه را یادگار ——— بشش بیور ابیاتش آمد شمار
نمانم سراسر دو گفت و شنید ——— چو روز جوانی به پیری رسید
چو این نامور نامه آمد به بن ——— ز من روی کشور شود پر سخن
هر آنکس که دارد هش و رای و دین ——— پس از مرگ بر من کند آفرین
نمیرم ازین پس که من زنده‌ام ——— که تخم سخن را پراگنده‌ام

غرض جب یہ شاہنامہ مکمل ہو کر پیش ہوا تو محمود نے خواجہ حسن میمندی کو حکم
کیا کہ ساٹھ ہزار اشرفیاں فردوسی کو بھجوا دی جائیں اور جو کچھ اس کے علاوہ اس
کے لئے انعامات تجویز ہوئے ہیں وہ عام دربار میں مع خلعت عنایت ہونگے
اور پھر سلطان محمود نے یہ کہا "از ابتدائے ظہور صناعت شعر تا اکنوں کسے
بدیں طرز و اسلوب سخن خوب نگفتہ و ہیچ جوہر لآلی کلام موزون بدیں طرز نسفتہ"
اس کے بعد نہایت جوش میں محمود نے یہ اشعار فردوسی کی توصیف
میں پڑھے:

کہ گوید چنیں نظم چوں صد رواں	کہ گوید چو فردوسی اندر جہاں
رسد صیت و لطفش بچرخ بلند	کہ گفتہ است نظمے چنیں ارجمند
ز انفاس او بوے جاں مے دمد	ز ترکیبش آب رواں مے چکد
دراں دم کہ تیغ زباں برکشید	صف جملہ شاعراں بردرید
بمیدان دانش چو آں پیلتن	ندیدیم نظم آور و تیغ زن
بہ پاشم چو بکشود گنج گہر	کنوں پیلوارش دہم گنج زر

یہ سن کر خواجہ حسن میمندی خاموش ہو رہا اور اس نے اس کے جواب میں
ایک حرف بھی نہ کہا جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ سلطانی حکم کی تعمیل کے لئے
مستعد نہیں۔ محمود کو اس کا یہ سکتہ ناگوار گذرا خفا ہو کر دریافت کیا کہ تو خاموش
کیوں ہو رہا خواجہ نے بکمال انکساری یہ عرض کیا "ہر چند پیلوارے زر در میزان
احسان پادشاہ بہ پشیزے نسنجد و شخص ہمت سلطان در قضائے پہنا در گیہان
نگنجد۔ اما چوں برائے حکمت آرائے عالی مخفی نیست کہ شادی مفرط چوں
غم بے اندازہ ہادم حیات است اکنوں نعوذ باللہ کہ اگر ایں صلہ کہ پادشاہ مقرر فرمود
برسد بلا شک مقتضی او ہلاک او خواہد شد"

چو بگذشت ز اندازہ شادی و غم	رواں تو مند گردد دژم
چو بنیاد عمرے بد اندیش شد	کند آں دو کن بقالیش تباہ

[illegible] محمود [illegible] آگے ساٹھ ہزار اشرفیاں کچھ کل [illegible]
قربانی [illegible] کے ظرف کے آگے بہت زیادہ ہیں ایسا ہو کر [illegible]
ایسا جیسا شاعر [illegible] سے جا مارے۔ محمود نے خواجہ کو جواب دیا کہ تیرا یہ خیال محض
بے بنیاد ہے۔ وہ بڑا حوصلہ مند ہے۔ اسے ساٹھ ہزار اشرفیوں کی ذرا بھی پروا
نہ ہوگی۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ میں اسے زر موعود نہ دوں +

خواجہ نے جب دیکھا کہ یہ افسوں بھی محمود پر نہ چلا تو وہ نہایت پر اثر لہجہ میں
گڑگڑا کر یہ کہنے لگا +

"اے سلطان عالم پناہ حیف باشد کہ روستائی شاعر را شصت ہزار مثقال
طلا ربدہند اگر صلاح بندگاں باشد او را شصت ہزار مثقال نقرہ کفایت است"
یہ سن کر محمود کو یہ خیال ہوا مبادا خواجہ حسن کا کہنا صحیح نکلے مناسب ہے کہ پہلے
اس کو ساٹھ ہزار روپیہ دوں بعد ازاں اس کا باقیماندہ زر موعود حوالہ کروں۔ یہ
سوچ کر محمود نے خواجہ کی رائے سے اتفاق کیا اور حکم دیا کہ ابھی ساٹھ ہزار
روپیہ اس کو بھیج دیئے جائیں خواجہ نے خچروں پر تھیلیاں لدوا کر فردوسی کے
پاس بھیجدیں اور ایاز کو ساتھ کر دیا۔ فردوسی حمام سے غسل کر کے نکلتا تھا کہ
ایاز نے سلام کیا اور وہ روپیہ پیش کئے +

پہلے تو فردوسی بہت خوش ہوا کہ سلطان نے زر موعود بھجوا دیا لیکن جب
اسے معلوم ہوا کہ اس میں ترمیم ہوئی ہے۔ اس نے نہایت افسوس سے ٹھنڈا
سانس بھر کر ایاز سے یہ فقرہ کہا "سلطان نہ چنیں فرمودہ بود" ایاز نے کہا "اصل
میں سلطان کا قصور نہیں ہے یہ خواجہ حسن میمندی کی بدمعاشی ہے" جو کچھ
اس نے سلطان سے گفتگو کی تھی سب بیان کر دی۔ جب فردوسی سن چکا اس
نے بیس ہزار ایاز کو مرحمت کئے۔ شربت فروش سے بیس ہزار روپیہ کی قیمت
میں ایک پیالہ شربت کا لیکر پیا اور نہایت غمگین مگر برافروختہ لہجہ میں یہ الفاظ
زبان سے ایاز کو مخاطب کر کے نکالے +

"بعرض سلطان رساند تا بداند کہ این تا مور رنجیکہ درین کار کشیدم
نہ از بہر درم و دینار بود لطیف آں مہر و آں ہنگام کہ چراغ
ضمیر با تش فکرت افروختہ ام اضعاف و آلاف آں شمع عنبر
سوختہ بلکہ بنا ے آں بر تخلیبند ذکر دنیوس نہادہ و ابواب ثنائے
جمیل برچہرہ احوال خود کشودہ است""

ایاز نے اپنے باپ کی جب یہ ٹوٹی ہوئی تقریر سُنی وہ بہت افسردہ ہوا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ کئی منٹ تک دست بستہ حالت سکوت میں کھڑا رہا اس پہ فردوسی نے کہا: اے پیارے ایاز تو اس کا کچھ غم نہ کھا اور جو کچھ میں نے کہا ہے بایں الفاظ سلطان سے جا کر کہدے اور اپنے دل میں کسی قسم کا ہراس نہ کر۔ ناچار ایاز نے لفظ بلفظ سلطان سے جا کر عرض کر دیا۔ یہ سنکر سلطان ایسا خفیف ہوا کہ جس کا بیان نہیں اور اُسے حسن میمندی پر اتنا غصہ آیا کہ اس کی ہڈیاں چبا جائے۔ اپنی اسی پر غیظ حالت میں حسن میمندی کو بلوایا اور یہ گرم گرم الفاظ زبان پر لایا "اے عنیف و مفسد بواسطہ ایں حرکات عرض مارا عرضۂ توبیخ و تشریب شعرا ساختی و بالواع نکوہش و ندام در زبان آں طائفہ انداختی" محمود کی رنگت مارے غضب کے تمتما رہی تھی اور وہ خفت کے مارے عرق عرق ہوا جاتا تھا۔ حسن میمندی ایک چلتا ہوا شخص تھا موقع پر بات بنا دینا یہ اس کے بائیں ہاتھ کا داؤں تھا۔ اس نے محمود کے اس غصہ کی ذرا بھی پروا نہ کی۔ نہ کچھ ہراس دل میں لایا۔ بلکہ نہایت متانت اور سنجیدگی سے یہ جواب دیا "حصلہ پادشاہ از یک درم تا صد درم مساویست اگر مشت خاک از حضرت سلطان بدو فرستادندے بایستے کہ از روئے اعزاز و اکرام آنرا بجائے توتیا در دیدہ کشیدے و بساط رفاعت و حماقت بسر پنجہ ادب و کیاست در نور دیدے۔ چنانچہ ہستاد گفتہ است"

عطا گرچہ اندک دہد پادشاہ ۔۔۔ بہ بسیار لیش کرد باید نگاہ

کہ ہرکس کہ منظور شاہی بود | سزاوار دیہیم گاہی بود
گرت سیل باید ز قطرہ شنو | تو این نکتہ از عین حکمت شنو
زباں را بود قطرہ از ابتدا | ولیکن شود سیل در انتہا"

جب میمندی نے نہایت سنجیدگی سے یہ گفتگو کی تو سلطان پر اس کی اس تقریر نے جادو کا کام کیا۔ سلطان فردوسی سے کالے ناگ کی طرح پلٹ گیا اور اب اسے خیال آنے لگا کہ فردوسی نے میری توہین کی ہے فردوسی کی گذشتہ بے اعتدالیاں سب یاد آگئیں اور اب ان کے نقوش لوح دل پر ابھر آئے۔ سلطان کو یقین ہوگیا کہ فردوسی سخت مغرور اور گستاخ ہے اس خیال نے لمحہ بلمحہ محمود کے دماغ میں ترقی کی اور آخر نہایت غضب انگیز حالت میں اس کی زبان سے یہ نکل گیا "آں قرمطی را بامداد در پاے پیل اندازم و عقوبت او را عبرت سائر بے ادباں سازم"۔

ایاز نے یہ خبر فوراً فردوسی کو پہنچائی کہ کل یہ غضب ہونے والا ہے۔ یہ سنتے ہی فردوسی کے ہوش اڑ گئے اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے اور وہ سناٹے میں دبک رہ گیا کہ اب کیا کروں ایاز نے اسے تسلی دی اور کہا جو کچھ تقدیر میں لکھا ہے وہ ہو کر رہیگا زیادہ غم کرنے سے تدبیر میں بھی ضعف آجاتا ہے۔ جہاں تک ہو کوئی تدبیر کرنی چاہئے شاید کوئی صورت بچاؤ کی نکل آوے۔ فردوسی نے روکھی آواز میں جواب دیا کہ میری آنکھوں کے سامنے تو موت گردش کھا رہی ہے۔ مجھے تو سوائے موت کے اور کچھ دکھائی دیتا نہیں۔ اگر تجھے کوئی تدبیر معلوم ہو تو بتا دے ایاز نے کہا کہ سوا اس کے کوئی تدبیر نہیں ہوسکتی کہ علی الصباح سلطان محمود کے پیروں پر گر پڑ اور گڑگڑا کر اپنے قصور کی معافی چاہ۔ یہ ناممکن ہے کہ تیرا گناہ نہ بخشا جاوے۔ اس سے بہتر اور کوئی تدبیر نہیں ہے۔ دوسرے دن فردوسی نے یہی کیا سلطان نماز فجر پڑھ کر باغ کی روشوں پر ٹہل رہا تھا۔

فردوسی اپنی جائے قیام سے نکل جو اس کی سیرگاہ کے قریب تھی محمود کے قدموں پر گر پڑا اور یہ کہا ؏

حاسدان در حضرت پادشاہ چناں نمودہ اند کہ بندہ از قرامطہ و در واقفہ است حقا کہ خلاف نمودہ اند و بے ادبی کہ عطیہ سلطان لستدم بعنایت سلطان بازبستہ است و بر تقدیر ہر مذہب کہ گویند چوں در ممالک سلطان از ہر طائف گبر و جہود و ترسا ہستند و جزیہ و بدلیاں پادشاہ میدہند ایں بندہ را یکے ازاں طوائف شمارند و خطاب قتل دارد ہاف روح از جان ناتواں بر وانند ؏

چو در ملک سلطان کہ چرخش ستور | بسے ہست ترسا و گبر و یہود
بگزا ایشاں بجزیہ کفایت کنند | زر و مال و خوں شاں حمایت کنند
گرفتند در ظل عدلش قرار | شدہ ایمن از گردش روزگار
چہ باشد کہ سلطان گردوں شکوہ | مرا ہم شمارد یکے از گروہ

محمود کے غصہ پر پھر اس کی قدردانی کے خیال نے غلبہ کیا اور تمام جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ محمود نے اٹھا کر فردوسی کو اپنے گلے سے لگا لیا اور کہا کہ جو سختی تیرے ساتھ ہوئی ہے اس کی میں معافی چاہتا ہوں اور جو بے ادبی تو نے میری کی ہے اسے معاف کرتا ہوں۔ فردوسی نے جب یہ شفقت آمیز فقرے سنے تو بہت ہی ممنوں ہوا اور اب اپنی زندگی کا خوف مطلق جاتا رہا ؏

بہ بوسید فردوسی آنگہ زمیں | بمالید بر خاک راہش جبیں
بدوں رفت انگاہ و رگاہ شاہ | دلے کرد ازاں خطہ آہنگ راہ

سلطان نے بخندہ پیشانی فردوسی کو اطمینان دیکر رخصت کیا۔ فردوسی اپنی قیامگاہ پر آیا اور دل میں کہنے لگا کہ یہاں کا کچھ اعتبار نہیں ہے۔ بکری کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ اگر میں اب کی بچ گیا تو کیا۔ دوبارہ بچنا مشکل ہے۔

دشمن لگے ہوئے ہیں ضرور ہلاک کرکے چھوڑینگے۔ اس لئے یہ موقع بھاگنے کا بہت مناسب دیکھا اور مصمم ارادہ کرلیا کہ غزنی کو ہمیشہ کے لئے الوداع کہے۔ گو محمود نے اس قدر اطمینان دلادیا تھا پھر بھی شاعر کے غصہ کی آگ سرد نہ پڑی تھی۔ وہ محمود کی اس بیقدری پر دانت پیستا تھا۔ حالانکہ محمود پر جو الزام فردوسی لگاتا تھا اس کی ذات ان الزامات سے بالکل بری تھی۔ خیر کچھ ہو فاضل شاعر کو محمود سے دلی نفرت ہوگئی تھی۔ اور اب وہ اس کے دروازہ پر پانی پینا بھی نہ چاہتا تھا۔ اسی کشمکش میں مکان پر آیا اور غلط فہمی سے سخت غصہ کی حالت میں کئی ہزار ابیات جو اس نے بیاض میں شامل نہ کی تھیں پھر چھ چاک کرکے ان میں آگ لگادی ۔

زلال روان بخش این نظم پاک ۔ ۔ ۔ بر آتش فگند و نیاورد باک

اگرچہ شود کشتہ آتش ز آب ۔ ۔ ۔ ولیکن شدہ آب ز آتش خراب

سوائے ایاز کے اور کوئی بھی فردوسی کا ساز دار نہ تھا فردوسی نے شفقت پسندی سے یہ بعید جانا کہ ایاز کو بھی بے اطلاع یہاں سے چلدے چنانچہ اس نے اسیوقت ایاز کو بلاکر یہ کہا۔ یہ موقع میرے لئے بہتر ہے کہ میں اپنی جان بچاکر چلدونگا۔ گو سلطان نے میرا قصور اب معاف کردیا ہے لیکن یہ معافی دیرپا اور قابل اعتبار نہیں معلوم ہوتی۔ اب تو میں اپنی جان بچاکر چلدوں گا اور اگر یہاں سے نہ گیا تو پھر یہ ناممکن ہے کہ اپنی جان ہلاکت سے بچا سکوں۔ فردوسی کا یہ ارادہ سن کر ایاز رونے لگا۔ مگر وہ بیچارہ کیا کرسکتا تھا آخر اسے بھی فردوسی کے ارادہ کی تائید کرنی پڑی۔ فردوسی نے جب ایاز کو راضی دیکھا تو یہ کہا کہ میرے پاس ایک جبہ بھی نہیں ہے کہ رستہ میں کچھ کام آوے اگر تو کچھ مدد کرے تو میں تیرا بہت ممنون ہونگا۔ ایاز نے کچھ جواہرات قیمتی اور زرِ نقد فاضل کو دیا اور ایک عربی گھوڑا شہر سے باہر کسی پوشیدہ جگہ میں کھڑا کردیا۔ شب کو فردوسی بھیس بدلکر شہر سے نکل بھاگا اور پھر اس گھوڑے پر سوار ہوکر

مجالس کی بڑی دیر سے انتظاری کر رہا تھا چلتا بنا۔ اس چلتے وقت ایک بند لفافہ
ایاز کو دیگیا اور یہ کہدیا کہ میرے جانے کے بیس دن بعد یہ لفافہ سلطان کی خدمت
میں پیش کردیجو۔ غزنی کی بڑی مسجد میں جاتے وقت بیتیں دیوار پر لکھہ گیا جو مفصل
ذیل ہیں *

خجستہ درگہ محمود زاولی دریاست — چگونہ دریا کانرا کرانہ پیدا نیست
چہ غوطہا زدم واندراں ندیدم در — گناہ بخت منست ایں گناہ دریا نیست

سربستہ لفافہ کا مضمون فردوسی کا
سفر اور وفات

ایاز گو ایک غلام تھا لیکن شایستہ اور مہذب اس بلا کا تھا کہ بڑے بڑے
امرا اور علما کے بچے اس سے سبق پڑھتے تھے۔ وہ کبھی جھوٹ نہ بولتا تھا اور
نہ کبھی خلاف وعدہ کرتا تھا۔ جو کچھ اس نے وعدہ کرلیا اگر جان بھی جاتی رہنے
کا خوف ہو لیکن اس سے روگردانی نہ کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ محمود کا بہت
پیارا تھا اور محمود اپنے سب غلاموں سے زیادہ اسی کو عزیز رکھتا تھا۔ چونکہ
اس نے فردوسی سے سربستہ لفافہ لیکر وعدہ کرلیا تھا کہ بیس دن کے بعد
سلطان کی خدمت میں پیش کرونگا اس لئے اُسے فرض ہوا کہ وہ اکیسویں
دن ضرور سربستہ لفافہ سلطان کی خدمت میں پیش کرے۔ گو ایاز کو شبہہ تو ہوا تھا
اور اس نے فردوسی کے چلنے کے بعد یہ بھی ارادہ کیا تھا کہ لفافہ کو کھولکر دیکھوں
لیکن اس نے ایمانداری اور کریمی کے خلاف جانا اس کا غالب یقین یہ تھا
کہ ضرور اس سربستہ لفافہ میں کچھ حسن میمندی کی شکایت لکھی ہوگی۔ اور
اپنی بے قصوری کا بیان ہوگا۔ اس کے سوا اور ایاز کے دل میں کوئی خطرہ

گذرا تھا۔ اپنی اپنی بےخبری کی حالت میں اس نے اکیسویں دن فرصت کے وقت وہ سربستہ لفافہ محمود کی خدمت میں پیش کیا۔ محمود نے اس لفافے کو کھول کر دیکھا تو یہ لکھا تھا ۔

ایا شاہ محمود کشور کشائے ۔ ز کس گر نترسی بترس از خدا
کہ پیش از تو شاہاں فراواں بُدند ۔ ہمہ تاجداراں گیہاں بدند
فزوں از تو بودند یکسر بجاہ ۔ بہ گنج و سپاہ و بہ تخت و کلاہ
نکردند جز خوبی و راستی ۔ نگشتند گرد کم و کاستی
ہمہ داد کردند بر زیر دست ۔ نبودند جز پاک یزداں پرست
نجستند از دہر جز نام نیک ۔ وزاں نام جستن سر انجام نیک
ہر آں شہ کہ در بند دینار بود ۔ بنزدیک اہل خرد خوار بود
گر ایدوں کہ شاہی بگیتی تراست ۔ بگوئی کہ ایں خیرہ گفتن چراست
نہ دیدی تو ایں خاطر تیز من ۔ نیندیشی از تیغ خوں ریز من
کہ بد دین و بدکیش خوانی مرا ۔ منم شیر نرمیش دانی مرا
مرا غمزہ کردند کاں بد سخن ۔ بمہر نبی و علی شد کہن
ہر آنکس کہ در دلش کین علیست ۔ ازو در جہاں خوار تر گو کہ کیست
منم بندۂ ہر دو تا رستخیز ۔ اگر شہ کند پیکرم ریز ریز
من از مہر ایں ہر دو شہ نگذرم ۔ اگر تیغ شہ بگذرد بر سرم
مرا سہم دادی کہ در پائے پیل ۔ تنت را بسایم چو دریائے نیل
نہ ترسم کہ دارم ز روشن دلی ۔ بدل مہر جان نبی و علی
چہ گفت آں خداوند تنزیل و وحی ۔ خداوند امر و خداوند نہی
کہ من شہر علمم علیم درست ۔ درست ایں سخن قول پیغمبر است
گواہی دہم کیں سخن رازِ اوست ۔ تو گوئی دو گوشم بر آواز اوست
چو باشد ترا عقل و تدبیر و رائے ۔ بنزد نبی و علی گیر جائے

چو ہوشنگ تھورث دیو بند — منوچہر و جمشید شاہ بلند
چو کاؤس کیخسرو تاجور — چو رستم چو روئیں تن نامور
چو گودرز و کشتاد پور گزیں — سواراں میداں و شیراں کیں
ہماں نامور شاہ لہراسپ را — وزیر سپہ دار گشتاسپ را
چو جاماسپ کاندر شمار سپہر — فروزندہ تر بد ز تابندہ مہر
چو دارائے داراب و بہمن ہماں — سکندر کہ بد شاہ شاہنشہاں
چو شاہ اردشیر و چو شاپور او — چو بہرام و نوشیرواں نکو
چو پرویز ہرمز چو پورش قباد — چو خسرو کہ پرویز نامش نہاد
چنیں نامداراں و گردن کشاں — کہ دادم یکا یک از ایشاں نشاں
ہمہ مردہ از روزگار دراز — شد از گفت من نام شاں زندہ باز
چو عیسے من ایں مردگاں را تمام — سراسر ہمہ زندہ کردم بنام
یکے بندگی کردم اے شہریار — کہ ماند ز تو در جہاں یادگار
بناہائے آباد گردد خراب — ز باران و از تابش آفتاب
پے افگندم از نظم کاخ بلند — کہ از باد و باراں نیابد گزند
بدیں نامہ بر عمرہا بگذرد — بخواند ہر آنکس کہ دارد خرد
نہ زینگونہ دادی مرا تو نوید — نہ ایں بودم از شاہ گیتی امید
بد اندیش کش روز نیکی مباد — سخن ہائے نیکم بہ بد کرد یاد
بر پادشا پیکرم زشت کرد — فروزندہ اخگر چو انگشت کرد
اگر منصفی بود از راستاں — کہ اندیشہ کردی دریں داستاں
بگفتی کہ بن در نہاد سخن — بداد ستم از طبع داد سخن
جہاں از سخن کردہ ام چوں بہشت — ازیں بیش تخم سخن کس نکشت
سخن گستراں بیکراں بودہ اند — سخنہائے اندازہ پیمودہ اند
ولیک ارچہ بودند ایشاں بسے — ہمانا نہ گفتست ازینساں کسے

بسی رنج بردم درین سال سی — عجم زنده کردم بدین پارسی
جهاندار اگر نیستی تنگدست — مرا بر سر گاه بودے نشست
کہ سفلہ خداوند ہستی مباد — جوانمرد را تنگ دستی مباد
بدانش نبد شاہ را دستگاہ — دگرنہ مرا برنشاندے بگاہ
چو دیہیم دارش نبد در نژاد — ز دیہیم داراں نیاورد یاد
اگر شاہ را شاہ بودے پدر — بسر بر نہادے مرا تاج زر
دگر مادر شاہ بانو بدے — مرا سیم و زر تا بزانو بدے
چو اندر تبارش بزرگی نبود — نیارست نام بزرگاں شنود
کف شاہ محمود عالی تبار — نہ اندر نہ آمد سہ اندر چہار
چو سی سال بردم بہ شہنامہ رنج — کہ شاہم ببخشد بپاداش گنج
مرا زیں جہاں بے نیازی دہد — میان یلاں سرفرازی دہد
بپاداش گنج مرا در گشاد — بمن جز بہاے فقاعے نداد
فقاعے بیرزیدم از گنج شاہ — ازاں من فقاعے خریدم براہ
پشیزے بہ از شہریار چنیں — کہ نہ کیش دارد نہ آئین و دیں
پرستار زادہ نیاید بکار — اگر چند دارد پدر شہریار
سر ناسزایاں برافراشتن — و ز ایشاں امید بہی داشتن
سر رشتۂ خویش گم کردنست — بجیب اندروں مار پروردنست
درختے کہ تلخست وی را سرشت — گرش برنشانی بباغ بہشت
ور از جوے خلدش بہنگام آب — بہ بیخ انگبیں ریزی و شہد ناب
سرانجام گوہر بکار آورد — ہمہ میوۂ تلخ بار آورد
بہ عنبر فروشاں اگر بگذری — شود جامۂ تو ہمہ عنبری
وگر تو شوی نزد انگشت گر — ازو جز سیاہی نیابی دگر
ز بدگوہراں بد نباشد عجب — نشاید ستردن سیاہی ز شب

بنا پاک زادہ مدار یدا امید — کہ زنگی بشستن نگردد سپید
زبد اصل چشم بہی داشتن — بود خاک در دیدہ انباشتن
چو پروردگارش چنیں آفرید — نیابی تو بر بند یزداں کلید
بزرگی سراسر بگفتار نیست — دو صد گفتہ چوں نیم کردار نیست
جہاندار اگر پاک نامی بدے — دریں راہ دانش گرامی بدے
شنیدی چو زینگونہ گونہ سخن — ز آئین شاہاں و رسم کہن
دگرگونہ کردی بکامم نگاہ — نگشتی چنیں روزگارم تباہ
ازاں گفتم ایں بیت ہائے بلند — کہ تا شاہ گیرد ازیں کار پند
کزیں پس بداند چہ باشد سخن — باندیشہ از پند پیر کہن
دگر شاعراں را نیازار داد — ہمہ حرمت خود نگہدار داد
کہ شاعر چو رنجد بگوید ہجا — بماند ہجا تا قیامت بجا
بنالم بدرگاہ یزداں پاک — فشانندہ بر سر پراگندہ خاک

کہ یارب روانش باتش بسوز
دل بندہ مستحق بر فروز

جوں ہی محمود نے یہ اشعار ہجو پڑھے جن میں فردوسی نے فحش گالیاں دی تھیں سلطان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور ایاز سے کہا کہ مجھے ان گالیوں کا اتنا صدمہ نہیں ہوا جتنا فاضل شاعر کے آزردہ ہونے نے مجھے صدمہ دیا ہے۔ فوراً حسن میمندی طلب ہوا اور اس کے آگے محمود نے یہ ہجویہ اشعار رکھدئے۔ وہ دیکھتے ہی زرد پڑ گیا اور اب اُسے کوئی جواب نہ آیا۔ آخر رحیم سلطان نے کہا تو جانتا ہے فردوسی نے مجھے یہ گالیاں نہیں دی ہیں بلکہ تو نے دی ہیں۔ کیونکہ اس ساری خرابی کا باعث تو ہی ہوا ہے۔ حسن میمندی کا یہ عالم تھا کہ کاٹو تو خون نہیں تھو۔ اُس نے زیادہ سزا دینی مناسب نہ جانی۔ صرف اپنے ہاں سے اس کا نام کاٹ دیا اور کہا کہ ہماری سرحد میں نہ رہیو۔ اور آپ فردوسی

کی اس تکلیف کی مکافات میں مشغول ہوا۔ یہ محمود کی شائستہ اور کریم طبیعت کا خاصہ تھا کہ ان گالیوں سے بجائے خفا ہونے کے وہ اور شرمندہ ہوا۔ اور اس نے یہ فقرہ سخت رقت انگیز لہجہ میں کہا " فردوسی نے بے انصافی نہیں کی بیشک اُسے تکلیف ہی ایسی پہنچی تھی کہ جس سے اس نے یہ گالیاں مجھے دیں کیا میں اسی قابل تھا کہ اپنے دیرینہ تیس پینتیس برس کے ملازم سے گالیاں کھاؤں نہیں بلکہ شیطان نے (یعنے میمندی نے) مجھے گمراہ کیا " یہاں تو یہ کیفیت ہوئی اور وہاں فردوسی غزنی سے نکل قہستان پہنچا۔ فردوسی پر گو وہ غزنی سے بھاگ کر چلا آیا تھا لیکن انتہا درجہ کا خوف طاری رہتا تھا۔ اور اسے ڈر تھا کہیں مجھے محمود کی خوشامد سے کوئی پکڑ کر محمود کے حوالہ نہ کردے۔ اس کی عمر اسی برس کی ہو چکی تھی اور جو کچھ اسے کرنا تھا۔ وہ کر چکا تھا۔ لیکن وہ اس نظارہ کے دیکھنے کا مشتاق تھا کہ میری شہرت کے ساتھ محمود کی نا انصافی بھی مشہور ہو۔ اور چاروں طرف سے اس پر لعن طعن پڑے میں اپنے کانوں سے سنوں جب فردوسی فیض کے دار الخلافہ قہستان میں پہنچا تو اپنے کو ایک سرائے میں چھپایا۔ سارے دن پڑا رہتا تھا اور شب کو شہر کی سیر کرنے نکلا کرتا تھا۔ فردوسی کی کوشش تھی کہ مجھے کوئی نہ جانے لیکن یہ ممکن نہ تھا۔ آفتاب لاکھ کچھ غلیظ بادلوں میں چھپتا ہے پھر بھی اس کی چمک نہیں رکتی۔ ابھی یہاں فردوسی نے آکر قیام بھی نہ کیا تھا کہ فردوسی کی ناچاقی اور محمود کی بے انصافی کی خبریں منتشر آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی تھیں۔ اور ہر شخص کی زبان پر محمود اور فردوسی کا قصہ تھا ♦

جس سرائے میں فردوسی ٹھیرا ہوا تھا وہاں چند اور بھی لوگ قیام پذیر تھے۔ اور ان لوگوں سے اکثر شہر والے ملنے کے لئے آیا جایا کرتے تھے ایک دن فردوسی اسی جگہ یعنے سرائے کے بیرونی حصہ میں بیٹھا ہوا اپنے گذشتہ اور آیندہ خونی واقعات کی ادھیڑبن میں مصروف تھا کہ اس نے چند

شخصوں کو اپنے معاملہ میں گفتگو کرتے سُنا۔ ایک بولا حقیقت میں فردوسی پر ظلم ہوا دوسرے نے کہا کہ ہاں ظلم تو ہوا لیکن اُس نے بھی بہت بڑی بے اعتدالی کی کہ عطیۂ سلطانی اس حقارت سے شربت فروش اور حمامی کو دیدیا۔ تیسرے نے کہا نہ فردوسی کا قصور ہے نہ سلطان محمود کا یہ سارا قصور حسن میمندی کا ہے۔ جب فردوسی نے یہ گفتگو سنی تو اسے بڑا تعجب آیا کہ میں نے یہ بات زبان سے بھی نہیں نکالی اور ابھی میں غزنی سے چلا آ رہا ہوں مگر میرے آنے سے پہلے ہی سارے شہر میں اڑ گئی۔ اسی اثنا میں ایک شخص نے کہا کہ یہ بھی (فردوسی کی طرف اشارہ کرکے) غزنی سے ابھی آیا ہے اس سے صحیح حالات دریافت ہو جائینگے۔ یہ مشورہ کرکے وہ سب فردوسی کے پاس آئے اور انہوں نے دریافت کیا کہ تجھے محمود اور فردوسی کی رنجش کی بابت کچھ خبر ہے۔ فردوسی نے جواب دیا کہ میں بدنصیب شخص آپ ادھر کا ادھر پیٹ کے دھندہ میں مارا مارا پھرتا ہوں مجھے شاہوں کی باتوں سے کچھ دلچسپی نہیں ہوتی نہ میرے کان تک پہنچ سکتی ہیں۔

یہ خشک جواب سُن کر انھوں نے پھر فردوسی سے کوئی بات نہ کی اور اُٹھ کر اپنی جگہ پر آ بیٹھے۔ گو فردوسی نے یہ کہکر انہیں ٹال تو دیا تھا۔ لیکن ایک ضعیف شخص نے فردوسی کی شستگی اور الفاظ کی بیساختگی سے یہ پہچان لیا کہ یہ کوئی معمولی شخص نہیں ہے ضرور کوئی نہ کوئی پڑھا لکھا اور شریف خاندان کا آدمی ہے۔ اس نے اپنا یہ شبہہ اس وقت اپنے ہی تک رہنے دیا کیونکہ اس نے مناسب نہ جانا کہ اپنا شبہہ ان لوگوں پر ظاہر کرکے اس غریب الوطن شخص کو ایسی حالت میں مصیبت میں ڈالوں کہ جب وہ ان کی صورت سے نفرت کرتا ہے۔ بوڑھا جہاندیدہ اور مردم شناس تھا وہ تیور سے پہچان لیتا تھا کہ یہ شخص کتنے پانی میں ہے اور اس کی کتنی قابلیت ہے۔ ابھی تک اس نے یہ قرار نہیں دیا تھا کہ یہ فردوسی ہے لیکن قیافہ اور گفتگو سے یہ ضرور دریافت کر لیا تھا کہ یہ ہے کوئی

غیر معمولی شخص بغرض شب کو تنہائی کے وقت وہ بوڑھا جو زمانہ کا بہت سرد و گرم
دیکھے ہوئے تھا فردوسی کے پاس آیا اور اِدھر اُدھر کی ایسی دلچسپ باتیں کیں
کہ فردوسی کی طبیعت اچاٹ نہوئی اور وہ بغور اس کی باتیں سنتا رہا۔ اثنائے
گفتگو میں محمود کا بھی ذکر آگیا۔ اس وقت بوڑھے فردوسی کی زبان سے نہایت
گرم گرم الفاظ نکلے۔ وہ سمجھ گیا کہ ہو نہو یہ فردوسی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس بوڑھے
نے اپنے دوست بوڑھے فردوسی سے اقرار کرا لیا کہ میں فردوسی ہوں۔ یہ سنتے
ہی وہ بوڑھا فردوسی کو اپنے گھر لے آیا اور بڑی خاطرداری سے اُسے مہمان رکھا
اور یہ کہدیا کہ تم کچھ فکر نہ کرنا ناصرلک ایسا غیر حمیت شاہ نہیں ہے کہ تجھ ایسے
قابل بوڑھے شخص کو ہاتھی کے پیر سے بندھنے کے لئے دیدیگا۔ ابھی چند ہی روز
فردوسی بوڑھے کے ہاں رہا ہوگا کہ ناصرلک شاہ فیض کو خبر ہوگئی۔ اس نے
نہایت اعزاز سے اپنے دربار میں فردوسی کو بلایا اور سلطانی نوازشیں فرمائیں۔
فردوسی نے کل کیفیت حرف بحرف سنادی۔ ناصرلک کو سخت رنج ہوا اور
حسن میمندی پر کل دربار میں حقارت کے نعرے بلند ہوئے۔ محمود اور ناصرلک میں
باہم بہت بڑا تعلق تھا۔ اس نے فردوسی سے کہا کہ تو مجھ پر نوازش کریگا اگر اب
اپنی زبان شکایت بند کرے۔ یہ ایک لاکھ درم تیری نذر ہے اور تجھ سے التجا کی
جاتی ہے کہ تو سلطان کی نسبت نہ تحریراً نہ تقریراً ایک حرف بھی نہ کہے۔ فردوسی
نے ناصرلک الملقب بہ محتشم کے فرمان کے بموجب قبول کرلیا۔ اور خود ہجویہ
ابیات سے بہت پشیمان ہوا اور اپنے دل میں کہا کہ جب اپنا اور محمود کا انصاف
خدا پر چھوڑ دیا تھا پھر ان ہجویہ بیتوں کی ضرورت ہی کیا تھی۔ خیر اب تو جو کچھ ہونا
تھا ہوگیا۔ اس کی مکافات اب کسی بات سے نہیں ہوسکتی۔ ناچار فردوسی نے
ناصرلک الملقب بہ محتشم کے ذریعہ سے محمود کی خدمت میں مفصلہ ذیل ابیات
کہکر روانہ کیں وہ بیتیں یہ ہیں +

بغزنی مرا گرچہ خوں شد جگر ز بیداد آں شاہ بیداد گر

رسد لطف یزداں بفریاد من　　ستاند بخشر از وداد من

محمود چونکہ ایک با ایمان مسلمان تھا اور کامل طور سے اس کا عقیدہ جزا و سزا پر تھا اسے اس قدر ان اشعار کے پڑھنے سے خوف معلوم ہوا کہ وہ کانپنے لگا اور خدا کے غضب کا فوٹو اس کی آنکھوں کے آگے کھنچ گیا۔ سلطان محمود نے ان لوگوں کو جو فردوسی کے خلاف سازش کرتے تھے اپنے دربار سے نکلوا دیا۔ حسن میمندی پہلے ہی نکالا جا چکا تھا۔ سلطان نے نہایت جذبہ کی حالت میں یہ ارشاد کیا +

چو فردوسی آنمرد والا گہر　　غمیں شد ز میمندی بے ہنر
اذیت بسے زاں فرومایہ دید　　واز وبے سبب رنج و حرماں کشید
طبیعت مکافات آغاز کرد　　سرش بادم تیغ انباز کرد

یہاں محمود تو اپنے کئے کے پچتاوے میں رہا اور وہاں ناصر لک نے فردوسی سے دوستانہ کہا کہ میں سلطان محمود کا خراجگذار ہوں مجھ میں اتنی قدرت نہیں ہے کہ میں تیرے واسطے اس کا مقابلہ کر سکوں گا بہتر ہے کہ تو یہاں سے چلا جا تا کہ میں بہانہ کر سکوں کہ وہ یہاں سے چلا گیا۔ اور اگر اس نے یہ لکھ کر بھیج دیا کہ فردوسی کو یہاں روانہ کرو اس وقت میرے لئے بہت بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑیگا اگر میں نے تمہیں حوالہ کر دیا تو میری حمیت اور انسانیت میں فرق آیا۔ اور جو میں نے نہ دیا تو میرے ملک کی اینٹ سے اینٹ بج جائینگی۔ مناسب یہی ہے کہ اے فاضل شاعر تو یہاں سے چلا جا +

فردوسی نے بھی مناسب جانا کہ میں فیض کو چھوڑ دوں اور ایک دن علی الصباح ماژندراں کی جانب روانہ ہوا۔ یہ ملک بھی محمود کے زیر نگیں تھا۔ یہاں قابوس بن شکر بن منوچہر بن شمس المعالی حکومت کرتا تھا۔ ماژندراں کی آب و ہوا فردوسی کو اچھی معلوم ہوئی۔ روپیہ اس کے پاس بیٹھکے کھانے کو بہت تھا۔ اسے یہ فکر لگا ہوا تھا کہ اپنی زندگی میں شاہنامہ پر نظر ثانی کر جاؤں۔ مبادا میرا طائر

حرکت آں عطار او بس شاد شد — از آنجا گہ بسوئے بغداد شد

فردوسی نے دل میں خیال کیا کہ محمود ہی کی سرحدوں میں پھرنا سخت خوفناک ہے مبادا کوئی میرہ محمود کی خوشامد سے مجھے پکڑ کر غزنی روانہ کر دے تو مفت میں سفید ڈاڑھی خاک و خون میں لوٹے گی۔ یہ خیال فردوسی کا شکستہ خاطری کی وجہ سے اور بھی دماغ میں گردش لگا رہا تھا۔ ورنہ محمود کی مہربانی اور تحمل میں کبھی کلام نہیں ہو سکتا جو اس نے فردوسی کے ساتھ کیا۔ تاہم اسے اپنی زندگی کا بہت خوف تھا۔ گو وہ یہ سن بھی چکا تھا کہ میرے سبب سے حسن میمندی معہ اپنی جماعت کے نکالا گیا لیکن خوف جان سے اس کا اطمینان سخت زوال پذیر ہو گیا تھا۔ اور اب اس نے یہی بہتر جانا کہ یہاں سے بغداد کی طرف چل دو۔ چنانچہ اس نے اپنے منشا کے مطابق سفر کیا اور ایک قافلہ کے ساتھ نہایت آرام سے بغداد کی چار دیواری میں داخل ہوا۔ اس وقت فردوسی کو یہ معلوم ہوا کہ میں امن میں آ گیا کیونکہ یہ وہ جگہ تھی کہ جہاں محمود کے ہاتھ نہ پہنچ سکتے تھے۔ یہاں کی شادابی اور سرسبزی فردوسی کو بھا گئی اور اس نے یہ مصمم ارادہ کر لیا کہ اپنی عمر کا باقی ماندہ حصہ یہیں صرف کر دونگا۔ یہاں فردوسی کسی کو نہ جانتا تھا۔ گو اس کے جاننے والے دربار میں بعض بعض لوگ تھے۔ تاہم وہ اسے پہچان نہ سکتے تھے جب تک کہ وہ خود ہی ظاہر نہ کرے۔ فردوسی چاہتا تو نہ تھا کہ درباری کشمکش میں پڑوں لیکن پھر بھی حکومت اور عزت کی خواہان روح نے اس کی رہنمائی دربار کی طرف کرنی چاہی وہ کئی مہینے تک اجنبیوں کی طرح شہر بغداد میں مقیم رہا۔ ایک دن ایک غزنی کے تاجر سے فردوسی کی ملاقات ہوئی جو اسے خوب پہچانتا تھا۔ وہ دیکھتے ہی فردوسی کو کھل گیا اور اس نے پرشوق جذبہ میں فردوسی کو اپنے گلے لگایا اور بغداد میں آنے پر مبارکباد دی۔ فاضل شاعر نے محمود اور اس کے دربار کا حال دریافت کیا۔ اس نے نہایت خوش ہو کر پہلا یہ جملہ کہا کہ جنہوں نے تیرے خلاف سازش کی تھی

وہ بعد خواجہ حسن میمندی کے دربار سے نکال دیئے گئے۔ یہ سن کر فاضل شاعر
بہت خوش ہوا اور اس ہجو نے جو ہجو سلطان محمود کی کی تھی اس پر اپنی پشیمانی
ظاہر کی۔ مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا اب اس کا بغیر نشانہ کے لگے واپس آنا
ناممکنات سے تھا۔ بعد ازاں وہ تاجر فردوسی کو اپنے گھر لے گیا اور نہایت
خاطرداری سے اس کی تواضع کرنے لگا۔ فردوسی کو یہ بھی اطمینان دیا کہ میں تجھے
وزیر اعظم سے ملوا دونگا اور دربار خلیفہ تک تیری رسائی ہوجائیگی۔ چند روز کے بعد
فردوسی وزیر اعظم کے پاس پہنچا اور عربی زبان کا ایک قصیدہ اس کی مدح میں پیش کیا۔
وہ قصیدہ دیکھتے ہی دنگ رہگیا۔ اس نے اُٹھ کر فاضل شاعر کے لبوں پر بوسہ دیا اور
ہاتھ چوم لئے اور کثرت سے روپیہ اور ایک گراں بہا خلعت انعام میں دی۔
فاضل شاعر یہ لاثانی قدردانی دیکھ کر پھولا نہ سمایا۔ تاہم وہ کدورتیں جن کا اثر ہنوز
فردوسی کی بوڑھی طبیعت پر باقی تھا بالکل جاتی رہیں ہاں اس قدر افسوس ہوا کاش
میں یہیں پیدا ہوتا اور یہیں بڑا ہوتا اور یہیں اپنی لیاقت قربان کردیتا تو آج کو
کہیں کا کہیں مقرر ہوتا۔ یہ پریشانی اور دشت و در چھاننے نہ پڑتے۔ مگر اب کیا
تھا چوراسی برس کی عمر ہوچکی تھی زیادہ روپیہ کی ضرورت تھی نہ جاہ کی۔ فردوسی
جب وزیر کے ہاں سے کامیاب واپس آگیا تو اپنے دوست تاجر سے مشورہ لیا
کہ میں خلیفہ کی خدمت میں یہ شاہنامہ پیش کردوں۔ اس نے کسی قدر تامل کے
بعد یہ جواب دیا۔ میری یہ رائے نہیں ہے مبادا وہ شاہنامہ کو دیکھ کر ناراض
ہوجائے کیونکہ خلیفہ کفار کی بیجا تعریف سے ناراض ہوتا ہے اور شاہنامہ میں
آتش پرست بادشاہوں کے کارنامے ہیں۔ بہتر ہے کہ تو بغداد کی تعریف میں
کچھ اشعار نظم کرکے خلیفہ کی خدمت میں پیش کر۔ وہ زیادہ مناسب اور موزون
بات ہوگی۔

فاضل شاعر کی سمجھ میں اپنے دوست تاجر کی یہ نصیحت بخوبی آگئی اور
وہ سمجھ گیا کہ لائق دوست نے یہ بات بہت سوچ کر بتادی ہے۔ اس لئے [illegible]

گو بغداد میں فردوسی کے داخل ہوتے ہی پہلے غزنی میں خبر تو پہنچ گئی تھی لیکن اس عزت افزائی کی خبروں نے بھی دربار غزنی میں جنم لینا شروع کر دیا تھا۔ محمود کو متواتر یہ خبریں لگ رہی تھیں کہ دربار بغداد میں دربار غزنی پر حقارت کے نعرے بلند ہوتے ہیں اور ہر شخص محمود کی اس ناانصافی پر تف تف کرتا ہے۔ یہ خبریں محمود کے خون میں غضب انگیز جوش برپا کرنے کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی تھیں۔ جوں جوں وہ یہ سنتا تھا کہ فردوسی کی مظلومیت پر افسوس کیا جاتا ہے اور دربار غزنی کے قصائی پنے اور اس صریح ناانصافی پر حقارت کے نعرے مارے جاتے ہیں تو اسے رنج کے ساتھ غصہ ہوتا تھا۔ اس کی پشیمانی انتہا درجہ پر پہنچ چکی تھی اور وہ سخت پریشان تھا اور پشت دست کاٹتا تھا کہ میں حسن میمندی کے بہکانے میں کیوں آگیا۔ اور کیوں یہ بدنامی مول لی اور کبھی بغداد کے دربار پر غصہ آتا تھا کہ وہ کیوں خواہ مخواہ حقارت کے نعرے بلند کرتا ہے۔ اس پشیمانی اس غصہ اس پچھتاوے کا نتیجہ یہ ہوا کہ محمود نے ایک گرم رقعہ خلیفہ بغداد کو لکھا جس کا مضمون یہ تھا +

"مجھے سن کر افسوس ہوا کہ بلا وجہ ایک خادم اسلام پر نفرین ہوتی ہے یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ فردوسی نے میری نسبت جا کر کیا کہا ہے۔ لیکن ہاں یہ میں ضرور جانتا ہوں کہ اس نے میری شکایت ایسے جلے بھنے الفاظ میں کی ہے۔ کہ دربار بغداد اس سخت بیرحمی کے ساتھ میری مخالفت کرتا ہے۔ میں بغداد کو اسلام کا پائے تخت جانتا ہوں ورنہ اس توہین کا عوض میرا پرشان جلال بخوبی لے سکتا تھا۔ میرا تحفظ مراتب خود میرا جلال کرتا ہے۔ کیا دربار بغداد نے میرے خونخوار لشکر کی میدان ہند میں بہادریاں نہیں سنی ہیں۔ کیا میرے مہیب ہاتھیوں کی دہشت ناک صفیں نہیں دیکھی ہیں۔ جب ہی تو شاید یہ جرات ہوتی ہے کہ عین دربار میں مجھ ایسے خادم کی تذلیل کی جاتی ہے۔ آئندہ مجھے امید ہے کہ میں ایسی ناموزوں خبریں جن کی وجہ سے میں اپنے تحفظ مراتب

کے لئے مستعد ہوں میرے کان میں نہ آہنگی اور میرے فیلان کوہ تمثال کو اپنی سونڈیں
ہلانے اور فنگوش دینے کی تکلیف نہ گوارا کرنی پڑے گی" یہ رقعہ سلطان محمود نے
خلیفہ بغداد کو روانہ کیا۔ خلیفہ نے صرف دو لفظ جواب میں لکھے اور وہ یہ تھے "الم والسلام"
جوں ہی محمود نے یہ جواب دیکھا سخت متحیر ہوا کہ ان دو لفظوں میں اتنے بڑے نامہ
کا جواب کیونکر ادا ہو گیا۔ جب زیادہ تامل کیا گیا تو معلوم ہوا کہ خلیفہ بغداد نے ہاتھیوں
کے جواب میں لکھا تھا +

الم تر کیف فعل ربک باصحاب الفیل

یہ اشارہ ہے اس واقعہ کی طرف کہ جب یمن کا وایسرائے مکہ پر اپنے ہاتھیوں کی
فوج لیکر چڑھ آیا تھا اور خدا نے ابابیلوں کو حکم کیا تھا کہ اپنی چونچوں میں کنکر لیکر اصحاب فیل
پر ڈالو۔ چنانچہ جو کنکری پڑتی تھی۔ وہ سوار کے سر پر پڑکر ہاتھی کے پیٹ میں سے
نکل جاتی تھی غرض ابابیلوں نے بہت بڑی ہزیمت اصحاب فیل کو دی تھی۔ اس
کی مفصل کیفیت اور سچی حقیقت اپنی کتاب سیرت محمدؐ میں لکھ چکے ہیں۔ یہی اشارہ
خلیفہ بغداد کا بھی تھا کہ تمہارے ہاتھیوں کی بھی وہی نوبت ہوگی کہ جو اصحاب فیل
کے مہیب جانوروں کی ہوئی تھی۔ یہ دو لفظی جواب دیکھ کر محمود بہت خوش ہوا
اس نے ایک نامہ بھیجکر خلیفہ سے معافی مانگی اور لاکھوں روپیہ کے تحفے تحایف
خلیفہ بغداد کی خدمت میں بھیجے +

خلیفہ نے سلطان محمود کے نذرانہ کا بہت بڑا حصہ فردوسی کو بخشا۔ وجہ یہ تھی کہ
فردوسی فاضل اور خلیفہ فاضل پرست۔ پھر کیوں نہ عزت اور توقیر فاضل شاعر
کی دربار میں ہوتی۔ اہل ہنر کو ہر جگہ عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے +

ہنر پایۂ مرد افزوں کند	سر از جیب اقبال بیروں کند
ہنر ہر کجا افگند سایۂ	چو ظل ہمایش دہد پایۂ
کجا بے ہنر شد اسیر نیاز	ہنرمند ہر جا بود سرفراز
بسوئے ہنر رئے ازاں تافتم	کہ کام دو گیتی ازو یافتم

بجز از خرد دست پابستہ تو   بدن را زجان آفرینندہ تو

خلیفہ بغداد فردوسی کا دل سے شیدا تھا اور بوڑھے فاضل کی ہر طرح دست گیری کرتا تھا جو کچھ رنج دربار غزنی سے فردوسی کو پہنچا تھا اس کی مکافات کے علاوہ زبانی اطمینان بھی دیا کرتا تھا۔ پھر فردوسی نے خلیفہ کے اشارہ سے یوسف کا قصہ نظم کرکے پیش کیا۔ خلیفہ کو ازحد خوشی ہوئی اس نے حکم دیا کہ اس کی نقلیں ہو ہو کر جاری محروسہ ممالک میں بھیجی جاویں۔ اور ہر رئیس بحفاظت اسے اپنے پاس رکھے فردوسی کو اب کامل آرام مل گیا تھا اور اس نے اپنے دل میں یہ ارادہ کرلیا تھا کہ بغداد ہی میرا مدفن بنیگا۔ گو اپنے خاص مولد میں جان دینے کی آرزو اس کے دل میں ہمیشہ کی طرح آرہی تھی لیکن بمجبوری اس نے بمشکل اپنے دل کو اس پر مائل کرلیا تھا کہ بغداد سے بہتر اور کوئی جگہ دنیا میں نہ ملے گی جہاں مرد [illegible] میں کیڑے بھی نہیں پڑتے اور یوں ہی خشک ہو جاتا ہے۔ خیر مرنے کے بعد تو جو کچھ ہو آگے سے لیکن زندگی میں فردوسی کی یہ خواہش نہ تھی کہ خلیفہ کا [illegible] ظل ہمایوں چھوڑ کر چلا جاؤں کیونکہ اس نے اسی خلیفہ کے سایہ میں امن دیکھا تھا۔

چو در ظل والی دراجائے شد   چو طوطی بشکر شکر خائے شد
بر آسودہ در ظل امن و اماں   زبیداد سلطان جور تہ ماں

آخر بڑی مدت کے بعد فردوسی کی قسمت پھری اور زمانہ نے چاہا کہ بوڑھا فاضل شاعر اپنے مولد ہی میں جان دے۔ اسی اثنا میں سلطان محمود کو ایک باغی کی سرکشی فرو کرنے کے لئے بذات خود حملہ کرنا پڑا۔ محمود چاہتا تھا کہ روانہ ہونے سے پہلے دو لفظی جواب ایسا لکھا جائے کہ اس میں کل مطلب آجائے۔ اہل دربار میں سے چند لوگوں نے کہا فردوسی کا یہ شعر کافی ہے۔

اگر جز بکام من آید جواب
من و گرز و میدان افراسیاب

یہ سنتے ہی محمود نے ایک آہ کھینچی اور کہا کہ فردوسی کے اشعار سے تو میں اتنا

پڑا کہ ہوں اور وہ بیچارہ یوں میرے ڈر سے محروم و خستہ دل ہو کر بھاگ گیا۔ حیف ہے پھر اسی تاسف کناں لہجہ میں یہ الفاظ بھی زبان سے نکالے "آں بیچارہ از ما منتفع نشد واز شعر او از معاصت ما بہرہ توی ور شبستان امال او منعکس نہ گشت" یہ کہکر سلطان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اپنی گذشتہ غلط فہمی پر سخت تاسف کیا اور پھر اسی جوش قدردانی کی حالت میں یہ کہا ◆

سی و دو سال رنج و مشقت کشید — کہ تا نظم شاہنامہ در ہم کشید
پئے غوص در بحر خاطر نمود — در فکر ز اندیشہ بر دل کشود
ہزاراں راہ چنداں نکاور براند — کہ کافور بر مشک عارض نشاند

بعد ازاں سلطان محمود نے اسی وقت حکم دیا کہ ساٹھ ہزار اشرفیاں طوس بھجوا دی جائیں اور اس کو بغداد میں اپنے ہاتھ سے ایک معذرت نامہ بھیجا اور لکھا کہ جو کچھ بے اعتدالی یا غلط فہمی چند خیاطین کے اغوا سے کی گئی اس کی میں تجھ سے معافی چاہتا ہوں اور یہ نذر خود وارسال خدمت ہے مجھے امید ہے کہ تو اسے قبول کریگا۔ خزانہ روانہ ہونے سے پہلے یہ معذرت نامہ فردوسی کو پہنچ گیا اس نے خدا کا شکر کیا کہ اپنی عمر کے آخری دن اپنے وطن طوس میں گزاروں گا۔ ہر چند خلیفہ نے فردوسی کو روکا لیکن شوق وطن رگ و پے میں دوڑ گیا تھا۔ آخر نہایت عزت سے دربار بغداد سے رخصت ہوکر شاداب میں پہنچا۔ ابھی زر موعود کے آنے میں دو ایک دن کا عرصہ تھا کہ فردوسی ایک بڑی شاہرہ میں جا رہا تھا جہاں اس نے ایک نابالغ بچہ کی زبانی یہ شعر سنا جو نہایت ذوق شوق میں پڑھتا چلا جا رہا تھا ◆

شعر

اگر شاہ را شاہ بودے پدر
بسر بر نہادے مرا تاج زر

سنتے ہی فردوسی کے دل پر ایک گھونسا سا لگا اور اپنی عمر عزیز یاں اور اس پیدا تھا وہ سب کی خوش ناکامیوں کی تصویر اس کی آنکھوں کے آگے پھر گئی سانس سنتے اپنی

کا منشا تھا اس کے علاوہ کل باتیں پوری ہوگئیں - ایک مسافرخانہ اس کی یادگار میں بنایا گیا جو اب تک موجود ہے - حکیم ناصر خسرو نے بھی اپنے سفرنامہ میں اس مسافرخانہ کا بیان لکھا ہے جو فاضل حکیم نے خود جا کر ملاحظہ کیا تھا - اس طرح بڑے عظیم الشان شاعر کی زندگی یوں ختم ہوگئی ✤

شاہنامہ

جنہیں فارسی کی شاعری دیکھنے کا مذاق ہے وہ جان سکتے ہیں کہ شاہنامہ سے بہتر فارسی زبان کی دنیا میں کوئی کتاب نہیں لکھی گئی - انگریزی زبان میں فرانسیسی اور اطالیہ زبان میں کئی بار ترجمہ ہو گیا ہے لیکن جو بیوٹی اصلی زبان میں ہوتی ہے غیر زبان میں جانے سے نہیں رہتی - فردوسی جس کو یورپ ہینس نے دوسرا لقب مشرقی ہومر کا دیا ہے - عجیب و غریب لیاقت کا شخص تھا - ہم آگے چل کر اور شعرا کے مقابلہ میں اس کی شاعری کے جوہر دکھائینگے اور اس کی لیاقت کا پورا فوٹو کھینچینگے - لیکن اس جگہ ہم صرف شعرائے نامی مشرقی کی رائے اس کے شاہنامہ کی نسبت تحریر کرتے ہیں اور پھر یہ لکھینگے کہ شاہنامہ ایک جلد میں کیونکر جمع ہو گیا - تمام دنیا میں جنہیں فارسی زبان سے دلچسپی ہے اور جو مشرقی فضلا کی سوانح عمری دیکھنے کا لطف رکھتے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ ہندوؤں کو جیسی اپنی مہابھارت پر فخر ہے مسلمانوں کو اس کے مقابلہ میں شاہنامہ پر ناز ہے - اور جیسے اہل مغرب کو ہومر کی الیڈ پر ناز ہے مسلمانوں کو شاہنامہ پر فخر ہے اور وہ ان دونوں کتابوں کے جواب میں شاہنامہ کو پیش کر سکتے ہیں ✤

اس کی بابت کہ غیر ملک کے مصنفوں کا اس کی نسبت کیسا خیال ہے میں علیحدہ طور پر لکھوں گا - اب صرف اپنے مشرقی شعرا کی عقیدتمندانہ رائے کا خلاصہ کرتا ہوں - جس سے معلوم ہو کہ ہمارے مشرقی شعرا میں کیسی انصاف پرستی تھی - اور وہ فردوسی کو کس پایہ کا جانتے تھے - چنانچہ انوری ابیوردی

حضرت فردوسی

جوایک بہت بڑا حکیم اورشاعر ہوا ہے اور جس کو پیغمبر شعراسے کہا گیا ہے۔ یہ لکھتا ہے +

آفریں بر رواں فردوسی — آں ہمایوں نہاد فرخندہ
او نہ استاد بود ما شاگرد — او خداوند بود ما بندہ

ناظرین بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ فاضل حکیم نے کن مودبانہ الفاظ میں کس صدق دلی سے اپنے بزرگ شاعر کی توصیف کی ہے۔ الفاظ جس قدر رسا ہیں اسی قدر مضمون نہایت بلند پایہ ہے۔ صرف ان دو شعروں میں فاضل فردوسی کی اصلی ماہیت بیان کردی اور اس کی شاعری کی کامل داد دینی یہ حکیم انوری ہی کا حصہ تھا +

مگر مشرقی اخلاقی فلاسفروں کا سرگروہ سعدی جس کی گلستاں بوستاں نے الہامی کتابوں کے پہلو بہ پہلو اشاعت پائی ہے اور جس سے بہتر شاعری کی ماہیت کوئی نہیں جان سکتا وہ یہ تحریر کرتا ہے +

چہ خوش گفت فردوسی پاک زاد
کہ رحمت براں تربت پاک باد

سعدی جیسے عالی قدر اور نیچرل شاعر کی زبان سے فردوسی کی نسبت یہ نکلنا انتہا درجہ کی عظمت اور شوکت ظاہر کرتا ہے۔ پھر فدائے سخن نظامی لکھتا ہے جس کو فردوسی کے مقابلہ میں اپنی شاعری پر بہت بڑا ناز ہے اور جو خضر علیہ السلام کو اپنا استاد بتاتا ہے +

سخن گوئے پیشینہ دانائے طوس
کہ آراست روئے سخن چوں عروس

یہ فردوسی کا بہت بڑا کمال ہے کہ وہ جبراً ایسے مغروروں کی زبان سے اپنی صفت و ثنا کرا لیتا ہے ورنہ ایسے بڑے بڑے شاعر جو اپنے کو خدائے سخن سمجھیں بھلا کسی کی تعریف میں کیوں زبان کھولنے لگے +

پھر ایک اور زبردست شاعر فردوسی کی بابت یوں قلم فرسائی کرتا ہے اور

اس نے نہایت سچ کہا ہے ❖

اے تازہ و محکم تو بنیاد سخن ہرگز نکند چو تو کسے یاد سخن
فردوس مقام باد ت اے فردوسی انصاف کہ نیک دادۂ داد سخن

ان تمام عقیدتمندانہ ریمارکس سے جو فاضل اور نامور مسلم شعرائے گرامی نے کئے ہیں کتنی بڑی قابلیت فردوسی کی جھلکتی ہے۔ اب ہمیں ضرورت نہیں ہے کہ ہم اس کے اشعار کی خوبی بطور خود بیان کریں کیونکہ ہماری تحریر سے زیادہ اعتبار کے قابل مذکورالصدر شعرا کی تحریریں ہیں۔ ہاں آگے جا کے ہم مقابلہ ضرور کرینگے جس سے سمجھنے والا اندازہ کرلیگا کہ زور طبیعت اور بیساختگی کس میں ہے۔ پہلے ہم شاہنامہ کے ایک جلد میں جمع ہونے کی تاریخ لکھتے ہیں پھر اس پر اپنی رائے قائم کرینگے۔ فردوسی نے جب دربار غزنی کو چھوڑا ہے تو ایک جلد شاہنامہ کی مختلف ٹکڑوں میں چھوڑ گیا تھا۔ لیکن سرجارج ہملٹن کی تحریر کے مطابق یہ پایا جاتا ہے کہ جو حصہ شاہنامہ کا وہ نظرثانی کرچکا تھا وہ تو محمود کے پاس رہ گیا تھا لیکن باقیاندہ حصہ وہ اپنے ساتھ لے آیا تھا اور اس نے ماژندران میں آکر اسے درست کیا تھا۔ مگر نظیم سمرقندی سرجارج ہملٹن کے خلاف لکھتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کوئی خاص نسخہ پورے شاہنامہ کا فردوسی نے محمود کو نہیں دیا بلکہ یہ قاعدہ مقرر کر رکھا تھا کہ آٹھ دن میں جتنا تیار ہوا اسی قدر نظرثانی کرکے پیش خدمت میں کر دیا۔ اس طرح کل شاہنامہ سلطان کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اب یہ خبر نہیں کہ آیا فردوسی کے چلا جانے کے بعد پھر شاہنامہ ایک جلد میں کیا گیا یا اس کے ٹکڑے ہی ٹکڑے رہے۔ ان مختلف تحریروں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کل شاہنامہ ایک جلد میں فردوسی کے سامنے جمع نہیں کیا گیا اور اگر جمع بھی کیا گیا تو اس کے بعد وفات ہوا ہوگا۔ اور جس شاہنامہ کی ماژندران میں اس نے نظرثانی کی تھی وہ مسودہ تھا جو دربار غزنی سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ فردوسی کی زندگی ہی میں شاہنامہ کی شہرت تو خوب ہوگئی تھی لیکن

تیار ہوئے ہیں۔ ان میں صرف یہی فرق رہا کہ کسی میں تو کوئی قصہ بڑھ گیا اور
کسی میں گھٹ گیا ۔

دہلی میں شاہ عالم کے وقت میں یہ کوشش کی گئی تھی کہ سب شاہ ناموں کو
جمع کرکے ایک شاہ نامہ مکمل تیار ہو جائے۔ لیکن غلام قادر کی بے اعتدالی سے
دل کے دل ہی میں یہ ارادہ رہ گیا۔ مگر اس کا شرف لکھنؤ کے لئے لکھا تھا
نصیر الدین حیدر نواب اودھ نے خود ہی بغیر کسی کی تحریک کے اس طرف توجہ
فرمائی اور اس اختلاف کو اٹھانا چاہا۔ اور ایک حد تک وہ اس میں کامیاب بھی
ہوا۔ اکثر نسخے شاہ نامے کے جمع کئے گئے اور ان سے ایک مکمل نسخہ مرتب ہوا
ان نسخوں میں پہلا نسخہ مولانا عبد الرحیم بن مولانا عبد اللہ القرشی کے ہاتھ کا
ایرانی خط میں لکھا ہوا تھا۔ اس شاہ نامے میں ۵۱۲۴۳ ابیات تھیں۔ اس پر
سنہ [illegible] لکھے ہوئے تھے۔ نہایت ہی خوش خط تھا اور ہر صفحہ پر سنہری کام نہایت
نفاست سے ہو رہا تھا ۔

دوسرا نسخہ محمد حافظ رہتکی کے ہاتھ کا نفیس اور خوشنما خط میں لکھا ہوا تھا۔ اس
میں کل ابیات ۵۲۰۷۴ پائی گئیں۔ اس پر سنہ [illegible] ہجری مرقوم تھا۔ صحت میں اس کا
نسخہ اچھا تھا۔ غلطی کہیں بھی نہ معلوم ہوئی۔ یہاں تک یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک نقطہ
کی بھی غلطی نہ تھی ۔

تیسرا نسخہ خط نسخ میں دستیاب ہوا۔ خاص سجند کا لکھا ہوا تھا۔ اس کے لکھنے
میں بھی صحت کی پوری احتیاط کی گئی تھی۔ اس شاہ نامہ میں ۵۰۰۰۵ ابیات تھیں
آخر میں سنہ ۸۹۲ ہجری تحریر تھے ۔

چوتھا نسخہ خط ایران میں تھا لیکن پہلے نسخہ کی طرح یہ صحیح نہ تھا اور اس میں ۵۴۴۴۵
اشعار تھے۔ گو خط نہایت پختہ اور باقاعدہ تھا لیکن اکثر جگہ غلطیاں بہت تھیں اور
بعض جگہ تو مصرعے ہی بدلے ہوئے پائے گئے شاید بیتر طبع کاتب نے اپنی لیاقت
کے موافق اس میں اصلاح دی تھی جس سے صاف کھلتا تھا کہ ایک مصرعہ فردوسی

کا ہے اور دوسرا چسپاں کیا ہوا ہے۔ تاہم یہ کہ سکتے ہیں کہ فردوسی کا رنگ نہیں گیا
تھا اور ایسی بدعت اس کی بعض بعض شعروں میں ہوئی تھی۔ اکثر اشعار اس نو کی
اصلاح یا ترمیم سے مبرا تھے ٭

پانچواں نسخہ سید التفات حسین کا جمع کیا ہوا ملا جو انہوں نے بہت محنت سے
جمع کیا تھا۔ یہ خط نسخ میں لکھا ہوا تھا۔ اس کا کاتب حاجی علی المشہور بکاتب تھا۔
جس نے شیراز میں قلمبند کیا تھا اور اس پر عالمگیر کی مہر لگی ہوئی تھی۔ اس میں
۵۲۱۳۵ ابیات تھیں اور اس پر ۸۹۹ھ ہجری مرقوم تھے۔ یہ نسخہ نہایت صحیح
دستیاب ہوا تھا کیونکہ حاشیہ پر کہیں کہیں خود عالمگیر کے دست مبارک کا لکھا ہوا
نصیر الدین حیدر نے ملاحظہ کیا۔ یہ نہایت عزت سے دیکھا جاتا تھا۔ دو وجہ سے یہ
شاہنامہ خاص نصیر الدین حیدر کے پاس رہتا تھا۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ یہ اس شہنشاہ
کے ہاتھوں میں رہ چکا تھا جس کے ایک زمانہ میں ان کے باپ دادا صوبیدار تھے
دوسرے یہ نہایت صحیح اور خوشخط لکھا ہوا تھا ٭

چھٹا نسخہ حاجی محمد قاسم اصفہانی کا جمع کیا ہوا دستیاب ہوا۔ یہ نسخہ اصفہان ہی
میں خط ایرانی میں لکھا گیا اور سعید کاتب نے اس کو تحریر کیا۔ اس نسخہ میں گو صحت
کا احتمال بہت کچھ کیا گیا ہے مگر پھر بھی کہیں کہیں غلطی رہ جاتی ہے۔ بایں ہمہ اس
کی عمدگی اور معتبر ہونے میں شک نہیں۔ اس میں ۸۲۷۹۴ ابیات تھیں اور
۹۸۱ھ ہجری مرقوم تھے ٭

ساتواں نسخہ رومتہ الکبریٰ کا لکھا ہوا مجرۂ قرطاس پر پایا گیا۔ اس نسخہ کی عمدگی
نہ صرف اس کی صحت اور خوشخطی پر منحصر تھی بلکہ حاشیہ پر یہ بھی تحریر تھا کہ فلاں
سنہ میں فردوسی نے اتنے اشعار کہے اور فلاں سال اس قدر۔ اس نسخہ میں کل
۴۲۷۹۵ ابیات تھیں اور ۱۰۲۷ھ ہجری تحریر تھی۔ اور اس پر شاہ ایجی ٹونگ فیلنگ
کی مہر لگی ہوئی تھی ٭

آٹھواں نسخہ رکٹس صاحب سے وصول ہوا تھا جو ایرانی خط میں تحریر تھا اور مشہور

خوشنویس عبدالصمد بن علی محمد الحسینی نے اسے لکھا تھا جیسا اس کا خط پاکیزہ تھا ایسی ہی اس کی صحت خوشنما تھی۔ اس میں ۴۶۹۸۲ ابیات تھیں۔ آخر میں سنہ ۸۲۱ہجری مرقوم تھے یہ نسخہ بھی نہایت معتبر سمجھا گیا تھا +

نواں نسخہ بھی منتظم الدولہ ہی نے بھیجا تھا یہ ایرانی خط میں نہایت صحیح اور پاکیزہ لکھا ہوا تھا۔ خط کی عمدگی صحیح ہونے سے اور بھی زیادہ بڑھ گئی تھی۔ ہر لفظ میں موتی پروئے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ اس میں ۵۵۱۹۲ ابیات تھیں۔ اس پر سنہ ۸۹۱ ہجری مرقوم تھے +

دسواں نسخہ منتظم الدولہ ہی نے بھیجا تھا۔ یہ دوسرا نسخہ ہندوستانی خط میں تحریر تھا۔ خط اور صحت دونوں متوسط المرتبہ تھے۔ یہ دونسخے جن کو نواں اور دسواں لکھا ہے بڑی تلاش کے بعد منتظم الدولہ نے مہیا کئے تھے اور انہوں نے نہایت شوق سے نصیر الدین حیدر کی خدمت میں روانہ کئے تاکہ تکمیل شاہنامہ میں مدد دیسکیں +

گیارھواں نسخہ کتب خانہ ایشیاٹک سوسائٹی یعنے گروہ فضلا متجسسین علوم و رسوم مشرقیہ سے دستیاب ہوا تھا۔ نظام بن محمد شیرازی اس کا محرر تھا۔ ایرانی خط میں نہایت تکلف کے ساتھ لکھا گیا تھا۔ اسے شاہ ناموں کی عروس کہہ سکتے ہیں۔ اس میں ۵۱۱۳۳ ابیات تھیں اور اس پر سنہ ۸۹۹ ہجری تحریر تھے +

بارھواں نسخہ ڈنٹین صاحب نے تحفتاً نصیر الدین حیدر کی خدمت میں روانہ کیا تھا۔ ابن حسن نورالدین اصفہانی نے شیراز میں لکھا تھا۔ صحت و اعتماد میں متوسط الحال۔ اس میں ۵۲۹۱۱ ابیات تھیں اور آخر میں سنہ ۱۰۸۱ ہجری مرقوم تھے +

تیرھواں نسخہ خط ہندوستانی میں دستیاب ہوا جو ہندوستان کی طرح بوسیدہ اور کہنہ تھا اس میں ۵۰۸۲۴ ابیات تھیں اور اختتام پر سنہ ۸۳۰ ہجری مرقوم تھے +

چودھواں نسخہ راہس صاحب نے تحفتاً نواب صاحب کو ارسال کیا تھا یہ نستعلیق خط میں لکھا ہوا تھا اس کا کاتب عبدالکریم بن عبدالنبی جونپوری تھا۔ جیسا یہ خوش خط تھا اسی قدر صحت اور اعتبار میں بھی خوشنما لگتا تھا۔ اس میں ۴۱۷۸۴ ابیات تھیں اور آخر میں سنہ ۱۰۱۰ ہجری تحریر تھے +

پندرھواں نسخہ مسٹر صاحب نے نواب صاحب کو بھیجا تھا۔ اس میں ایک لاکھ ابیات تھیں اور اس کی ابتدا گشتاسب نامہ اسدی سے ہوئی تھی۔ اس کا خط بھی نہایت ہی نفیس تھا اور صحت کا انتظام بھی بخوبی لیا گیا تھا۔ اس پر سنہ ۹۹۹ ہجری مرقوم تھے +

سولھواں نسخہ برفنگ کا جمع کیا ہوا ایرانی خط میں دستیاب ہوا یہ اپنی خوشخطی کے ساتھ قابل اعتبار بھی بہت بڑا تھا۔ اس میں ۴۸۵۶۵ بیتیں مرقوم تھیں سال اختتام سنہ ۸۸۱ ہجری تھے +

سترھواں نسخہ نوشتہ محمد خاں قزوینی نہایت خوشخط قابل اعتماد دستیاب ہوا اس میں۔ ۲۰۴۵ ابیات تھیں۔ یہ خط ایران میں لکھا ہوا تھا۔ لیکن خوش خط ایسا تھا کہ کوئی نسخہ اس سے لگا نہ کھاتا تھا۔ اس پر سنہ ۹۱۰ ہجری مرقوم تھے +

اٹھارھواں نسخہ ایرانی خط میں صحت و اعتماد میں نہایت وقعت کے قابل ابیات ۹۱۱۷۸ جس میں بغداد کی تعریف کی سات ہزار ابیات بڑھی ہوئی تھیں۔ اور یوسف زلیخا کے قصے کا بھی کچھ حصہ اس میں مرقوم تھا (سنہ ۸۱۸ھ)

انیسواں نسخہ ایرانی خط۔ کیکاؤس کی حکمرانی کی ابتدا سے لہراسپ کی سلطنت تک۔ اپنی صحت اور اعتبار میں یہ اور نسخوں سے بہتر تھا۔ اس پر سنہ ۱۰۱۱ھ لکھے ہوئے تھے +

بیسواں نسخہ میرزا علی نے بھیجا تھا جو خط غیر ایرانی میں مرقوم تھا۔ اس میں ابتدائے کتاب سے ہیجر کا نام کیخسرو سے لیکر گودرز کے پاس آنے تک کا ذکر تھا صحت

ہیں لاثانی اعتبار میں وقعت کے قابل ۹۱ ہجری مرقوم تھے ۔

اکیسواں نسخہ ہیں شاہنامہ کی ابتدا سے کیخسرو کے غائب ہونے تک کا حال ہے صحت اور حفظ و تو نہایت قابل تعریف ۔

بائیسواں نسخہ آنریبل مسٹر ملول صاحب نے نواب صاحب کو تحفتاً دیا تھا اس میں سوسن رامشگر کے قصہ سے آخر تک بیان ہے۔ جب ان نسخوں پر نظر کی گئی تو بہت بڑا اختلاف اشعار میں پایا۔ چونکہ یہ کل نسخے بلکہ اس سے بھی دو چند زیادہ نصیرالدین شاہ والئے ایران کے طہرانی کتب خانہ میں نظر سے گذر چکے ہیں اس لئے میں ان کی بابت کچھ تحریر کرنا چاہتا ہوں۔ ایرانی نسخوں سے ہندوستانی نسخے کبھی زیادہ اعتبار کے قابل نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ شاہنامہ کا مخزن خاص ایرانی سرزمین تھی پھر یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ کہ ہم ہندوستانی نسخوں کو ان کے مقابل میں اعتبار کے قابل سمجھ لیں۔ چنانچہ ایک نسخہ میں یہ شعر تحریر ہے ۔

چراغیست مر تیرہ شب را بسیچ
بدتا توانی تو ہرگز مپیچ

اب اگر اس شعر کی نوعیت پر خیال کرتے ہیں تو ایک مصرعہ کو دوسرے سے کچھ مناسبت نہیں معلوم ہوتی۔ مگر چونکہ بیس نسخوں میں اسی طرح اس شعر کو لکھا ہوا دیکھا ہے اس لئے مجبوراً ہم بھی اس پر کچھ ریمارک نہیں کرتے۔ جب بہت کچھ تلاش کیا تو ایک نسخہ میں یہ بیت لکھی ہوئی تھی ۔

چراغیست مر تیرہ شب را بسیچ
نہ بینی تو اندر نہادش مپیچ

یہ شعر نہایت بامعنے اور روشن تر ہے۔ پہلے شعر سے اس میں زیادہ صفائی اور اس کے معنے صریح ہیں لیکن سوائے ایک قلمی نسخہ کے دوسرے میں دیکھنے میں نہیں آیا اگر ہم موجودہ مطبوعہ شاہنامہ پر ایک نظر ڈالینگے تو اکثر مقام سے یہ پایا جائیگا کہ فردوسی کی گویا زبان ہی یہ نہیں ہے اور دوسرے شخص کی تصنیف سے ہے۔ مثلاً قصہ

غرض یہ بہت بڑے شکر کا مقام ہے کہ ہمیں منشی نولکشور کے مطبع کی بدولت پرانی کتابیں کہ جو ہزاروں روپیہ خرچ کرنے کے بعد بھی نہ ملتیں نہایت کم قیمت میں ترتیب دی ہوئی ملتی ہیں۔ یہ اختلاف نصیر الدین حیدر نے واقعی بہت بڑی حد تک مٹایا ورنہ اب تک جتنے شاہ نامے طبع ہوئے ان میں ایک نہ ایک حصّہ کم ہوتا تھا۔ مگر اب جس جگہ شاہ نامے تیار ہوئے ہوئے ہیں یکساں ہوتے ہیں ۱۸۱۱ء میں جو شاہ نامہ کلکتہ میں طبع ہوا تھا اس کی بھی نولکشوری شاہ نامہ سے ہو بہو نسبت تھی اور دونوں میں کچھ فرق نہیں ہے ❖

شاہ نامہ اور سکندر نامہ نظامی

شاہ نامہ محض اپنی پرزور اور زبردست نظم سے یادگار زمانہ نہیں ہے بلکہ یہ دو ہزار برس کے حالات اپنے میں رکھنے سے بھی دیرینہ واقعات کا مخزن ہے۔ جو کچھ فردوسی نے اس میں بیان کیا ہے وہ مبالغہ سے بہت خالی ہے گو اس کا اعتراف کرنا پڑیگا کہ بعض جگہ مبالغہ ضرور ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس کے یہ بھی ضرور یقین کرنا پڑیگا کہ وہ نظامی کی طرح مبالغہ کو اپنا زیور سخن نہ سمجھتا تھا۔ نہ اس کا یہ عقیدہ تھا کہ جب تک مبالغہ ہوگا شعر کا لطف نہ آئیگا۔ اسے اپنے پرزور الفاظ اور عجیب و غریب نشست پر بہت بڑا فخر تھا اور وہ جانتا تھا کہ میرے کلام میں بہت بڑا اثر ہے جس واقعہ کی بلا مبالغہ تصویر کھینچونگا اس کو ایسا ثابت کرکے دکھا دونگا گویا یہ ہو رہا ہے۔ فردوسی نے ہر جگہ یہی التزام کیا ہے اور ہر جگہ اس کی لاثانی شاعرانہ قابلیت اس سے ثابت ہوتی ہے۔ وہ اپنی کتاب میں ایسے الفاظ کم لایا ہے کہ جو رنگینی بڑھا کر عبارات کو فوق البھڑک بنا دیتے ہیں۔ مگر ایک نکتہ چین نظر ضرور ان میں کامیاب ہو کر اس دھوکا دہ پوشاک کو نوچ کھسوٹ کر پھینک دیتی ہے اور بار بار ایسی عبارت سے وہ یوں گویا ہوتی ہے ❖

برستم رکابے رواں کرد رخش — ہم اورنگ پیرائے ہم تاج بخش
شہاں راکہ رسمے کہ آئیں بود — کلید آہنیں گنج زریں بود
جزاوکا ہن تیغ روشن کند — کلید آز و گنج زاہن کند
چو آب زرات آشکارا نواز — چو سرچشمۂ نیل پنہاں گداز
اگر سایہ بر آفتاب افگند — دراں چشمۂ آتش آب افگند
اگر ماہ نورا براستے دہد — زنقص کمالش نجاتے دہد
گر انعام آں برشمارد کسے — بداں تاکند شکر نعمت بسے
زشکر دے آں نعمت افزوں بود — ملے نعمتے بیش ازیں چوں بود
فلک وار برہر کہ بندد کمر — برآب افگند چوں زمینش سپر
بریزد در آشوب چوں میغ او — سر تیغ او از سر تیغ او
ہر انچہ او نمودہ او گہ کارزار — نہ رستم نمودہ نہ اسفندیار
صلاح جہاں آں شب آمد بدید — کہ از مولدش صبح صادق دمید
کجا گام زوجنگ پدرام او — زمیں یافت سرسبزی از گام او
بہر دایرہ کوزدے ترک تاج — زپرکار خطش گرہ کردہ باز
بداں بقعہ کو بارگی تاختہ — زمیں گنج قارون برانداختہ
براں ذرہ کہ اورایت انگیختہ — سر کوتوال از دژ آویختہ

اسی طرح بہت دور تک نظامی نے اپنے ممدوح کی صفت وثنا کی ہے اگر ہم اپنے دل میں صرف یہ خیال کرلیں کہ مشرقی شعرا کا یہ مذاق ہی ہے کہ سوائے جھوٹ کے تودۂ طوفان باندھنے کے اور کچھ اصلیت سے غرض ہی نہ رکھتے تو تو ہمیں خاموش ہوجانا چاہئے۔ لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دوسرا شاعر موجود ہے کہ جو اس سے بہت پہلے زمانہ کا ہے اور جس نے اس بے بنیاد مبالغہ کو ناپسند کیا ہے تو از خود دانائے طوس کی صفت وثنا کرنے پر طبیعت مایل ہوتی ہے۔ سکندر شکوہ نظامی نصرۃ الدین کو کہتے ہیں اگر وہ ذرا بھی غور کرتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ سکندر

معلوم ہوتا ہے کہ اس سے بہتر اس فطرت کا شعر کوئی نہیں کر سکتا۔ مگر جب اس کے مطالب پر نظر کی جاتی ہے تو محض بے معنے معلوم ہوتا ہے۔ یہ مسلم ہے کہ آفتاب کی روشنی دنیا کی زندگی کی باعث ہے۔ آدمی ہو خواہ جانور خواہ پرند بغیر اس کی روشنی کے زندہ نہیں رہ سکتے۔ تو نظامی کے ممدوح کے سایہ میں یہ زبردست ظالمانہ صفت ہے کہ اگر چاہے تو اپنے خنک سایہ سے روشنی کے اس سرچشمہ کو ٹھنڈا کر سکتا ہے کہ جو باعث حیات مخلوق باری تعالےٰ ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ اس کے یہ معنے نہیں ہیں بلکہ یہ معنے ہیں کہ چشمۂ آتش میں آب ڈالنا گویا اسے شرمندگی کے مارے پانی پانی کرنا ہے اور یہ دکھانا ہے کہ سایہ میں صرف وہ روشنی ہے تو چشمۂ آفتاب آتا نہ کہ چشمۂ آتش۔ جب چشمۂ آتش آیا اور اس پر پانی کا گرنا بیان کیا گیا ہے تو ضرور آگ کے بجھنے سے غرض ہے اور یہ محض جنون ماب خیال ہے +

پھر بارہواں شعر دیکھا جائے ؎

اگر ماہ نو را برافشاندے دہد
زنقص کمالش نجاتے دہد

اگر اصل پوچھو تو چاند میں نقص ہوتا ہی نہیں۔ وہ ہمیشہ یکساں حالت میں رہتا ہے۔ یہ ہماری نظروں کا نقص ہے کہ وہ ہمیں گھٹتا بڑھتا نظر آتا ہے۔ کاش اگر نظامی اس جگہ یہ بیان کرتے کہ اگر میرا ممدوح چاہے تو نگاہوں میں وہ قدرت اور تیزی دے سکتا ہے کہ جو چیز کامل چاند دیکھنے کے لئے ہمارے آگے حائل ہو جاتی ہے اس کو بھی چیر کر نکل جائے تو بیشک لطیف معنے پیدا ہو جاتے اور پھر مبالغہ کی بھی شان اس سے نہ بڑھتی جو اس شعر میں موجود ہے +

زیادہ میں ہر شعر پر ریمارک کرنا نہیں چاہتا نہ میری غرض نظامی کے معائب ظاہر کرنے سے ہے۔ چونکہ مجھے خیالات اور شاعرانہ قابلیت کا مقابلہ کرنا۔ اور دکھانا ہے کہ فردوسی اور نظامی میں نیچرل شاعری کا رنگ کس درجہ تک ہے اور ان دو فاضل شعرائے کیا کیا موتی پروئے ہیں۔ ورنہ اس کے علاوہ نظامی وہ شاعر ہے

جہاں تا جہاں باشد اشاہ باد ۔ بلند اخترش افسر ماہ باد
کہ آرایش چرخ گردندہ اوست ۔ بزم اندرون ابر بخشندہ اوست
خرد بست و ہم نیکنامی و داد ۔ جہاں بے سر و افسر او مباد
سپاہ و دل و گنج و دستور ہست ۔ جہاں رزم و بزم اہل شور ہست
یکے فرش گسترده شد در جہاں ۔ کہ ہر گز نشانش نگردد نہاں
کجا فرش را مسند و مرقد است ۔ نشستنگہ فضل بن احمد است
بند خسرواں راچناں کدخدائے ۔ بپرہیز و داد و بدین و برائے
کہ آرام این پادشاہی بدوست ۔ کہ او بر سر نامداراں نکوست
کشادہ زبان و دل و پاک دست ۔ پرستندۂ شاہ یزداں پرست

ان اشعار میں صرف دو تین ابیات مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہیں لیکن جب ہم ان کی اندرونی فطرت پر خیال کرینگے تو معلوم ہوگا کہ در اصل وہ بے ڈھنگا اور بے معنے مبالغہ نہیں ہے۔ بلکہ ہر زبان کا محاورہ ہی ایسا ہوتا ہے۔ عام کیکر خاص سے مراد لیا کرتے ہیں۔ مثلاً ایک شعر یہ ہے "گواہی دہد در جہاں خاک و آب۔ جہاں بر فلک چشمۂ آفتاب" اس شعر کے پہلے مصرعہ میں جہاں میں خاک و آب کا گواہی دینا کہ محمود کی طرح کوئی سلطان جنگ میں نامور نہ ہا اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہے۔ بیشک محمود نے مغرور راجپوتوں سے بڑے بڑے میدان لئے اور جس جگہ اس نے فتح پائی وہ ہی مقام اس بات کا شاہد ہوگا کہ محمود کو یہاں فتح حاصل ہوئی تھی۔ دوسرے مصرعہ میں بادی النظر میں بہت بڑا مبالغہ معلوم ہوتا ہے لیکن اصل یہ ہے کہ یہ مبالغہ خالی از لطف نہیں ہے۔ آفتاب کی روشنی ہی میں کل کام ہوتے ہیں۔ جنگ کے موقع پر آفتاب کی موجودگی خود فتح و شکست کی گواہ بن سکتی ہے۔ پھر دوسرے شعر میں صریح مبالغہ معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ ہے "اگر مہر پاکیں نیامیزدے۔ ستارہ ز خشمش فرو ریزدے" اس میں تو شک نہیں کہ یہ بہت بڑا مبالغہ ہے لیکن ایسا لطیف مبالغہ ہے کہ آج تک کسی شاعر کو نصیب

ہی نہیں ہوا۔ مادہ شہاب ثاقبی کا اٹھنا سفر یعنے کرۂ باد کی سطح پر ایکنٹ کرنا اور سطح ہوا پر پھول جھڑیاں یا ہتابیاں چھوڑنا ہم لوگوں کی زبان میں ستارہ کا ٹوٹنا کہلاتا ہے۔ تو فاضل شاعر یہ لکھتا ہے کہ محمود کا غضب اور لطف دونو ملے ہوئے ہیں غضب کی وجہ سے تو ستارہ اپنی جگہ سے ٹوٹ کر زمین پر گرنا چاہتا ہے اور جب آتش فشاں آہوں سے وہ جلا وطن ہو کر نئے عالم میں آنا چاہتا ہے تو اس وقت رحم محمودی کو حرکت ہوتی ہے اور اس پر ترس کھایا جاتا ہے کہ وہ اپنی جگہ پر چلا جاوے چنانچہ وہ سطح زمین پر نہیں گرتا اور اوپر ہی اوپر غائب ہو جاتا ہے دوسرا لطف اس شعر میں یہ بھی ہے کہ ستارہ کو ایسی جگہ سے لانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ مشرقیوں میں عموماً یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ ستارہ کی گردش سے تمام برائیاں ظہور پذیر ہوتی ہیں گو اسلام نے اس مہمل عقیدہ کی وصوم دھام سے تردید کی ہے باایں ہمہ کروروں غیر اسلام اور بعض بعض اہل اسلام بھی عقیدہ رکھتے ہیں تو ستارہ کو لوگوں کے ستانے کی یہ سزا دی اور جب وہ سزا پا چکا تو اسے معراج بخشی کر کے واپس کر دیا۔ یہ تو باریک خیالی کا لطف آیا تیسرے اس میں بہت بڑا کمال یہ ہے کہ ایک بہت بڑے تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ ہے[1] ملتان کے قریب ایک راجہ چند قصبوں پر حکومت کرتا تھا اس کا نام ستارہ تھا۔ محمود نے ملتان فتح ہونے کے بعد اُسے بغیر ایذا دئے چھوڑ دیا مگر ایک دوسرے موقع پر اس نے محمود کے خلاف بہت کچھ کوشش کی اور مخالف کی ہر طرح سے مدد کی محمود نے غضبناک ہو کر ایک دستہ فوج سے اُسے گرفتار کر کے بلوا لیا۔ اور حکم دیا کہ اس کی مشکیں باندھ کر کنگرۂ قلعہ پر سے نیچے پھینکدو جب لوگ اسے پھینکنے کو لے چلے وہ سخت رو دیا چلایا اور محمود کو اپنی پناہ بنایا محمود نے فوراً رحم کھا کر اُسے چھوڑ دیا*

غرض ان تین چار خوبیوں سے جو اس شعر میں ہیں ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ فاضل شاعر نے کیا ستم برپا کیا ہے اور صرف چند الفاظ میں کتنے کتنے

[1] اڈورڈ کی تاریخ جلد ۲ صفحہ ۱۹۸*

کاش اگر وہ ان حسرت ناکامیوں کا بھی جو بڑھاپے میں ہوا کرتی ہیں نقشہ کھینچتے تو دنیا میں مشرقی و مغربی شعرا میں ان کا ثانی نہ نکلتا پھر بھی جو کچھ لکھا ہے وہ انتہا درجہ تعریف کے قابل ہے لطف یہ ہے کہ مبالغہ کا مطلق نام نہیں اور پھر ہر ہر مصرعہ پر سمجھنے والے پر وہ وجد انگیز حالت طاری ہوتی ہے کہ اس کا مزا وہ خوب ہی خوب جانتا ہے مثلاً اس شعر میں ؎

جوانی شد و زندگانی نماند
جہاں گو ممان چوں جوانی نماند

نظامی نے زمانہ پیری کا اصلی نتیجہ بیان کر دیا ہے۔ یہ اسی شاعر غرا کا کام تھا کہ کن سادے سادے الفاظ میں فطرت کے اس باریک مضمون کو ادا کیا ہے کہ جس میں ہزارہا صفحے سیاہ ہو رہے ہیں ان الفاظ کی سادگی تمام زبانوں کے پرشوکت الفاظ سے اس وقت نمایاں تاباں ہو گئی فصاحت و بلاغت نے ہر ہر لفظ میں جنم لیلیا اور فاضل شاعر نے خصوصاً اس بیان پر قلم توڑ دیا یہی شعر چوٹی کا ہے جس میں پیری کی تمام طولانی اونچ نیچ کا پورا نقشہ کھینچا ہے۔ اس شعر کے علاوہ سب اشعار نہایت لطیف پاکیزہ اور فیکٹس سے پر ہیں مگر جو اس میں خوبی ہے اوروں میں اس درجہ دیکھنے میں نہیں آتی اب میں فردوسی کے وہ اشعار درج کرتا ہوں جس میں اس نے اپنی پیری کی شکایت کی ہے تاکہ معلوم ہو کہ یہ دونوں فاضل شاعر پیری کے بیان میں کیا وزن رکھتے ہیں +

فردوسی

چو آمد بنزدیک سر تیغ شصت	مدہ مے کہ از سال شد مرد مست
بجائے عنانم عصا داد سال	پراگندہ شد مال و برگشت حال
ہمان دیدہ بان بر سر کوہسار	نہ بیند ہمی لشکر بے شمار

سے دیکھا جاتا ہے کہ تمہید ہی کا زور شور معلوم ہوتا ہے اور اصل مطلب ایک ہی شعر میں بیان ہو کر رہجاتا ہے حالانکہ فردوسی کا یہ پیرایہ نہیں ہے وہ جس دھوم سے تمہید اٹھاتا ہے اس سے زیادہ زور شور سے۔ مطلب پر زور دیتا ہے۔ نیچے لکھے ہوے اشعار سے بیک کر یاک کی بخوبی تائید ہوجائیگی جیسے نظامی کہتا ہے ۔

ز روسی برآمد بناورد گاہ — یکے شیر پرطاس روئیں کلاہ
چو کوہے رواں گشتہ بر پشت باد — عجب ہیں کہ برباد کوہ ایستاد
مبارز طلب کرد جولاں نمود — بنام آوری خویشتن را ستود
کہ پرطاسیاں را دریں خام چرم — بہ پرطاسی من نشود پشت گرم
چو تندی کند تندری گوہرم — چو آیم برزم اژدہا پیکرم
پلنگان درم بر سر کوہسار — نہنگان خورم بر لب جویبار
چو شیران بہ پرخاش خو کردہ ام — نو جہاں روبہاں سینہ پروردہ ام
دو شستم بچنگال و سختم بزور — بجنگ درم پہلوے نرہ گور
ہمہ خون خاصت نوشیدہ ام — ہمہ چرم خاصت پوشیدہ ام
سنانم ز پہلو در آید بتاف — دروغے نگویم اینک مصاف
بیاید یکے لشکر از چین و روم — کہ آتش فروزندہ گردد ز موم
مبخشاد یزداں بجاں دو نوں — کہ بخشایش آرد بمن روز خوں
نقلب ملک پیش آں تت یاز — بروں رفت جوشن در ترکتاز
بپرخاش گرداں کشادند چنگ — دراں پویہ کردند لختے درنگ
ز خم شیر پرطاسی خشمناک — جواں ترز رومی درآمد بخاک

پندرہ اشعار میں تیرہ اشعار تو صرف تمہید کے ہیں اور دو پر ہیچے الفاظ میں مطلب کا خاتمہ ہوگیا ہے اگر متوسط درجہ کا شاعر میدان کارزار کو اور بہادروں کی دلبری بیان کرنے کو صرف وہی اشعار پر ختم کر دیتا تو اس قدر خیال کی بات

میں تمہید کے حق کا ایک مصرعہ بھی نہیں ہے +

میں ایک ہی جنگ کے بیان پر قناعت نہ کرونگا بلکہ اور بھی کئی مقام کی مختلف جنگوں کا جو ایک ہی فطرت کی ہونگی مقابلہ کرونگا تاکہ بخوبی ظاہر ہو جائے کہ فردوسی تمہیدی اشعار لانے بہت ہی کم پسند کرتا ہے خواہ جتنا طول طویل بیان کرنا ہو پھر بھی وہ تمہیدی اشعار لانے پسند نہ کریگا۔ گو کہیں کہیں وہ لایا ہے لیکن بہت کم اور اگر ایک آدھ جگہ تمہیدی اشعار ہیں بھی تو انہیں داستان میں شامل نہیں کیا بلکہ انہیں بالکل علیحدہ کر دیا ہے مثلاً سہراب کے قصہ شروع ہونے سے پہلے وہ یہ تمہید لکھتا ہے جو بالکل قصہ سے علیحدہ ہے اور اس میں ملی ہوئی ہے علیحدہ تو یوں ہے کہ ان تمہیدی اشعار کو واقعہ کے اشعار سے کچھ مناسبت نہیں ہے اور شمولیت اس وجہ سے ہے کہ قصہ سہراب میں چونکہ ایک جانگزا جوان موت کا تذکرہ ہے اور وہ بھی باپ کے ہاتھ سے قتل ہونا اور اس تمہید میں موت کی حالت کا فوٹو کھینچا ہوا ہے کہ یہ کسی جوان کو چھوڑتی ہے نہ بچہ کو اس لئے قصہ میں بہت ہی شمولیت کا جزو رکھتی ہے وہ تمہید یہ ہے +

کنوں رزم سہراب رستم شنو — دگرہا شنیدستی ایں ہم شنو

یکے داستانست پر آب چشم — دل نازک از رستم آید بخشم

اگر تند بادی بر آید ز کنج — بخاک افگند نارسیدہ ترنج

ستمگارہ خوانمش ار دادگر — ہنرمند گوئیمش ار بے ہنر

اگر مرگ داد است بیداد چیست — ز داد ایں ہمہ بانگ فریاد چیست

ازیں راز جان تو آگاہ نیست — بدیں پردہ اندر ترا راہ نیست

ہمہ تا در آز رفتہ فراز — بکس وا نشد ایں در آز باز

برفتن مگر بہتر آیدت جائے — چو آرام گیری بدیگر سرائے

اگر مرگ کس را نیو باردے — ز پیر و جواں خاک بسیاردے

ز پهلوی لشکرگه شهریار — برون راند مرکب یکی شهسوار
نه اسپی عقابی بر انگیخته — نه تیغی نهنگی در آویخته
حریر تنش در قبا اگند زرد — کلاهی ز پولاد چون لاجورد
بمیدان در آمد چو عفریت مست — یکی حربهٔ چار پهلو بدست
طریقی برآورده باروس گفت — که خواهی همی لحظه در خاک خفت
ز ریوند ماتند رانی منم — که بازی بود جنگ بانی منم
چو رودسی در رود دید در پیکرش — ز صفرا بگشتن در آمد سرش
شد آگه که رو گشت و نا در داد — نباشد جهان بر دمی مرد داد
عنان سوی لشکرگه خویش داد — هزیمت همی داد چون تند باد
رها کرد حربه سوار دلیر — پس پشت او پشت برکرده شیر
گه بر زده راه بر خار بد لشت — برون شد ز سینه سنان تمار بشت
ز تیزی که شد مرکبش باد پای — رساند آن تن مفته را باز جای
چو دیدندگان اژدهای نبرد — صلیبی کند صلب مردان مرد
برو خویش و بیگانه بشتافتند — صلیبی شده کشته یافتند

ان اشعار میں نظامی نے کس بے مزگی سے روسی کو قتل کرایا ہے پہلے تو ایسے اس قدر چڑھایا کہ بیسیوں کا اس کے ہاتھ سے خون کرادیا اور اس کی بہادری ان پرجوش اور پرزور اشعار میں بیان کی کہ جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کا کوئی ثانی نہیں ہے لیکن افسوس ہے کہ ایسے بہادر کو مخص گنتے کی موت ازندانی کے ہاتھ قتل کرادیا۔ اول تو اس بے بنیاد بندش نے لطف کھو دیا دوسرے ایسے ناممکن الوقوع واقعہ کا باور صنا جو کبھی ممکن نہیں ہوسکتا ایک خدائے سخن کے لئے سخت رکیک بات ہے اسی کے مقابلہ میں ہم فردوسی کے اشعار شیدہ اور کیخسرو کی جنگ کے یہاں لکھتے ہیں جن سے یہ اندازہ ہوگا کہ فردوسی دو بہادروں کو کس طرح لڑاتا ہے اور دونوں کو کیسا جانباز ثابت کرتا ہے (وھوھذا) +

ترا نیز با رزم او پائے نیست — ز ترکاں چنیں لشکر آرائے نیست
نباشد مرا ننگ رفتن بجنگ — پیادہ بسازیم چنگ پلنگ
وزاں سو برشیده شد ترجماں — که دوری گزیں زاد بدگماں
جز از بازگشتن ترا رائے نیست — که با جنگ خسرو ترا پائے نیست
بہنگام کردن ز دشمن گریز — بہ از باتن خویش کردن ستیز
بلاں نامور ترجماں شیده گفت — که آواز مرداں نشاید نهفت
چناں داں که تا من ببستم کمر — ہمے برفرازم بخورشید سر
بدیں زور و [illegible] فرہ و دستبرد — ندیدم [illegible] که نیز گرد
ولیکن ستوداں مرا از گریز — به آید چو گیرم به پیکار ستیز
هم از گردش چرخ برنگذریم — اگر دیدهٔ اژدہا بسپریم
گرا ید مرا هوش بردست اوست — نه دشمن زمن باز دارد نه دوست
ندانستم این زور مردی ز چیست — برین نامور فرهٔ ایزدیست
پیادہ نگردست پایم بدوے — بہ پیکار خوں اندر آیم بجوے
چنیں گفت با شیده شاه جہاں — که اے نامدار از نژاد مہاں
ز تخم کیاں بیگیاں کس نبود — که ہرگز پیادہ نبرد آزمود
ولیکن ترا گر چنیں ست کام — ز کام تو ہرگز نہ پیچم لگام
فرود آمد از پشت شبرنگ شاه — ز سر برگرفت آں کیانی کلاه
بہرام داد آں گرانمایہ اسپ — بیامد بکردار آذرگشسپ
چو از دور دیدش پیادہ پشنگ — فرود آمد از اسپ جنگی نهنگ
بہاموں چو پیلاں برآویختند — ہمے خاک باخون برآمیختند
چو شیده بدید آں برو زور شاه — ہماں ایزدی فر و آں دستگاه
ہمے جست چاره که یابد رہا — دل چاره گر زیں بسازد بہا
چو آگاه شد خسرو از راز وے — وز آں نابر آورده آواز وے

بزور جہاں آفریں کردگار — بزد دست بیجن و نامدار
بکردا یشیر یکہ بر گور مز — زند چنگ دگور اندر آرد بسر
گرفتش بچپ گردن است چپ — برآورد و زد بر زمیں بر ہشپ
ہمہ مہرۂ پشت او ہچو نے — شد از درد ریزان و بشکست پے
یکے تیغ تیز از میاں برکشید — سراسر دل نامور بردرید
بر و کرد جوشن ہمہ چاک چاک
پس انگاہ برتارکش ریخت خاک

ان دونوں فضلا کے طرز بیان سے یہ بخوبی معلوم ہوگیا ہوگا کہ فردوسی جس خوبی اور عمدگی سے جنگ کی ایک ادنےٰ ادنےٰ بات کا فوٹو اتارتا ہے نظامی میں کیا تو یہ قدرت نہیں تھی کہ وہ کل واقعات کا نقشہ کھینچ سکتے یا انہوں نے خود اس ڈھنگ کو پسند نہیں کیا۔ کچھ ہو غرض یہ بات بخوبی ثابت ہوگئی کہ جو قدرت اور طاقت اور زور اور ڈھنگ کہ فردوسی نے حاصل کیا تھا نظامی میں وہ صفت نہ تھی گو میں فصاحت و بلاغت کی نسبت کوئی رائے قائم کرنا نہیں چاہتا لیکن اس قدر ضرور رائے دونگا کہ جو فصاحت فردوسی کی کلام میں ہے نظامی کے کلام میں فصاحت کا وہ وزن نہیں ہے اب میں دوسرے رنگ کی طرف اپنی توجہ مبذول کرتا ہوں اور وہ نامہ نویسی کا رنگ ہے مجھے یہ دکھانا ہے کہ نظامی جب ایک شاہ کو دوسرے شاہ کی طرف سے لکھتا ہے تو کونسا پہلو اختیار کرتا ہے اور کہاں تک واقعات کی پیروی کرتا ہے اور فردوسی کی نامہ نویسی کا اس کے مقابلہ میں کیا رنگ ہے +

نظامی نے ہر جگہ واقعات میں بہت غلطی کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نظامی کو تاریخ کا بہت کم علم تھا۔ آتش پرستوں کے ہاں یہ قاعدہ تھا کہ ہر چیز کے پہلے بسم اللہ کے طور پر خدا کا نام لکھا کرتے تھے لیکن خصوصاً نامہ

تران ہی ناموں کے پہلے یہ مبارک نام لکھا جاتا تھا لہ جو مذہبی ہوتے مثلاً
کتاب وساتیر کے۔ پہلے بخشا ئیندہ کا نام مبارک تحریر ہے یا جب سکندر نے
ایران فتح کیا ہے اور وہ مداین تک پہنچ گیا ہے تو اس کے لئے جو نامہ تیار
ہوا تھا اس کے پہلے بھی بسم اللہ لکھی گئی تھی۔ بت پرستوں میں یہ کہیں دستور
نہ تھا کہ اگر باہم نامہ و پیام ہو تو پہلے خدا کا نام ہو ہاں یہ ضرور تھا کہ مذہبی پیشوا
اپنی کتابوں اور مصنف رسالوں میں صرف دیبیوں کی تعریف کے چند اشعار
لکھ دیتے تھے۔ مگر جس روش کو کہ نظامی نے نامہ نویسی میں اختیار کیا ہے یہ
یونانی بت پرست قوم میں جس میں سکندر تھا رائج نہ تھی نظامی نے بالکل اسلامی
طریقہ اختیار کیا ہے سکندر کی قوم اور ملک کی معاشرت سے انہوں نے کچھ سروکار
نہیں رکھا فردوسی میں یہ بات نہیں ہے اول تو وہ شکل سے نامہ کی ہیڈنگ میں
ایک آدھ حمدیہ شعر لاتا ہے اور وہ بھی نامہ لکھنے والے کے مذہب کے مطابق
زیادہ تمہید ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ وہ پسند ہی نہیں کرتا۔ جو داستان اس نے
شروع کی ہے بس ایک آدہ معمولی شعر لکھ کر شروع کر دی ہے۔ تمہید کو
پرتکلف بنا کر نہیں دکھایا نہ اس مشرقی ہومر کا یہ مذاق تھا +

نظامی کی نامہ نویسی میں پولیٹکل پہلو بہت کم ہوتا ہے یعنے جب وہ کسی شاہ
کی طرف سے کوئی نامہ لکھتے ہیں تو اس میں نہ اکثر ہیونت ہوتی ہے نہ ملکی معاملات
کی پیچیدگی مضمر ہوتی ہے اور نہ سلطنت کا اتار چڑھاؤ پیچ در پیچ عبارت میں دکھایا
جاتا ہے نظامی اس صفائی سے سلطنت کے معاملات کو لکھتے ہیں کہ جیسے ایک
ناتجربہ کار گرانڈیل جوان میدان کارزار میں الٹے سیدھے ہتھیار چلاتا ہے اور
اپنے تجربہ کار دشمن کے آگے اپنی جہالت کو اپنی قوت کے بل پر چھپانا چاہتا ہے
فردوسی میں یہ بات نہیں ہے وہ جب ایک شاہ سے دوسرے شاہ کو نامہ لکھتا
ہے تو وہ وہ پیچیدہ باتیں مکر و فریب کی جو پولیٹکل معاملات اور ملکی انتظامات کی جان
ہیں ایسی چٹکیوں میں بیان کر جاتا ہے کہ قائل کا اصلی عندیہ نہیں معلوم ہو سکتا اگر کوئی

شخص نامہ لے جانے والے کا حال پہلے نہ دیکھے اور صرف اسی نامہ پر اس کا حال جاننا چاہئے تو محض ناممکن ہے کہ اس کی اصلی حالت سے ذرا بھی آگاہ ہو سکے۔ مثلاً جب افراسیاب کی بیرحمیاں حد سے گذر گئیں اور اس نے محض اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے ہمیشہ شکستوں پر شکستیں کھائیں اور آخرکار اس کے تمام رشتہ دار اور بڑے بڑے جان نثار جنرل جو اس کے درحقیقت بہت بڑے قوت بازو تھے میدان کارزار میں ایرانیوں کے مقابلہ میں مارے گئے تو اس نے آخرکار اپنے نواسے کو جو تخت ایران پر جلوہ افزا تھا اور جس کے باپ سیاوش کو یعنے اپنے داماد کو فریب اور بیرحمی سے قتل کر چکا تھا اور نواسا اپنے باپ کے خون بہا اپنے نانا کی جان لینے پر آمادہ تھا تو ایسی حالت میں افراسیاب نے اسے ایک ایسا بیم و رجا کا نامہ لکھا اور وہ مضمون اس میں تحریر کیا کہ جس نے افراسیاب کی گذشتہ عہد شکنیاں نہ دیکھی ہوں اور اس کی ناقابل برداشت بیرحمیوں کا حال نہ سنا ہو وہ افراسیاب کے نامہ کے مضمون پر یہ رائے قایم کر سکتا ہے کہ افراسیاب محض بےگناہ ہے اور کیخسرو یعنے اس کا نواسا بڑا سنگدل ہے۔ یہی بہت بڑی خوبی ہوتی ہے۔ نہ کہ مضمون ایسا ہو کہ جیسے گنوار کا لٹھ ہوتا ہے کہ صاف صاف ہر بات آشکارا ہوتی چلی جائے۔ گو نظامی نے بھی اس نامہ میں جو خاقان چین کی طرف سے سکندر کو لکھا ہے پیچیدہ پولٹیکل مضامین کے بیان کرنے کی کوشش کی ہے لیکن وہ اس عمدگی سے بیان نہ کر سکے کہ جیسے فردوسی بیان کرتا ہے ہم دونوں کے نامے یہاں درج کرتے ہیں جن سے یہ اندازہ ہو جائیگا کہ آیا نظامی نے نامہ لکھنے کا جو ڈھنگ اختیار کیا ہے وہ پسندیدہ ہے یا فردوسی نے جو پولٹیکل چال نامہ لکھنے میں پسند کی ہے وہ قابل وقعت ہے پہلے سکندر کا نامہ کید ہندی کو تحریر کیا جاتا ہے جو نظامی نے لکھا ہے ؎

پس از نام دارندۂ مہر و ماہ	کہ اندیشہ را سوئے اوسیت راہ
خداوند فرمان و فرماں براں	فرستندۂ وحی پیغمبراں

بفرمان او ریز پیچ کبود — بپے داو برنیک نامان درود
سخن راند انگہ کدائے پہلوان — کر پشتت قوی باد و بخت جوان
براں بود رایم کہ عزم آورم — بگوپال باپیل رزم آورم
تمام بگیتی یکے دستبرد — کہ گرد و زپولا دمن کوہ خرد
بہندوستاں در زنم آتشے — ندارم دراں بوم گردن کشے
کمند افگنم بر سر ژندہ پیل — زخون بیخ روئیں برآرم زنیل
ہمہ خاک او را بخوں تر کنم — ہمہ آب رو خاک بر سر کنم
چو تو روے در آشتی داشتی — عناں بر نہ پیچیدم از آشتی
بشیریں سخن ہائے جاں پرورت — خداوند بودم شدم چاکرت

اسیطرح سے سکندر نے کید رائے ہندی کو لکھا ہے۔ نہ نامہ ہے نہ نامہ کی شان ہے کچھ طرز ہی نامہ نویسی کی نہیں پائی جاتی ساری لے بہا گو باتیں ہیں جیسی کوئی اکھڑی اکھڑی گفتگو کر رہا ہے۔ یا منہ در منہ جنگ کے وقت جلدی میں جواب وسوال ہو رہے ہیں اس گفتگو سے جو میدان کارزار کی نظامی نے لکھی ہے اور اس نامہ کی طرز تحریر سے ذرا بھی فرق نہیں ہے اس سے پہلے نظامی نے سکندر کا وہ نامہ تحریر کیا ہے جو ہندوستان پہنچتے ہی اس نے کید رائے ہندی کو بھیجا تھا۔ جو درج ذیل ہے ؛

جریدہ یکے قاصد تیز گام — فرستاد و دادش بہ ہند و پیام
کہ گر جنگ داری بروں کش سپاہ — کہ اینک رسیدم چو ابر سیاہ
دگر بر پرستش میاں بستۂ — چناں داں کہ از تیغ من رستۂ
سر نرگس آنگہ برآید ز خواب — کہ ریزد بروابر بارندہ آب
گل آنگہ عماری درآید بباغ — کہ خورشید سا گرم گردد دماغ
بجوشم بجوشد جہاں از شکوہ — بجنبم بجنبد ہمہ دشت و کوہ
بجائے نخسپد عقاب دلیر — کز انجا تواں ہشتن او را بزیر

گر آنجا ز سر موے انگیختہ است	بدینجا سراز موے آویختہ است
وگر ہست کوہے شما تیغ دار	کند تیغ من کوہ را غار غار
گر از بہر گنج آرم اینجا فریش	بمغرب زر مغربی ہست بیش
گرم ہست بر خوبرویاں شباب	بخوارزم روشن تر از آفتاب
جواہر نخواہم دریں مرز و بوم	کزیں مایہ بسیار دارم بروم
ہند آمدم تیغ ہندی بدست	کباب ترم باید از پیل مست
مخور غبرۂ ہند بے یاد من	کہ ہندی تر از تست پولاد من
چو سر بایدت سر متاب از خراج	وگرنے نہ سر باتو ماند نہ تاج

نظامی کے اس نامہ پر اگر منصفانہ نظریں ڈالی جائینگی تو یہ کھل جائیگا کہ نظامی کو نامہ لکھنے کا ڈھنگ اچھا نہ آتا تھا اب اگر ایک شاہ کسی شاہ کو ایسی لغو شاہانہ باتیں لکھے تو اس کی وقعت ایک مجنوں سے زیادہ نہ سمجھی جائیگی اس طرز تحریر کے علاوہ واقعہ پر خیال کریں تو یہ صحیح نہیں ہے کہاں کید رائے ہندی اور کہاں مہاراجہ ہند اگر نظامی کچھ بھی سکندر کی تاریخ سے واقف ہوتے تو انہیں یہ ضرور معلوم ہوتا کہ جب سکندر نے ہندوستان پر حملہ کیا ہے اس وقت ہندوستان آٹھ سو خودمختار ریاستوں میں تقسیم ہو رہا تھا ان آٹھ سو میں ہر راجہ خودمختار اور آزاد تھا۔ چنانچہ ان میں ایک پورس بھی تھا جو گجرات پر سکندر سے کئی خونریز میدان لڑا تھا پھر میں نہیں جانتا کہ کید ہندی ان آٹھ سو میں کونسا راجہ تھا۔ ہمارے ناظرین شاید اس اعتراض پر یہ کریٹی سائز کریں کہ سکندر نامہ کوئی تاریخ تھوڑی ہی ہے کہ اس پر فیکٹس کے اعتراض ہوتے ہیں وہ تو کمال مشرقی شاعری کا ایک نمونہ ہے تاہم یہ کہ سکتے ہیں کہ اگر واقعات صحیح ہوتے تو کمال شاعری میں کچھ فرق ہو جاتا؟ یا مشرقی نظم کی بیوٹی کم ہو جاتی؟ نہیں ہرگز نہیں؟ اس کی بیوٹی میں بھی کبھی کوئی نقص نہ آسکتا تھا بلکہ اور وہ نا حسن ہو جاتا اور عجیب و غریب تاریخ نظم میں پائی جاتی۔ اگر ہم اس تاریخی نکتہ چینی کو بالکل واپس

سے لیں اور ہرگز اس کا خیال بھی نہ کریں بلکہ سکندر نامہ مشرقی شاعری کا ایک کامل نمونہ سمجھیں پھر بھی تو نظامی کے طرز بیان پر بہت بڑا اعتراض ہوتا ہے کہ اس نے ہر موقعہ پر اسی کے مناسب حال جب معنا میں لانے کی کوشش کی ہے پھر کیا وجہ ہے کہ نامہ کی تحریر اور میدان کارزار کی زبانی گفتگو کو بالکل ملا دیا۔ پھر سب سے زیادہ یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ سکندر نے پرستنا اس کی طرف سے جو نامہ نظامی نے لکھا ہے اس میں پیغمبروں اور وحیوں کا ذکر ہے یہ باتیں صریح فاضل شاعر کی لاعلمی پر دلالت کرتی ہیں۔ اچھا ہم اس غلطی کو بھی نہ دیکھیں اور اسے بھی حسن کلام میں داخل کر لیں جب بھی نامہ کی طرز تحریر ہمیشہ کھٹکتی رہے گی جس کا پیمانہ کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ اب میں فردوسی کا وہ نامہ درج کرتا ہوں جو افراسیاب کی طرف سے جس کا ذکر میں اوپر کر آیا ہوں خسرو کو لکھا گیا ہے۔ اس نامہ سے یہ معلوم ہوگا کہ افراسیاب نے کن پر مکرو فریب پہلوؤں سے اپنی اصلی حالت بھی چھپائی ہے اور اپنی محبت اور ایک رحیم شاہ کی بے مروتی اور ظلم ثابت کیا ہے اس میں ایک شعر بھی ایسا نہیں ہے کہ جس میں گھبراہٹ اور پریشانی پائی جائے کس متانت اور سنجیدگی سے پیچدار پولٹیکل چال کو نظم میں لکھتا ہے +

بہ کیخسرو از من پیام رساں	بگویش کہ گیتی دگر شد بساں
تبیرہ کہ جنگ آورد با نیا	سرش بریدی باشد و کیمیا
چنیں بود رائے جہاں آفریں	کہ گرد جہاں پر ز پرخاش و کیں
سیاوش نہ بر بیگنہ کشتہ شد	ادا آموزگاراں سرش گشتہ شد
گنہ گر مرا بود پیراں چہ کرد	چہ رو ئیں دل پاک فرشید ورد
کہ بر پشت اسپاں بپائیست بیست	پراگندہ خوں بکرد اسپاں مست
در ایدونکہ گوئی کہ تو بیہ تنی	بد اندیش دار تخم اہرمنی
تو ایں کیں بگو در نزو کاوس ماں	کہ پیش من آمد لشکر دماں

تو خویشی و ایشان مرا دشمنند — کنون تا همی جنگ ایشان کنند

نه زان گفتم این کز تو ترسان شدم — دگر پیر گشتم هراسان شدم

همه ریگ دریا همه لشکرند — همان نره شیران و کندآورند

همه آنکه گرزان و هم کوه کنگ — چو دریا کشنده اے پسر روز جنگ

ولیکن همی ترسم از کردگار — ز خون ریختن وز بد روزگار

که چندین سر نامور بیگناه — جدا گردد از تن برین رزمگاه

گر از پیش من برنگردی بجنگ — همانا که آید ترا زین کار ننگ

چو با ما بسوگند پیمان کنی — بکوشی که پیمان ما نشکنی

برین کار باشم ترا رهنمای — که گنج و سپاهت بماند بجای

چو کار سیاوش فرامش کنی — نیا را بتوران سیاوش کنی

بهادر بود جهن و جنگی پشنگ — که در جنگ دریا کند کوه کنگ

بهر آن بوم و برکان ایران تهی — بفرمان کنم آن ز ترکان تهی

ز گنج نیاکان مرا هرچه هست — ز دنیا رو از تاج و تخت نشست

ز اسپ و سلیح و ز بیش و ز کم — که میراث ماند از نیا ز او شم

ز تاج بزرگان و تخت و کلاه — ز چیزے که خواهی ز بهر سپاه

فرستم همه همچنین پیش تو — پسر پهلوان و پدر خویش تو

دو لشکر بر آساید از رنج رزم — همان رزم ما باز گردد به بزم

ور ایدون که جان ترا اهرمن — به پیچد همی تا بپوشی کفن

جز از رزم و خون کردنت رای نیست — بمغز تو پند مرا جای نیست

تو از لشکر خویش بیرون خرام — من از جای خود هم نهم پیش گام

بگردیم هر دو با ورد گاه — بر آساید از جنگ هر دو سپاه

چو من کشته گردم جهان پیش تست — سپه بندگان و پسر خویش تست

دگر تو شوی کشته بر دست من — کسے را نیازارم از انجمن

بیا تا زبیداد شوئیم دست — کہ بیداد نتواں زبیداد رست
چہ بندیم دل در جہاں سال و ماہ — کہ ہم دیو خانہ است ہم غول راہ
جہاں دام خویش از تو یکسر بود — بجرعہ فرستد بساغر برد
چو باراں کہ یک یک مہیا شود — شود سیل و آنگہ بدریا شود
بیا تا خوریم آنچہ داریم شاد — درم بر درم چند باید نہاد
نہنگے بما بر گلو کردہ گیر — ہماں گنج ناخوردہ راخوردہ گیر
ازاں گنج کادرد قارون بدست — سرانجام در خاک بین چوں نشست
چہ باید نہادن دریں خاک دل — کز و گنج قارون فروشد بگل
انساں خشت زریں شداد وعاد — چہ آمد بجز مردن نا مراد
دریں باغ رنگیں درختے درست — کہ ماند از قضائے بتر زن درست

ان اشعار میں نظامی نے دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ کھینچ کر اپنے مشرقی ڈھنگ کی نصیحت کو کام فرمایا ہے اس سے غرض یہ ہے کہ جو کچھ پاس ہو کھاؤ پیو اور مزے کرو اور اپنے سر پر قضا کی چیل منڈلاتی ہوئی تصور کر لی جائے بظاہر یہ نصیحت نہایت پیارے اور پر اثر الفاظ میں معلوم ہوتی ہے لیکن پولیٹکل ایکانمی سے اس کا درجہ بہت دور ہے بلکہ انسانی تمدنی حالت کا خون کرنے والی ہے کیا مرہٹی گو نظیر اکبر آبادی کے اس شعر سے ان شائستہ اشعار کا زیادہ مفہوم ہے؟

چکھ ڈال مال دہن کو کوڑی نہ رکھ کفن کو
جس نے دیا ہے تن کو دیگا وہی کفن کو

اس میں شک نہیں کہ نظامی کی اس تلاش کی نصیحت کا ایک ایک لفظ ساحر سا ہے جس کے سحر زمانہ کا نقشہ بھی کھنچتے جاتے ہیں ایسا دل میں آپ سے آپ کھیا چلا جاتا ہے کہ ایک وجد کی سی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ مگر جب اس کی اندرونی فطرت پر خیال کیا جاتا ہے تو اعلے مطالب سے محض خالی خولی معلوم

ہوتی ہے۔ اس کے مقابل میں فردوسی لکھتا ہے +

بگرد دروغ ایچ گونہ مگرد ۔۔۔ چو گردی بود بخت را روے زرد

دل دیو سا دور دار از شتاب ۔۔۔ خرد باشتاب اندر آید بخواب

بہ نیکاں گرائی بہ نیکی بکوش ۔۔۔ بہر نیک و بد پند دانا نیوش

نباید کہ گردد بگرد تو بد ۔۔۔ کہ از بد ترا بیگماں بد رسد

ہمہ پاک پوش و ہمہ پاک خور ۔۔۔ ہمہ پند ہا یاد گیر از پدر

بہ یزداں پناہے بہ یزداں گرائے ۔۔۔ چو خواہی کہ باشد ترا رہنمائے

جہاں را چو آباد داری بداد ۔۔۔ بود گنج آباد و بخت تو شاد

چو نیکی نماید پاداش کن ۔۔۔ ممال تا شود رنج نیکاں کہن

ہنرمند را شاد و نزدیک دار ۔۔۔ جہاں را بد اندیش تاریک دار

چو ہر کار با مرد دانا سگال ۔۔۔ برنج تن از پادشاہی منال

ہر آنکس کہ باشد ترا زیر دست ۔۔۔ مفرمائے و بینوائی نشست

بزرگان و آزادگانان شہر ۔۔۔ ز نیکیست باید کہ یابند بہر

ز نیکی فرومایہ را دور دار ۔۔۔ بہ بیداد گر مرد بگذار کار

ہمہ گوش و دل سوے درویش دار ۔۔۔ غم کار او چوں غم خویش خوار

چو از خویشتن نامور داد داد ۔۔۔ جہاں گشت از و شاد این تخت شاد

برار ز انیاں گنج بستہ مدار ۔۔۔ بہ بخشائے بر مرد پرہیزگار

وہ ہیچ تکہ دشمن شود دوستدار ۔۔۔ بشورہ زمیں تخم نیکی مکار

گر ایں پند ما را شوی کاربند ۔۔۔ ہمیشہ کلاہت بماند بلند

کہ نیکی دہش نیک خواہ تو باد ۔۔۔ خرد تخت و دولت کلاہ تو باد

مباوت فراموش گفتار من ۔۔۔ وگر دہر نانی ندیدار من

سرت سبز باد و دلت شادماں ۔۔۔ تنت پاک دور از بد بدگماں

ہمیشہ خرد پاسبان تو باد ۔۔۔ ہمہ نیکی اندر گمان تو باد

چو من بگذرم زیں جہان فراخ — برآورد باید مرا خوب کاخ
بجائے کزو دور باشد گزر — نپرد براو کرگس تیز پر

سرآورده برچرخ گرداں بلند
بیالا فزوں باید ازده کمند

ان اوپر لکھے ہوئے فردوسی کے اشعار سے اس کی نصیحت کا وزن معلوم ہوگیا ہوگا دنیا میں جو چیزیں ایسی ضروری ہیں کہ جو دین و دنیا میں کام آنے والی ہیں ان ہی کے حاصل کرنے کی سادہ الفاظ میں نصیحت کی ہے۔ بڑی بڑی اخلاق اور علم تمدن کی کتابیں ان ہی بیش بہا نصایح سے بھری پڑی ہیں لیکن ان طویل طویل تحریروں کے دیکھنے اور ان کے ذہن میں جمانے کے لئے بہت بڑا وقت چاہیئے مگر میں فخر سے کہ سکتا ہوں کہ فردوسی نے چند اشعار میں، بڑے پولٹیکل ایکانمی کے مطالب کو ادا کیا ہے اور وہ پیاری پیاری ضروری ضروری نصایح کی ہیں کہ جو ہر مذہب والے حتے کہ دہریہ کو بھی لازمی ہیں اور بغیر ان صفات کے جن کی طرف فاضل شاعر خیال رجوع کرانا چاہتا ہے انسان انسان نہیں بن سکتا۔

جو کچھ میں نے مقابلہ میں دو فاضل شعرا کے اشعار پیش کئے ہیں امید ہے کہ ان پر زیادہ غور کی جائے گی اور ان ریمارکس کو بغور دیکھا جائیگا جو میں نے اپنے کانشنس کے مطابق نظامی کے اشعار پر کئے ہیں۔ اس سے میری غرض نظامی پر حملہ کرنے کی نہیں ہے بلکہ گنجہ اور شاداب کے رنگ کا مقابلہ کرنا ہے رہا نظامی کے بعض اشعار پر محض اپنی نیک نیتی سے کریٹی سایز کرنا یہ کوئی گناہ نہیں ہے شاید پرانے خیالات کے میانجی جو بچوں کو گلستاں بوستاں اور بڑا تیر مارا تو سکندرنامہ پڑھاتے پھرتے ہیں میری اس تحریر کو دیکھ کر سخت برہم ہوں۔ لیکن مجھے ان کی پرواہ نہیں ہے اور میں اپنے رب سے یہ التجا کرتا ہوں کہ میری یہ کتاب ان کے ہاتھ میں جاوے ہی نہیں۔ میں نے یہ کتاب صرف ان ہی

یکے ہست آدم کہ در عہد او	نکردی کسے از سخن گفتگو
دگر شاعری کردہ حسن رقم	درستے مضموں شکستے قلم
نظامی فرستادۂ آفریں	سخندان اول بدر پسیں
بود ہمچو عیسےٰ مسیحا زماں	دمیدہ است جاں در تن کشتگاں
دو شاہاں ملک سخن یک کلاہ	دو چشم ست اما دو را یک نگاہ
دو طوطی قدس است در یک قفس	دو آواز پیدا ست از یک جرس
دو بلبل بیک باغ نغمہ سرا	بیک سرو دو طوطی خوش نوا

فصاحت بفردوسی آمد غلام
بلاغت بہ نظم نظامی تمام

تمام شد

دیباچہ

بادی النظر میں سوانح عمری یا لائف کے لکھنے سے یہ مقصود ہے کہ اچھے سے اچھے یا بُرے سے بُرے ہیرو کے حالات قلمبند کر کے اُن کو محفوظ رکھا جائے تاکہ موجودہ اور آئندہ نسلیں اُن حالات سے عمدہ نتائج اخذ کر کے مستفیض ہوں۔

اچھا آدمی تو خیر اچھا ہی ہے اُس سے ہم ریاضت پسندی، مستقل مزاجی، دیانت داری، ہمدردی، وفا شعاری، پاک دامنی، عالی دماغی یا اور صفات حمیدہ سیکھ سکتے ہیں۔

لیکن بُرے آدمی کی لائف سے بھی ہم عمدہ نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔ ایک ڈاکو کی مکاری اور شہ زوری سے ہم راست بازی اور جرأت کا سبق لے سکتے ہیں۔ علیٰ ہذا جب ہم کسی لائف میں پڑھتے ہیں کہ فلاں شخص نے روپیہ کے لالچ سے یا شراب کے نشہ میں [illegible] ہو کر کسی شخص کو قتل کر ڈالا اور اُس کے عوض میں خود پھانسی پر لٹکا تو بڑی آسانی سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ لالچ یا شراب نوشی نے اسے یہ روز بد دکھایا۔

مرزا غالب کی سوانح عمری جس کا دیباچہ ہم لکھ رہے ہیں اُس کے پڑھنے سے گو خاص دلچسپی وہی اصحاب لے سکتے ہیں جو سخن سنجی یا سخن فہمی کے چٹخارے سے لذت آشنا ہیں تاہم عام آدمی بھی بہت سی باتیں سیکھ سکتا ہے۔ مصیبت کے وقت اوسان درست رکھنا، مستقل مزاجی کو ہاتھ سے نہ دینا، عسرت میں خوش رہنا اور شوخی طبع کے ساتھ قسمت سے جنگ کرنا، صاف دلی، وضعداری وغیرہ ایسی صفات ہیں جو انسان اپنی ذات میں پیدا کر سکتا ہے۔

اظہر ہاپوڑی اپریل ۱۹۰۵ء

قلعوں اور مکانوں تک ہی محدود رہ گیا۔

اس کے بعض ممبروں نے ایسی معمولی حالت میں رہنا اپنی شان کے خلاف سمجھا اور وہ قسمت آزمائی کے لئے وطن سے باہر جانے پر آمادہ ہو گئے چنانچہ مرزا غالب کے جد بزرگوار اپنے وطن مالوفہ سے نکل کر عازم ہندوستان ہوئے مگر بدقسمتی سے یہاں بھی اسلامی سلطنت کے آفتاب کو گرہن لگنا شروع ہو گیا تھا مغلوں کی سلطنت میں آثار زوال نمایاں نظر آتے تھے۔ یہ شاہ عالم کا زمانہ تھا اگرچہ سلطنت کی خود نازک حالت تھی تاہم مرزا صاحب کے دادا کی دربار نے ان کے رتبہ کے موافق قدردانی کی چنانچہ آپ کو شاہی نقارہ نشان مع پچاس گھوڑوں کے شاہی دربار سے عطا ہوا۔ علاوہ ازیں ان کی فوجی خدمات کے عوض میں ایک مستقل آمدنی کی جاگیر بھی عطا ہوئی۔

مگر ان کا یہ اعزاز صرف اسی وقت تک قائم رہ سکا جب تک کہ شاہ دہلی عالم شاہ کی آنکھیں کھلی رہیں۔ کیونکہ ان کی آنکھیں بند ہوتے ہی ملک میں ایک طوفان بے تمیزی مچ گیا امن و عافیت خواب و خیال ہو گئے۔ ہر طرف طوائف الملوکی کی نہ بجھنے والی آگ پھیلنے لگی۔ اب مرزا صاحب کے دادا گویا اسی طرح نقد دم تھے جس طرح کہ اپنے قدیم وطن سے چلے تھے۔ اور موجودہ پریشانی علیحدہ تھی آخر بیچاروں نے اسی غیر اطمینانی کی حالت میں وفات پائی۔ ان کے فرزند یعنی مرزا غالب کے والد عبداللہ بیگ خاں دہلی کی ہوا بگڑی ہوئی دیکھ کر لکھنؤ پہونچے اور نواب آصف الدولہ بہادر کے دربار میں حاضر ہو کر خدمات کے طالب ہوئے مگر قسمت نے یاوری نہ کی اسلئے آپ کو حیدرآباد جا کر نواب نظام علی خان بہادر مرحوم سے عرض معروض کرنا پڑا۔ نظام الملک نے آپ کی خدمات کو قبول کیا اور ان کے رتبہ کے موافق ایک اعلیٰ عہدہ عطا کیا مگر افسوس کہ زمانہ برسر دشمنی تھا کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ رہا تھا چنانچہ ابھی چند سال بھی اطمینان سے نہ گذرے تھے کہ ایک ایسا واقعہ ظہور پذیر ہوا کہ جس نے عبداللہ بیگ خان کو خانہ نشین بنا دیا۔ آپ اپنے موجودہ وطن دہلی میں چند روز قیام کر کے ریاست الور پہونچے۔ وہاں کے راجہ بختاور سنگھ نے آپ کی فوجی خدمت کو عزت کی نگاہ سے دیکھا۔ عین اسی زمانہ میں ۱۷۹۶ء

نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں صاحب غالب تولد ہوئے۔ مرزا کے طالع
کوکب اقبال ہوا ہوگا کہ ہمارا ہونہار فرزند اقلیم سخن کا شہنشاہ ہوگا اور اس کا نام
ابد آباد تک علمی دنیا میں ادب اور تعظیم کے ساتھ لیا جائیگا۔
سچ یہ ہے کہ مرزا غالب تھے بسز بخت جیسا کہ اکثر خود فرمایا کرتے تھے چنانچہ اس
کا آغاز یہیں سے ہوا کہ ابھی آپ محض صغرسن تھے یعنے سن شریف پانچ سال کا تھا
کہ آپ کے پدر بزرگوار مرزا عبد اللہ بیگ خاں الور کی کسی جنگ میں مارے گئے اور
مرزا کو یتیم چھوڑ گئے۔ مرزا صاحب معہ اپنی والدہ ماجدہ کے دہلی چلے آئے اور یہیں پر
بود و باش اختیار کی۔ گو مرزا کا اصل وطن ہندوستان نہ تھا مگر ان کو دہلی سے وہی
اُلفت تھی جو اپنے خاص وطن سے ہوتی ہے۔

زمانہ کی دشمنی مرزا کے ساتھ

ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ جب مرزا کی عمر صرف پانچ سال ہی کی تھی تو ان کے سر سے
والد بزرگوار کا سایہ اُٹھ گیا اور آپ در یتیم رہ گئے۔
مگر ان کی والدہ مکرمہ کو زیادہ پریشان نہ ہونا پڑا کیونکہ مرزا عبد اللہ بیگ خاں
مرحوم کے حقیقی بھائی (غالب کے چچا) مرزا نصر اللہ بیگ نے اس یتیم کو اپنے دامن
عاطفت میں ڈھانک لیا اور اس کی پرورش کے بذات خود کفیل ہوئے۔ مرزا نصر اللہ بیگ
مرہٹوں کے ملازم تھے اور آگرہ کی صوبیداری کا معزز عہدہ آپ کے سپرد تھا مگر بعد چندے
صوبہ مذکور پر انگریزی کمپنی کا عملدخل ہوگیا اور صوبہ داری کے بجائے کمشنری ہوگئی
تو نصر اللہ بیگ کی سابقہ خدمت اُن سے لے لی گئی اور ۱۸۰۳ء میں ہندوستان کے
ویسرائے لارڈ لیک صاحب نے مرزا موصوف کو ایک ہندوستانی فوج بھرتی کرنے کا
حکم دیا چنانچہ ایک رسالہ چار سو سواروں کا ان کے زیر کمان رہنے لگا۔ اب مرزا
نصر اللہ بیگ کو سترہ سو روپیہ ماہوار بعوض جدید خدمات ملتا تھا۔ علاوہ ازیں ان کو
سونک سونسا کا پرگنہ بطور جاگیر کے عطا ہوا تھا جس کی آمدنی کے وہ تاحین حیات
مالک رہے۔ لیکن مرزا کی بدقسمتی چچا بھی زندگی نے بغیر نہ رہی۔ مربی چچا نصر اللہ بیگ کا

یک اتفاقی حادثہ میں انتقال ہو گیا - جائداد چونکہ تا مین حیات تھی اسلئے وہ بھی قبضے میں آگئی اور مرزا غالب جو زبپیدایش سے نواب زادوں کی زندگی بسر کر رہے تھے فقیر کے فقیر رہ گئے اور مجبوراً اُن کو صرف تختِ سخن پر قناعت کرنی پڑی ۔

جائداد ضبط ہونے کے بعد اس کے عوض میں نواب احمد بخش خاں اور مرزا غالب کا دس ہزار روپیہ سالانہ مشترک وظیفہ مقرر ہوا جس میں سے صرف تین ہزار سالانہ مرزا کو ملتے رہے جو دراصل ان کی حق تلفی تھی - کیونکہ یہ ساڑھے سات ہزار سالانہ کے مستحق تھے - مرزا چند روز تک تو خاموش رہے مگر کب تک آخر آپ نے کلکتہ جا عدالت میں استغاثہ دایر کیا تو نواب ضیاء الدین خان سرکار نے اس کا فیصلہ سرجان بلکم صاحب گورنر کے سپرد کیا جسکی علت غائی یہ تھی کہ جس زمانہ کی سند مرزا غالب کے پاس تھی اس زمانہ میں صاحب موصوف لارڈ لیک صاحب کے سکرٹری تھے اور یہ کاغذات انہیں کے دستخطوں سے مکمل ہوتے تھے -

بلکم صاحب نے مرزا کا دعوے خارج کر دیا اور کہا کہ مدعا علیہ کو ہم خود جانتے ہیں اور اسکی دیانت داری پر ہمیں یقین ہے اور کہ مدعی کے واسطے صرف تین ہزار ہی تھے اور دو ہزار خواجہ حاجی وغیرہ کے لئے مرزا کو اب بھی صبر نہ آیا اور لندن میں اپیل کیا مگر نتیجہ افسوسناک نکلا -

مرزا غالب کی تعلیم و تربیت

ہماری گذشتہ تحریر سے ناظرین یہ معلوم کر چکے ہیں کہ مرزا صاحب ابتدائے عمر میں ہی اپنے بزرگوں کے سایہ سے محروم ہو چکے تھے پس ایسی صورت میں اُن کی تعلیم کا کیا انتظام ہو سکتا تھا - مختصر یہ کہ آپ کو تحصیل علوم کا موقع شاذ و نادر ہی ملا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ آپ درس تدریس سے بالکل محروم ہی رہے اور یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ مرزا صاحب کے ذوقِ سلیم اور طبعِ رسا نے باوجود ایسی رکاوٹوں کے بھی وہ جودت دکھائی کہ بڑے بڑے علما کو دنگ کر دیا - گویا اُن کی طبیعت داد ازلی تھی خیالات کی بلند پروازی اور سخن آفرینی - الفاظ کی تراش خراش سب کچھ طبعزاد تھا ان کو انہوں نے خود فارسی زبان سے ایک خاص تعلق تھا چنانچہ مرزا صاحب ایک رقعہ میں

اپنی کم استعدادی کا اقرار کرتے ہوئے فارسی زبان کے تعلق کا اشارہ کر کے حسب ذیل تحریر فرماتے ہیں۔

"علم و ہنر سے عاری ہوں لیکن بچپن برس سے محو سخن گزاری ہوں مبدٔ فیاض کا مجھ پر احسان عظیم ہے۔ ماخذ میرا اچھا اور طبع میری سلیم ہے فارسی کے ساتھ ایک مناسبت ازلی اور سرمدی لایا ہوں مطابق اہل پارس کے منطق کا مزہ بھی ابدی لایا ہوں۔"

اگرچہ مرزا صاحب باقاعدہ تحصیل علوم سے محروم رہے تاہم قدرت نے ان کی ذہین طبیعت اور فکر رسا کی ترقی کے لئے کسی قدر سامان بھی پیدا کر دیا چنانچہ عبدالصمد نامی ایک ایرانی شخص نے جو دراصل پارسی مذہب کا پیرو اور رند و پاژند کا جید عالم تھا اور اب اسلام پر ایمان لے آیا تھا۔ اپنے ملک سے نکل کر سیاحت پر کمر باندھی اور چند روز بعد دہلی پہونچا۔ مرزا غالب ان سے ملاقی ہوئے اور دو برس تک ان کو نہ چھوڑا۔ گو چودہ برس کی عمر اور اس پر مربیوں کا سایہ سر سے اٹھ جانا بڑی بڑی مصیبتیں تھیں تاہم مرزا صاحب نے ان کی ذرا پرواہ نہ کی اور اس روشن ضمیر عالم سے فارسی زبان کی تکمیل کرتے رہے۔

پس اگر کوئی شخص سوال کرے کہ مرزا غالب نے کتنا زمانہ طالب علمی میں گزارا تو مشکل سے کہا جا سکتا ہے کہ محض دو سال۔

جان جائے مگر آن نہ جائے

ہر چند زمانہ۔ آسمان مرزا کے ساتھ دشمنی پر آمادہ تھے اور مرزا طرح طرح کی مصیبتوں میں آئے دن گرفتار رہتے تھے اور کچھ نہیں تو یہی کیا ستم کم تھا کہ ایک ایسے نوجوان جسکی زندگی نوابی عیش و عشرت سے شروع ہوئی ہو ایسی بے سرو سامانی اور گمنامی سے بسر کرے مگر وہ اس کے ساتھ ہی اپنی وضعداری اور خاندانی اعزاز کو قایم رکھنا چاہتے تھے بلکہ اس کو تکالیف کے بدلے خریدتے تھے جیسا کہ ذیل کے واقعہ سے پتہ چلتا ہے۔

سنہ ۱۸۴۲ء میں گورنمنٹ کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ دہلی کالج کا انتظام از سرنو کیا جائے۔ چنانچہ ٹامسن صاحب بہادر جو ممالک مغربی و شمالی (اضلاع متحدہ آگرہ و اودھ) کے لفٹنٹ گورنر رہ چکے تھے دہلی میں اس غرض سے تشریف لائے کہ مدرسین کا امتحان لے کر دو جدید مدرس ایک فارسی دوسرا عربی کا اور رکھیں۔ جب عمائد شہر سے اس بارہ میں صاحب نے صلاح لی تو فارسی کے لئے مرزا غالب کا نام پیش کیا گیا۔ چنانچہ آپ حسب طلب پالکی میں سوار ہو کر صاحب کے پاس گئے۔ جانے کو تو چلے گئے مگر پالکی سے نہ اترے اور اس انتظار میں ٹھہرے رہے کہ صاحب بہادر استقبال کو آئیں تو اتریں۔ جب دیر ہوئی تو اردلی دوڑا آیا۔ اور اترنے کو کہا۔ مرزا صاحب نے اپنا مافی الضمیر بیان کر دیا۔ جو صاحب سے کہا گیا۔ صاحب باہر آئے اور فرمایا کہ جب آپ دربار کی تقریب پر رئیس کی حیثیت سے تشریف لائینگے تو آپ کا باقاعدہ استقبال کیا جائے گا۔ لیکن چونکہ اس وقت آپ ملازمانہ تعلق سے آئے ہیں اسلئے آپ ایسی تعظیم کے مستحق نہیں۔

مرزا نے کہا کہ میں گورنمنٹ کی خدمات کو باعث ازدیاد مراتب و عزت سمجھتا ہوں پھر یہ کسطرح ممکن ہے کہ میں قدیم عزت بھی بگاڑ لوں۔ اس کے جواب میں صاحب نے کہا کہ قانون کی پابندی نہیں چھوڑی جاتی۔ مرزا نے کہا تو میں عزت فروش نہیں بننا چاہتا۔ یہ کہہ کر چلے آئے۔

خودداری کا تو یہ حال تھا گو تنگدستی پیچھے پڑی تھی تاہم وہ خوش و خورم نظر آتے تھے اور اپنے آپ کو دولت مندوں میں شمار کرتے تھے اس سے یہ مراد نہیں کہ وہ تصنع پسند تھے بلکہ چند روزہ زندگی فرحت و انبساط کے ساتھ گزارنا چاہتے تھے اور اپنے دل کو ہزاروں پہلوؤں سے سمجھا لیتے تھے۔ یہ سب کچھ تھا مگر اسکے ساتھ ان کو اپنے ازلی بدقسمت ہونے کا بھی بڑا پختہ یقین تھا جس کا تجربہ بار بار دیکھ چکے تھے۔

مرزا لکھنؤ میں

وطن کی محبت فطرتی اور خلقی ہے۔ جس سے صرف حضرت انسان ہی نہیں

بلکہ اور مخلوقات کو بھی حصہ ملا ہے جسکے تجربے اور مشاہدے رات دن نظر آتے ہیں
مچھلی پانی سے باہر زندہ نہیں رہ سکتی۔ سمندر کو آگ سے دور رہنے کا مقدور
نہیں۔ علیٰ ہذالقیاس اور بہت سی اسی قسم کی باتیں ہیں۔
اسی قاعدہ کے موافق اگر مرزا غالب کو اپنے وطن مالوف دہلی سے جو غیر معمولی
محبت تھی وہ کچھ تعجب خیز نہیں۔
اگرچہ مرزا صاحب دہلی سے باہر جانا کسی طرح نہ چاہتے تھے تاہم بعض احباب کے
اُبھارنے سے لکھنؤ تشریف لے گئے۔ مگر وطن کی محبت کا اظہار کئے بغیر وہاں بھی نہ
رہ سکے۔ چنانچہ آپ نے ایک مرثیہ فراق دہلی میں تحریر کیا۔ جس کا ہر شعر نیز و نشتر
ہے۔ کون سنگدل سے سنگدل انسان ہے جس کا دل اس کو پڑھ کر پانی پانی نہیں ہو جاتا
قصیدے مذکورہ کے دو شعر درج ذیل ہیں ؎

چھوا مذودہ بگردو مژہ آغشتہ بخوں ۔ خودگواہم کہ زدہلی بچہ عنواں رفتم
داغ حسرت بدل و شکوۂ اختر بہ زباں ۔ منت از بخت کہ بسیار بہ ساماں رفتم

الغرض جب مرزا صاحب لکھنؤ میں داخل ہوے تو وہاں کے باکمال اشخاص نے
ہاتھوں ہاتھ لیا اور بڑی تعظیم و تکریم کے ساتھ اپنا عزیز مہمان بنایا۔ مرزا کی طبیعت بھی
یہاں کے لوگوں کا اخلاق دیکھ کر قدرے بحال ہوئی۔
ایک روز کا ذکر ہے کہ میزبان کے مکان پر بہت سے احباب موجود تھے مرزا
صاحب بھی بزلہ سنجیوں میں محو ہو رہے تھے۔ اسی حالت میں ایک صاحب نے اپنے
دوست سے کہا کہ واللہ یہ باکمال شخص تو آنکھوں پر بٹھانے کے قابل ہے اس کی جسقدر
عزت جتنی قدر دانی کی جاے تھوڑی ہے مگر حیف ہے کہ دہلی والوں سے ان کی کچھ
بھی ہمدردی نہ ہوسکی۔
اس گفتگو کی مرزا کے کان میں بھی بھنک پڑ گئی آپ تو بھرے بیٹھے تھے یک
بیک پھوٹ پڑے اور بیقرار ہو کر کہنے لگے سُنئے حضرات (میں) پانچ برس کا تھا کہ
میرا باپ مرا۔ نو برس کا تھا کہ چچا مرا۔ اسکی جاگیر کے عوض میں میرے اور میرے شرکائے
حقیقی کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں دس ہزار روپیہ سال مقرر ہوئے
انہوں نے نہ دئے مگر تین ہزار روپئے سالانہ۔ ان میں سے خاص میری ذات کا

حصے ساڑھے سات ہزار روپیہ سال فقط۔ یہیں نے سرکار انگریزی میں ظن ظاہر کیا۔ سکوبرک صاحب بہادر ریذیڈنٹ دہلی اور استرلنگ صاحب بہادر سکرتر گورنمنٹ کلکتہ متفق ہوئے میرا حق دلانے پر۔ ریذیڈنٹ معزول ہو گئے۔
سکرتر گورنمنٹ برگ ناگاہ مر گئے۔ بعد ایک زمانہ کے شاہ دہلی نے پچاس روپے مہینہ مقرر کیا۔ اُن کے ولیعہد اس تقرر کے دو برس بعد مر گئے۔ واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے بہ صلہ مدح گستری پانچ سو روپے سال مقرر ہوئے وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جیئے یعنے اگرچہ اب تک جیتے ہیں مگر سلطنت جاتی رہی۔ اور تباہی سلطنت دو ہی برس میں ہو گئی۔ دلی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی۔ سات برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی ایسے طالع مربی کش اور محسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں۔
مجھ کو بعض دوستوں نے صلاح دی کہ میں ریاست حیدر آباد میں تعلق پیدا کروں لیکن اگر میں والی دکن کی طرف رجوع کروں یاد رہے کہ متوسط یا مر جائے گا یا معزول ہو جائے گا۔ اور اگر یہ دو امر واقع نہ ہوں تو کوشش اسکی ضایع جائے گی والی شہر مجھ کو کچھ نہ دے گا۔ اور اگر احیاناً اس نے سلوک کیا تو ریاست خاک میں مل جائے گی۔ ملک میں گدھے کے ہل پھر جائیں گے[1]۔ الغرض میں پورا پورا سبز قدم ہوں۔
اہل لکھنؤ یہ سن کر ایک سکتے کے عالم میں رہ گئے اور اس کے قائل ہو گئے کہ آسمان۔ زمانہ بیشک اہل کمال کا دشمن ہوتا ہے۔

مرزا غالب کلکتہ میں

مرزا کی ازلی بدبختی جس کے وہ خود بھی قائل تھے ہر جگہ کسی نہ کسی پہلو میں لگ لگائے بغیر نہ رہتی تھی۔ چنانچہ جب آپ کلکتہ تشریف لے گئے تو وہاں کے اہل کمال نے عموماً اور ایران کے سخن سنج اصحاب نے (جو ان دنوں کلکتہ میں مقیم تھے) خصوصاً آپ کی بہت عزت کی مگر جب مشاعرہ منعقد ہوا اور مرزا صاحب نے اپنی غزل پڑھی

(۱) یہ مضمون اردوئے معلےٰ کے ایک رقعہ کا ہے۔ مولف

تو چند لوگوں نے جو کہ مرزا قتیل کے شاگرد تھے ۔ایک لفظ پر اعتراض کیا اور سند یہ مرزا قتیل کے مقرر کردہ اصول پیش کئے ۔لیکن مرزا غالب نے اس غلطی کو تسلیم نہیں کیا بلکہ فرمایا "قتیل کون بلا ہوتا ہے ۔ مجھے اُس سے واسطہ ۔ کیا میں فرید آباد کے ایک کھتری بچہ کی بات مان لوں جس بیچارے کو اہل زبان کی کبھی صحبت نہیں نصیب ہوئی اور دہلی یا لکھنؤ کی ہوا بھی نہ لگی ۔"

ان فقرات نے مرزا قتیل کے شاگردوں کے دل پر وہی اثر کیا جو کسی بزرگ کو اس کے عزیزوں کے سامنے ملامت کرنے سے پیدا ہو سکتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرزا غالب جیسا باکمال شخص اس قدردانی اور خاطر تواضع سے محروم رہ گیا جو اُس کے شایان شان تھی اور جس پر اہل کلکتہ (اس واقعہ سے پہلے) آمادہ تھے ۔

مرزا کو ایسے واقعات کی امید نہ تھی چنانچہ ان لوگوں کا جوش و خروش دیکھ کر مرزا صاحب کو سخت حیرت ہوئی اور اس کے ساتھ ہی یہ خیال پیدا ہوا کہ کسی طرح اس فوری جوش کو دبا یا جائے چنانچہ آپ نے نہایت متانت کے ساتھ ایک مثنوی لکھی ۔جس میں تنازعہ مشاعرہ اور اعتراض و معترضین کی تصویر کھینچ کر اور آخر میں اپنا انکسار طبع دکھا کر بہت کچھ معذرت کر کے اپنے کمال کا ثبوت دیا حق تو یہ ہے کہ ایسی جامع مثنوی لکھنا مرزا صاحب ہی کا کام تھا ۔مگر افسوس جس منشا سے یہ لکھی گئی تھی واقعات اوس سے کوسوں دور جا پڑے ۔جب آپ نے جلسہ میں پڑھی تو حاضرین نہایت خاموشی کے ساتھ سنتے رہے اور داد دینے سے آنکھ چرائی اور بجائے اس کے کہ مرزا صاحب سے معافی چاہتے اور اون مہمان نوازیوں اور قدردانی کی تلافی کرتے جس میں اب تک فروگذاشت ہوئی تھی اہل کلکتہ نے خلاف تمسخر کرنا شروع کیا ۔چنانچہ ایک حضرت نے مرزا صاحب سے دریافت کیا کہ اس مثنوی کا آپ نے نام کیا تجویز کیا ہے آپ نے فرمایا "باد مخالف"

ایک ذات شریف نے جھٹ گلستان کا فقرہ "یکے از صلحا را باد مخالف در شکم پیچید" کہلو پھبتی کے پڑھا ۔اور لوگوں نے علانیہ مسکرانا شروع کیا ۔الغرض مرزا کو کلکتہ سے بےنیل مرام واپس آنا پڑا ۔

مرزا صاحب کے ساتھ ریاست رامپور کا سلوک

مرزا صاحب کی شہرت کمال تو ملک بھر میں گونج چکی تھی اسی لئے باوجود مرزا کے عسرت کے بڑے بڑے رئیس اُن کو وقعت کی نظر سے دیکھتے تھے چنانچہ ذیل کے خط سے جو مرزا صاحب نے اپنے لایق فایق شاگرد میر مہدی مرحوم کو لکھا ہے اس سلوک اور تعلق کا پتہ چلتا ہے جو ریاست رامپور آپ کے ساتھ کرتی تھی۔ آپ لکھتے ہیں "میر مہدی تم میرے عادات بھول گئے۔ ماہ مبارک رمضان میں کسی جامع مسجد کی تراویح ناغہ ہوئی ہے؟ میں اس مہینے میں رامپور کیونکر رہتا۔ نواب صاحب مانع رہے۔ اور بہت منع کرتے رہے۔ برسات کے آموں کا لالچ دیتے رہے۔ مگر بھائی میں ایسے انداز سے چلا کہ چاند رات کو یہاں آپہونچا۔ یکشنبہ کو غرہ ماہ مقدس ہوا۔ اسی دن سے ہر صبح کو حامد علیخاں کی مسجد میں جاکر جناب مولوی جعفر علی صاحب سے قرآن[1] سنتا ہوں۔ شب کو مسجد جاکر نماز تراویح پڑھتا ہوں۔ کبھی جو جی میں آتی ہے تو وقت صوم مہتاب باغ میں جاکر روزہ کھولتا ہوں۔ اور سرد پانی پیتا ہوں واہ! کیا اچھی طرح عمر بسر ہوتی ہے۔" (گویا یہ سب فرضی فسانہ تھا) اب اصلی حقیقت سنو۔ لڑکوں کو ساتھ لے گیا تھا۔ وہاں انہوں نے میرا ناک میں دم کر دیا تنہا بھیج دینے میں وہم آیا۔ کہ خدا جانے اگر کوئی امر حادث ہو تو بدنامی عمر بھر رہے۔ اس سبب سے جلد چلا آیا۔ ورنہ گرمی برسات وہیں کاٹتا اب بشرط حیات جریدہ بعد برسات جاؤنگا۔ اور بہت دنوں تک یہاں نہ آؤنگا قرار داد یہ ہے کہ نواب صاحب جولائی ۱۸۵۹ء سے کہ جس کو یہ دسواں مہینہ ہے سو روپیہ مجھے ماہ بماہ بھیجتے ہیں۔ اب میں جو وہاں گیا تو سو روپیہ مہینا بنام دعوت

[1] مرزا صاحب کا کلام مجید اور تراویح پڑھنی محض مضمون تماشی ہے مرحوم کو شراب نوشی سے ان کاموں کی کب فرصت تھی۔

اسی طرح پر ایک اور شعر فرمایا ہے ؎

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

مرزا صاحب کی مشکل پسندی کی عام طور پر شکایت تھی۔ بڑے بڑے سخن فہم اصحاب شعر سن کر حیران رہ جاتے تھے اور اکثر احباب آسان کہنے کی فرمایش کیا کرتے تھے چنانچہ ایک مشاعرہ میں مرزا صاحب شریک ہوئے تو ایک نوجوان خوش مزاج شاعر حیش نامی نے طرحی غزل کے سلسلہ میں قطعہ ذیل پڑھا جس میں مرزا صاحب سے خطاب کیا گیا تھا۔

قطعہ

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے — مزہ کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلام میر سمجھے اور زبان میرزا سمجھے — مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

چونکہ مرزا صاحب کی طبیعت نہایت ہی بے نیاز واقع ہوئی تھی اس لئے آپ نے فوراً اس کے جواب میں فرمادیا ؎

نہ ستایش کی تمنا نہ صلہ کی پروا — نہ سہی گر مرے اشعار میں معنے نہ سہی

نظم کا بدیہی اور واقعات پر مبنی لکھنا جس قدر مشکل ہے اس کا اندازہ سخن سنج اصحاب ہی خوب کر سکتے ہیں۔ پہروں دنوں کے فکر کے بعد ایک شعر یا غزل موزوں کر دینا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ حضرت غالب کو چند تقریبوں پر بدیہہ کلام کہنے کا موقع ہوا اور آپ نے کہا اور خوب کہا۔

چنانچہ آپ کے کلکتہ تشریف لے جانے پر مولوی کرم حسین صاحب نے ایک چکنی ڈلی (چھالیہ) پیش کر کے کہا کہ اس پر کچھ طبع آزمائی فرمائیے آپ نے فوراً ہی یہ قطعہ موزوں کیا۔

قطعہ

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی — زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہئے
خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھئے — ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے
اختر سوختۂ قیس سے نسبت دیجے — خال مشکیں رخ دلکش لیلےٰ کہئے
حجر الاسود دیوار حرم کیجے فرض — نافہ آہوے بیابان ختن کا کہئے
صومعہ میں اسے ٹھہرائیے گر مہر نماز — میکدہ میں اسے خشت خم صہبا کہئے

مسی آلودہ سرِ انگشتِ حسیناں لکھئے — سرِ پستانِ پریزاد سے مانا کہئے

اپنے حضرت کے کفِ دست کو دل کیجے فرض

اور اس چکنی سپاری کو سوید لکھئے

اسی طرح ایک روز جب کہ مرزا غالب روپیوں پیسوں سے بالکل خالی بیٹھے تھے آپ کا صاحبزادہ آیا اور کہا کہ ابا جان ہمیں مٹھائی منگا دو۔ جواب ملا کہ پیسے نہیں وہ بیچارہ سادہ دل لڑکا بکس کھول کر اسکی تلاشی لینے لگا مرزا صاحب نے فوراً فرمایا کہ ؎

درم و دام اپنے پاس کہاں

چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

شمس العلما مولوی محمد حسین صاحب آزاد اپنے تذکرہ میں تحریر کرتے ہیں "ایک دن استاد مرحوم (حضرت ذوق) سے مرزا صاحب (غالب) کے انداز نازک خیالی کا اور فارسی ترکیبوں کا اور لوگوں کی مختلف طبیعتوں کا ذکر تھا۔ میں نے کہا کہ بعض شعر صاف بھی نکل جاتا ہے تو قیامت ہی کر جاتا ہے۔ فرمایا خوب! پھر کہا کہ جو مرزا کا شعر ہوتا ہے اس کی لوگوں کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ شعر ان کے میں تمہیں سناتا ہوں کئی متفرق شعر پڑھے تھے ایک اب تک خیال میں ہے ؎

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک

میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

اس میں کلام نہیں کہ وہ اپنے نام کی تاثیر سے مضامین و معانی کے شیر تھے دو باتیں ان کے انداز کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں اوّل یہ کہ معنی آفرینی اور نازک خیالی ان کا شیوہ خاص تھا۔ دوسرے چونکہ فارسی کی مشق زیادہ تھی اور اس سے انہیں طبعی تعلق تھا اسلئے اکثر الفاظ اس طرح ترکیب دیتے جاتے تھے کہ بول چال میں اس طرح بولتے نہیں۔ لیکن جو شعر صاف نکل گئے ہیں وہ ایسے ہیں کہ جواب نہیں رکھتے"

آخر زمانہ میں مرزا صاحب نے اپنے بعض احباب کی فرمایش سے آسان کہنا شروع کیا۔ چنانچہ دیوان کا آخری حصہ بسہولت سمجھ میں آتا ہے۔ ہم آیندہ دونوں قسم کے کلام کا نمونہ درج کرینگے۔

اس میں شک نہیں کہ ہر شاعر کا رنگ جداگانہ ہوتا ہے اور [illegible] اپنی [illegible]

خاص کا فخر ہو تو بیجا نہیں۔ ذوق مرحوم اور مرزا غالب کے کلام دیکھنے سے انہیں
بیّن فرق نظر آتا ہے اور بادی النظر میں کہا جاتا ہے کہ اپنی اپنی جگہ پر دونوں ہی
استاد ہیں لیکن بعض منصف مزاج سخن فہم اصحاب کہتے ہیں کہ ملک الشعرا کے
خطاب اور بادشاہ کی اُستادی کے لئے زیادہ موزوں مرزا غالب ہی تھے مگر بقول
شخصے ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ۔

دوسرے حضرت ذوق کی نیک طالعی اور مرزا کی ازلی محرومی ایسا کیوں ہونے دینے
لگی تھی۔

بہادر شاہ ظفر شاہ دہلی کے عزیز بیٹے مرزا جوان بخت ولی عہد سلطنت کی شادی
کی تقریب پر جس میں ایشیا کی شان و شوکت اور شاہی تزک احتشام دکھانے
میں لاکھوں روپئے صرف ہوئے تھے مرزا صاحب نے ایک نہایت نفیس سہرا لکھ کر
شاہ دہلی کی خدمت میں گذرانا امید یہ تھی کہ حضور سے بیش بہا انعام لیں گے۔ مگر
وہاں الٹی پڑی کیونکہ آپ نے مقطع میں لکھا تھا کہ ؎

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

بادشاہ نے خیال کیا کہ یہ ہمارے استاد ذوق اور خود ہم سے چھیڑ ہے کہ اس سے
بہتر کوئی سہرا نہیں لکھ سکتا حضور ابھی اسی فکر میں بیٹھے تھے کہ اُستاد قلعہ
میں تشریف لائے مرزا صاحب کا سہرا دکھایا انہوں نے معمولی الفاظ میں تعریف کی
بادشاہ نے فرمایا کہ میں نے اسلئے آپ کو یہ سہرا نہیں دکھایا ہے۔ بلکہ اسکی غرض یہ
ہے کہ آپ بھی اسی زمین میں سہرا لکھیں مگر ذرا مقطع پر نظر رہے۔ حضرت ذوق
وہیں دوات قلم لے کر بیٹھ گئے اور چند گھنٹوں میں سہرا لکھ کر حضور میں پیش کر دیا
اب بادشاہ نے دونوں سہروں کو مشہور کرا دیا بلکہ اکثر طوائفوں کو ازبر یاد کرا کے محفل
رقص منعقد کرائیں۔ دوسرے روز دونوں سہرے اخبارات میں مشتہر ہو گئے۔
اس میں شک نہیں کہ اُستاد ذوق کا سہرا مرزا صاحب کے سہرہ سے بہت
بڑھ گیا تھا اور بادی النظر میں مرزا کی ہیٹی ہوگئی تھی لیکن جو لوگ سخن گوئی سے خاص

دلچسپی لیتے ہیں اور اپنا بہت سا وقت اسکی نظر کرتے ہیں اُن سے پوشیدہ نہیں ہے کہ کلام سامنے رکھکر مقابلۃً لکھنا اُس کے ہر قسم کے نشیب و فراز کے پہلوؤں پر نظر رکھنے اور طبعزاد موزوں کرنے میں وہی فرق ہے جو تقلید و ایجاد میں۔

الغرض دونوں سہرے تمام شہر میں مشہور ہو گئے اور رفتہ رفتہ مرزا صاحب کے کان تک بھی پہونچے اب تو وہ سٹ پٹا گئے اور جھٹ قطعہ معذرت لکھکر حضور میں گذرانا۔

دونوں سہرے تو ہم آگے چل کر ایک اور موقع پر درج کرینگے لیکن فی الحال مرزا کا قطعہ معذرت ناظرین کو سناتے ہیں ؎

مرزا کا قطعہ معذرت بحضور ظفر شاہ بہادر

منظور ہے گذارش احوال واقعی — اپنا بیان حسن طبیعت نہیں مجھے
سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری — کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے
آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل — ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے
کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں — مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے
استاد شہ سے مجھے پُرخاش کا خیال — یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے
جام جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر — سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے
میں کون اور ریختہ ہاں اس سے مدعا — غیر انبساط خاطر حضرت نہیں مجھے
سہرا لکھا گیا ز رہِ امتثال امر — دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے
مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات — منظور اس سے قطع محبت نہیں مجھے
روے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ — سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول کا غالب خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

۵ مرزا صاحب یہاں بھی اپنی عادت سے نہ چوکے شاعری کے فن سے اپنے آپکو بچا گئے گویا یہ ظاہر کیا کہ استاد ذوق کو صرف شاعری کے ہی ذریعہ سے عزت حاصل ہوئی ہے — (ناشر یادگی)

مرزا صاحب کی تصانیف

فارسی کتب

مجموعہ قصاید :- کچھ قصیدے حمد و نعت میں ہیں کچھ اہل بیت ظفر شاہ و واجد علی شاہ نیز بعض عہدہ داران انگریزوں کی مدح میں ہیں +

دیوان :- اس میں غزلوں کے علاوہ قصاید بھی شامل کر دیے گئے ہیں اور یہ مجموعہ مطبوعہ دستیاب ہوتا ہے +

نامۂ غالب :- مرزا کے قاطع برہان کے جواب میں حافظ عبد الرحیم صاحب ایک نابینا نے مقام میرٹھ سے ایک کتاب بنام ساطع برہان لکھی اس کے جواب میں مرزا صاحب نے نامۂ غالب بطور خط کے ان کے پاس بھیجا +

مہر نیمروز :- شاہی طبیب حکیم احسان اللہ خان مرحوم کے اشارہ سے مرزا صاحب نے یہ تاریخ لکھی جس میں امیر تیمور کے زمانہ سے لے کر ہمایوں کے زمانہ تک کا حال قلمبند کیا اس کے صلہ میں ۱۸۵۰ء میں نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خان غالب بہادر نظام جنگ کا خطاب پایا۔ دوسری جلد میں مغلیہ خاندان کے باقی بادشاہوں کا حال لکھا جانا تھا اور جس کا نام ماہ نیم ماہ مرزا نے تجویز کیا تھا افسوس بوجہ غدر ہو جانے کے نہ لکھی جا سکی +

پنج آہنگ :- یہ پانچ بابوں پر منقسم ہے +

قاطع برہان :- یہ کتاب اول ۱۸۶۲ء میں چھپی مگر بعد چندے اس میں کچھ تبدیلی کر کے درفش کاویانی کے نام سے چھاپا۔ برہان قاطع پر اعتراض کئے۔ مگر اہل ملک نے تسلیم نہ کیا +

سبد چین :- یہ فارسی کے چند قصیدوں۔ قطعوں۔ رقعات کا مجموعہ ہے +

دستنبو :- یہ غدر کی تاریخ ہے۔ جس میں دہلی کی بربادی اور بغاوت کی کیفیت علاوہ اپنے ذاتی حالات بھی قلمبند کئے ہیں +

اُردو تصانیف

دیوانِ غالب: یہ قصیدوں۔ غزلوں۔ رباعیات۔ قطعات۔ مثنوی۔ متفرقات اور ناتمام غزلوں کا مجموعہ ہے اس کے کل اشعار قریب اٹھارہ سو کے ہیں جس میں سے ۱۵۰۰ اشعار غزلیات کے ہیں اور ۱۶۲ قصیدوں کے قطعوں کے ۱۱۔ مثنوی کے ۲۳ رباعیات کے سولہ اور دو تاریخوں کے چار شعر ہیں اس میں آسان اور مشکل دونوں قسم کا کلام درج ہے +

عودِ ہندی: یہ تقریظوں دیگر نثر اور خطوط کا مجموعہ ہے اس کے بعض خطوط میں علمی تحقیقات کی چاشنی موجود ہے جو سخن سنج اصحاب کے لئے ایک حد تک دلچسپ ہو سکتی ہے +

اردوئے معلٰی: یہ اُن خطوط کا مجموعہ ہے جو مرزا صاحب نے اپنے مختلف دوستوں۔ شاگردوں اور عزیزوں کو لکھے تھے ان کا روزمرہ ایسا صاف ہے کہ ان کو پڑھنے سے ایسا سماں بندھتا ہے کہ گویا خود متکلم بیٹھا ہوا باتیں کر رہا ہے۔ گو یہ اردو ہے مگر بعض بعض جگہ ایسی عجیب و غریب تراکیب استعمال کی گئی ہیں کہ عام کانوں کو غیر مانوس محسوس ہوتی ہیں۔ مگر ان سے اُس حقیقی مناسبت کا پتہ لگتا ہے جو مرزا کو فارسی زبان کے ساتھ خلقتاً تھی +

مرزا کی ظرافتِ طبعی

مرزا نے اگرچہ عسرت میں بسر کرتا تھا مگر پھر بھی وقت کو نہایت خوشی کے ساتھ گزارتا تھا۔ جس کا پتہ ذیل کے لطائف سے بخوبی چلتا ہے +

لطیفہ

ایک روز مرزا صاحب اپنے دوست مولوی فضل حق کے مکان پر تشریف لے گئے مولوی صاحب نے جیسا کہ اُن کا تکیہ کلام تھا مرزا کو "بیا برادر آؤ" بھائی کہہ کر بٹھا لیا ابھی چند ہی لمحے گذرے تھے کہ مولوی صاحب کی آشنا طوائف بھی آدھمکی۔ مرزا نے کہا کہ "الکلام مرة" بنشیں مادر بیٹھ ری مائی "ابھی پڑھو

بیچے۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مولوی صاحب پر پانی کے سینکڑوں گھڑے پڑ گئے تھے۔

شیطان غالب ہے

رمضان کا مہینہ تھا مرزا صاحب اپنے ایک دوست کے ہاں تشریف لے گئے پان منہ سے مانگ کر نوش فرمایا اس پر حاضرین میں سے ایک صاحب نے ایک ہی کے لہجے میں کہا جناب روزہ نہیں رکھتے۔ مرزا نے کہا شیطان غالب ہے۔

کیا جاڑے میں بھی نہیں پیو گے

موسم سرما میں نواب مصطفےٰ خان مرزا کے مکان پر تشریف لائے۔ مرزا نے جام شراب لبریز کر کے نواب صاحب کے سامنے کیا۔ نواب صاحب نے مرزا کا منہ دیکھ کر کہا کہ جناب میں تو توبہ کر چکا۔ مرزا نے نہایت ہی سادگی سے کہا کیا جاڑے میں بھی نہیں پیو گے۔

دعا کی ضرورت نہیں

ایک مولوی صاحب نے مرزا کو شراب پینے سے منع کیا آپ نے پوچھا آخر اس میں ہرج کیا ہے مولوی صاحب نے فرمایا کہ ادنےٰ نقصان یہ ہے کہ شرابی کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ مرزا نے کہا کہ میرے پاس شراب۔ بےفکری۔ صحت سب کچھ موجود ہے پھر دعا کس چیز کے لئے مانگنے کی ضرورت رہی۔

لطیفہ

جس کلال سے مرزا کا حساب تھا ایک مرتبہ اس کا بہت سا روپیہ مرزا پر چڑھ گیا۔ اس نے ہر چند تقاضا کیا مگر مرزا کے پاس تھا ہی کیا۔ مجبوراً نالش کر دی۔ رفتہ رفتہ مقدمہ بہادر شاہ کے دربار میں پہونچا مرزا کے نام سمن آیا۔ آپ نے اس پر بجائے تعمیل کرنے کے مندرجہ ذیل شعر لکھ دیا۔

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

بادشاہ اس شعر کو پڑھ کر دیر تک مسکراتے رہے اور شاہی خزانہ سے [illegible] کا معاوضہ ادا کر دیا۔

لطیفہ

غدر کے مکروہ واقعہ کے بعد جبکہ بغاوت کے شبہ میں مرزا کی پنشن سرکار انگریزی سے بند ہوگئی تو آپ نے اپنے ایک دوست سے جو سرکاری عہدہ دار تھا حسب ذیل الفاظ میں پنشن بند ہونے کی شکایت کی "عمر بھر میں ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر اور ایک دفعہ بھی نماز پڑھی ہو تو مسلمان نہیں۔ پھر میں نہیں جانتا کہ مجھے سرکار نے باغی مسلمانوں میں کس طرح شامل سمجھا۔"

لطیفہ

دھوکے میں نجات ہوگئی

ایک بھوپالی حضرت دہلی کی سیر کو تشریف لائے یہاں آکر خیال پیدا ہوا کہ مرزا سے بھی ملنا چاہئے۔ چنانچہ آپ مرزا کے مکان پر پہونچے۔ علیک سلیک ہوئی بیٹھ گئے۔ گرمی کا موسم تھا۔ سامنے سرخ شربت (شراب) شیشہ میں بھرا ہوا رکھا تھا اور گلاس اوس پر ڈھکا ہوا تھا۔ بھوپالی صاحب کو پیاس نے ستایا تو حضرت نے شیشہ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مرزا کے مزاج دان دوست نے بتایا کہ اس شیشہ میں لال پری ہے تو بھوپالی صاحب کا رنگ زرد ہوگیا اور کہا کہ میں نے شربت سمجھ کر دھوکا کھایا۔ مرزا نے سادگی سے کہا زہے نصیب کہ تمہاری دھوکے میں نجات ہوگئی۔

لطیفہ

رات کے وقت مرزا صاحب سرور کے عالم میں پلنگ پر پڑے ہوئے تھے چند احباب بھی حاضر تھے فرمانے لگے جو کام بے صلاح و مشورہ ہو تو بے ڈھنگا ہوتا ہے۔ خدا نے ستارے آسمان پر کسی سے مشورہ کر کے نہیں بنائے جبھی بکھرے ہوئے ہیں۔ نہ کوئی سلسلہ۔ نہ زنجیر۔ نہ بیل۔ نہ بوٹا۔

مرزا غالب کے شاگرد

سب سے اوّل نمبر پر مرزا کے شاگرد جناب مولانا مولوی الطاف حسین صاحب حالیؔ پانی پتی ہیں جن کا نام نامی زیادہ تشریح طلب نہیں۔ آپ کے قومی خدمات اظہر من الشمس ہیں حضرت ناظم نواب رامپور بھی مرزا کے شاگرد تھے جن کا کلام ملک میں شائع ہو چکا ہے اعلیٰ پایہ کا ہے۔

نواب ضیاء الدین خاں نیر و علاؤ الدین خاں۔ علاء الدین خان صاحبان میں سے اوّل الذکر نواب احمد بخش خاں مرحوم کے فرزند تھے اور ثانی الذکر موصوف صاحب رئیسان ریاست لوہارو۔ یہ تینوں صاحب مرزا کے شاگرد تھے اور سلوک رہتے تھے۔

علاوہ ازیں میر مہدی مجروح۔ میر سرفراز حسین۔ نواب یوسف مرزا منشی ہرگوپال تفتہ عرف مرزا تفتہ عارف وغیرہ اصحاب آپ کے فیض صحبت سے بہرہ یاب ہوتے تھے۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ ہونگے جو مرزا کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوتے ہونگے مگر افسوس ہم اُن کے ناموں سے واقف نہیں اسلئے ناظرین کے سامنے ہیچمدانی کا اقرار کرتے ہیں۔

مرزا کے کلام کا مقابلہ اُن کے ہمعصروں سے

ہم ناظرین سے وعدہ کر آئے ہیں کہ آگے چل کر مرزا غالب اور ذوق کے سہرے درج کرینگے اسلئے ہم پہلے انہیں کو ناظرین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

سہرا مرزا غالب بہ تقریب شادی شہزادہ جواں بخت

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا	باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا
کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے	ہے ترے حسن دل افروز کا زیور سہرا

سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرف کلاہ
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا

ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا

سات دریا کے فراہم کئے ہوں گے موتی
تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا

جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
چاہیے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا

جبکہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا

رخ روشن کی دمک گوہر غلطاں کی چمک
کیوں نہ دکھلائے فروغ مہ و اختر سہرا

تار ریشم کا نہیں ہے یہ رگ ابر بہار
لائیگا تاب گرانباریٔ گوہر سہرا

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

سہرا حضرت ذوق جو جواباً بہادر شاہ کے ایما سے لکھا گیا

اے جواں بخت مبارک تجھے سر پر سہرا
آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا

آج وہ دن ہے کہ لائے دُرِ انجم سے فلک
کشتیٔ زر میں مہ نو کی لگا کر سہرا

تابش حسن سے مانند شعاع خورشید
رخ پر نور پہ ہے تیرے منور سہرا

وہ کہے صل علے - یہ کہے سبحان اللہ
دیکھے مکھڑے پہ جو تیرے مہ و اختر سہرا

تا بنی اور بنے میں رہے اخلاص بہم
گوندھئے سورۂ اخلاص کو پڑھ کر سہرا

دھوم ہے گلشن آفاق میں اس سہرے کی
گائیں مرغان نوا سنج نہ کیونکر سہرا

روئے فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار
تار بارش سے بنا ایک سراسر سہرا

ایک کو ایک پہ تزئین ہے دم آرائش
سر پہ دستار ہے دستار کے اوپر سہرا

اک گہر بھی نہیں صدکان گہر میں چھوڑا
تیرا بنوایا ہے لے لے کے جو گوہر سہرا

پھرتی خوشبو سے ہے اترائی ہوئی باد بہار
اللہ اللہ رے پھولوں کا معطر سہرا

سر پہ طرہ ہے مزین تو گلے میں بدھی
کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو منہ پر سہرا

رونمائی میں تجھے دے مہ و خورشید فلک
کھولدے منہ کو جو تو منہ سے اٹھا کر سہرا

[illegible] تیرا ناشنیوں گے
دم تقادہ ترے روئے نکو پر سہرا

موتی آب مضامین سے بنا کر لایا
واسطے تیرے ترا ذوق ثنا گر سہرا

جسکو دعوے ہے سخن کا یہ سنادے اسکو
دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

منتخب غزل میرزا غالب

نویدِ امن ہے بیدادِ دوست جاں کے لئے
رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لئے

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے
رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خوں فشاں کیلئے

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

فلک نہ دور رکھ اُس سے مجھے کہ میں ہی نہیں
درازدستیِ قاتل کے امتحاں کے لئے

مثال یہ میری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کیلئے

مدحیہ

دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لئے

نصیرِ دولت و دیں اور معینِ ملت و ملک
بنا ہے چرخِ بریں جسکے آستاں کیلئے

زمانہ عہد میں اسکے ہے محوِ آرایش
بنیںگے اور ستارے اب آسماں کے لئے

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

منتخب غزل حضرت ذوق مرحوم

نہیں ثبات بلندیِ عز و شاں کے لئے
کہ ساتھ اوج کے پستی ہے آسماں کے لئے

نہ دل رہا نہ جگر دونوں جل کے خاک ہوئے
رہا ہے سینہ میں کیا چشمِ خوں فشاں کیلئے

اگر امید نہ ہمسایہ ہو تو خانۂ یاس — بہشت ہے ہمیں آرام جاوداں کے لئے

وہ مول لیتے ہیں جس دم کو کوئی تیغ تلے — لگاتے پہلے بھی پر ہیں امتحاں کے لئے

مطلع

صبا جو آئے خس و خار گلستاں کے لئے — قفس میں کیونکہ نہ پھڑکے دل آشیاں کیلئے

بیان درد محبت جو ہو تو کیونکر ہو — زباں نہ دل کے لئے ہے نہ دل زباں کیلئے

جھک کے چومنے ہی پر ہے رشک کعبہ اگر — تو بوسے ہم نے بھی اس سنگ آستاں کیلئے

بلند ہوئے اگر کوئی میرا شعلۂ آہ — تو ایک اور ہے خورشید آسماں کیلئے

مطلع

فروغ عشق سے ہے روشنی جہاں کیلئے — یہی چراغ ہے اس تیرہ خاکداں کے لئے

سبب ہے ہول کہ برہم نہ ہو مزاج کہیں — بجا ہے ہول دل اپنے مزاجداں کے لئے

چلے ہیں دیر کو مدت میں خانقاہ سے ہم — شکست توبہ لئے ارمغاں مغاں کے لئے

اشارہ چشم کا تیرے یکایک اے قاتل — ہوا بہانہ مری مرگ ناگہاں کے لئے

بنایا آدمی کو ذوق ایک جزو ضعیف
اور اس ضعیف سے کل کام دو جہاں کیلئے

انتخاب غزل مومن

نہ پائے یار کے بوسے۔ نہ آستاں کیلئے — عبث میں خاک ہوا میل آسماں کے لئے

وہ لعل روح فزا دے کہاں تلک بوسے — کہ جو ہے کم ہے یہاں شوق جاں فشاں کیلئے

خلاف وعدۂ فردا کی ہم کو تاب کہاں — امید یک شبہ ہے پاس جاوداں کیلئے

بھلا ہوا کہ وہ غافل رہا ستم سے موئے — ہمیں بھی دینی تھی جاں اس کے امتحاں کیلئے

کہاں وہ عیش اسیری کہاں وہ دام قفس — ہے بیم برق بلا روز آشیاں کے لئے

لیا ہے دل کے عوض جان سے رقیب تجھے دوں — میں اور آپ کی سوداگری زیاں کے لئے

جواب چرخ بلا ہے ہو اگر سے بے تاب — فغاں اثر کے لئے اور اثر فغاں کے لئے

زمان فزا ہے سحر حلال مومن سے — ملا نہ معجزہ یاقوت لب بتاں کے لئے

متفرق باتیں

شکل وصورت لباس :- مرزا صاحب کشیدہ قامت اور وجیہ تھے عالم شباب میں ان کا رنگ سُرخ و سپید تھا مگر داڑھی کے بال گھنگے تھے۔ سر کے بالوں کا اکثر صفایا بول دیا کرتے تھے۔ سر پہ بالوں کی ایرانی ٹوپی اوڑھتے تھے یا پگڑی باندھتے تھے شرفائے دہلی کا عام لباس پہنتے تھے جس میں ایرانی جھلک بھی نظر آجاتی تھی غرارہ دار ڈھیلے پائچوں کا پاجامہ پہنتے تھے۔ جوغہ بھی ضرور ہوتا تھا۔

شادی اور اولاد :- ہندوستانی طرز معاشرت کے موافق مرزا کی شادی تیرہ سال کی عمر میں نواب الٰہی بخش خاں صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی۔ مرزا کی طبیعت گو آزاد واقع ہوئی تھی مگر تاہم چونکہ بیوی ایک معروف خاندان کی تھی اسلئے اسکی دلجوئی میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھتے تھے۔

افسوس کہ باوجودیکہ مرزا صاحب کے سات بچے پیدا ہوئے مگر ایک بھی عمر طبعی کو نہ پہونچا۔

اولاد نہ ہونا انسان کو بچوں کا ندیدہ کر دیتا ہے خصوصاً مستورات کو بانچہ مرزا صاحب کی بیوی نے زین العابدین خاں عارف مرحوم کے دو بیٹوں کو بڑی ناز برداری سے پالا اور مرزا صاحب بھی اُن سے یہاں تک مانوس ہوئے کہ آخری عمر میں ساتھ ہی ساتھ لئے پھرا کرتے تھے اور ان کے آرام کو اپنے آرام پر ترجیح دیتے تھے مگر افسوس کہ اُن کی عمر نے بھی وفا نہ کی مرزا کی وفات کے چند روز بعد اپنی خالہ کو دو نئے داغ دے کر چلتے ہوئے۔

مرزا کا مذہب :- اگرچہ مرزا صاحب کا تمام خاندان اہل سنت جماعت تھا مگر وہ خود مذہب شیعہ کے پیرو تھے۔ مذہب کے چھپانے کی کوشش نہ کرتے تھے کیونکہ اتنے خفیف اختلاف کی وجہ سے ان کے عزیز و اقارب اُن سے ملنے سے آنکھ نہ چُراتے تھے آپ مولانا فخر الدین (پیشوائے اہل تسنن) کے خاندان کے مرید بھی تھے پر صحیح یہ ہے کہ مرزا مذہب کی قید سے آزاد تھے کیونکہ وہ شراب کو

پانی کی طرح استعمال کرتے تھے جبکہ دونوں فرقے حرام سمجھتے ہیں۔

انتخاب کلام مرزا غالب مرحوم

مشکل کلام

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

کاوِ کاوِ سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تحریر کا

بس کہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ میری زنجیر کا

دیگر

بیاں کیا کیجیے بیدادِ کاوشہائے مژگاں کا
کہ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیح مرجاں کا

نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو
لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا

کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

اگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے
دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

نظر میں ہے ہمارے جادۂ راہِ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

دیگر

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیِ جا کا
گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخِ مکتوب
مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

خلاصہ پائے خزاں سے بہار اگر ہے یہی | دوام کلفت خاطر ہے عیش دنیا کا
غم فراق میں تکلیف سیر باغ نہ دو | مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اس کو یاد اسد
جفا میں اسکی ہے انداز کارفرما کا

دیگر

ہے کس قدر ہلاک فریب وفائے گل | بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
آزادی نسیم مبارک کہ ہر طرف | ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دام ہوائے گل
ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لئے بہار | میرا رقیب ہے نفس عطر سائے گل
غالب مجھے ہے اس سے ہم آغوشی آرزو | جس کا خیال ہے گل جیب ہوائے گل

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا | تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا
بفیض بیدلی نومیدی جاوید آساں ہے | کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

دہر میں نقش وفا وجہ تسلی نہ ہوا | ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا
سبزۂ خط سے ترا کاکل سرکش نہ دبا | یہ زمرد بھی حریف دم افعی نہ ہوا

کل کے لئے کر آج نہ خسّت شراب میں | یہ سوئے ظن ہے ساقی کوثر کے باب میں

ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر | یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں
ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود | ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

درد منت کش دوا نہ ہوا | میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

آسان کلام

غزل

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا | اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

دیگر

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں
میری آواز گر نہیں آتی

داغِ دل گر نظر نہیں آتا
بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

جان تم پر نثار کرتا ہوں | میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت مل جائے تو برا کیا ہے

دیگر

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے | تمہیں بتاؤ یہ انداز گفتگو کیا ہے
نہ شعلے میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا | کوئی بتائے کہ وہ شوخ تند خو کیا ہے
یہی لطافت گفتار۔ اور اگر ہو بھی | تو کس امید پہ کہئے کہ آرزو کیا ہے
ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا | وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن | بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے
محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا | اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں زاہد
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن | خاک ہو جائینگے ہم تم کو خبر ہونے تک

رونے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے | دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے

ابن مریم ہوا کرے کوئی | میرے دل کی دوا کرے کوئی

سفینہ جبکہ کنارہ پہ آ لگا غالب | خدا سے کیا ستم و جور ناخدا کہئے

پھر اسی بیوفا پہ مرتے ہیں | پھر وہی زندگی ہماری ہے

وفات تاریخ اور انتقال

مرزا صاحب نے اپنے انتقال سے پہلے اپنی وفات کا تاریخی قطعہ کہا جو [illegible] ہے

شکر باشم کہ جاودان باشم چون نظیری نماند طالب مرد
در بپرسند در کدامیں سال مرد غالب۔ بگو کہ غالب مرد

اگر مرزا کی لسان الغیبی اور پیشین گوئی صحیح ہوتی تو اس حساب سے اُن کا انتقال ۱۲۷۷ھ میں ہوتا مگر نہیں ہوا اتفاق سے اسی سال دہلی میں وبا پھیلی اس پر مرزا صاحب اپنے ایک لایق شاگرد کو لکھتے ہیں۔

"وبا کو کیا پوچھتے ہو۔ قدر انداز کے ترکش میں یہی ایک تیر باقی تھا قتل ایسا عام۔ لوٹ ایسی سخت۔ کال ایسا بڑا۔ وبا کیوں نہ ہو۔ لسان الغیب نے (خود مرزا صاحب نے) پہلے فرمایا ہے ؎

ہوچکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگ ناگہانی اور ہے

میاں ۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی مگر میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لایق نہ سمجھا واقعی اس میں میری کسر شان تھی"

او آخر عمر میں مرزا حد سے زیادہ ضعیف ہو گئے تھے۔ حتیٰ کہ قوت سامعہ بالکل زایل ہو گئی تھی۔ چنانچہ لوگوں سے گفت و شنید بذریعہ تحریر کرتے تھے غذا بھی قریب قریب ترک ہی ہو گئی تھی۔ صبح کو بادام کا شیرا سہ پہر کو یخنی۔ اور شام کو کباب نوش کرتے تھے آخر ۱۲۸۵ھ میں تہتر سال کی عمر میں اس آفتاب کمال نے برج مرقد میں منہ چھپایا اور اپنے عزیزوں اور شاگردوں کو آٹھ آٹھ آنسو رلایا۔ مرزا صاحب کے آخری عمر میں شعر ذیل ورد زبان رہتا تھا ؎

دم واپسیں برسر راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

تمام شد

کارخانہ مشہور عالم جنتری ہو کا انعامی سلسلہ جاری ہے

کارخانہ کی راستبازی اور پبلک کی قدردانی سے ملک کے ہر ایک حصہ میں ایک لاکھ جنتری پہنچا

شرائط

اول۔ آپ کارخانہ کے ٹکٹ اپنے شہر کے کسی احباب سے خرید فرماویں بصورت نہ ملنے کے آپ براہ راست کارخانہ میں سوا تین آنہ علاوہ محصول بھیجکر چار ٹکٹ منگالیں ۔

دوم۔ پھر اُن چاروں ٹکٹوں کو دیگر احباب کے ہاتھ سوا تین دس آنہ پر فروخت کر کے مبلغ ۲ ؍ وصول کرلیں۔ اسمیں سے سوا تین آٹھ آنے تو آپ اپنے خود رکھ لیں اور باقی مبلغ ۲ ؍ جمع رکھیں۔ پھر آپ اپنے چاروں خریداروں کے نام ٹکٹوں پر معہ مفصل پتہ کے لکھکر کارخانہ میں واپس بھیجدیں۔ اور مندرجہ اشیاء تصویردار میں سے ایک چیز جو پسند خاطر ہو تحریر فرماویں ۔

سوم جس وقت آپکا آرڈر پہنچیگا۔ کارخانہ فوراً انعامی اشیاء حسب الارشاد بذریعہ وی پی معہ ۱۶ عدد ٹکٹ کے مبلغ ۲ ؍ کر کے آپ کی خدمت میں بھیجدیگا (یہ دو روپیہ صرف اُن ۱۶ ٹکٹوں کی قیمت ہے جو آپ اپنے خریداروں کے لئے منگاتے ہیں جن کی قیمت دو روپیہ آپکے پاس جمع ہے) مگر محصول ڈاک انعامی اشیاء کا علاوہ دو روپیہ کے زائد چارج کیا جائیگا جو آپ کو اپنی گرہ سے دینا پڑیگا۔ پس وی پی وصول کر کے انعامی اشیاء آپ خود رکھ لیں اور اپنے چاروں خریداروں کو چار چار ٹکٹ معہ اُن کے ناموں کے سارٹیفکٹ کے دیدیں پھر وہ صاحب بھی اسی طرح یکے بعد دیگرے فروخت کا سلسلہ جاری رکھکر جو چیز چاہیں مفت منگالیں ۔

المشتہر

پنڈت گرداری مل منجم و جفار سیالکوٹی مصنف مشہور عالم جنتری و مالک کارخانہ مذکور لاہور

[illegible] قدسی وکلیم منشی شیخ امیر اللہ صاحب تسلیم لکھنوی مدظلہ العالی

مخمس

بر دو اشعار ملک الشعرا استاذ تسلیم کہ برائے حیات تسلیم پائے ہیں

از حقیر عرش تلمیذِ تسلیم مدظلہ و مصنف حیات تسلیم

گرچہ ہون رشکِ صبا اور وزیر … ہند مین آپ ہون ہین اپنی نظیر
ہے اسی طرح جو اپنی تقدیر … ہو چکی حشر مین اس کی توقیر
زندگی مین نہ ہوئی جب تعظیم

حالتین عرش نے کین گرچہ رقم … قدردان ہی نہ رہے وائے ستم
مجھ مین تسلیم کہان وہ دم خم … دونون عالم مین ہین یکسان ہم
مرگِ تسلیم وحیاتِ تسلیم

آہ

ٹوٹی ہوئی بزم ہیں اکیسںشتا ہے رات جو لوگ اپنے نغمۂ کلام سے دل خوش
رہے تھے اس وقت تخلیہ ہوتے صرف ایک شمع رہ گئی ہے وہ بھی خدا جانے کس
خیال میں زار زار رو رہی ہے مجسم سوز کے جو کے اوسے چھیڑتے ہیں اور وہ چپکے
سے جھلملا کر رہ جاتی ہے۔ اور کوئی اس بزم میں ایسا نہیں جس سے کچھ اگلی صحبتوں
اور قدیم بزرگوں کا پتہ ملے مگر دکار روان کی طرح یہی ایک شمع رہ گئی ہے وہ بھی
اپنے حال میں مبتلا ہے۔ نہ میری سنتی ہے نہ اپنی کہتی ہے۔ رات کے بچھے ہوئے
فرش پہ گلستان نظم کے کچھ خوش رنگ پھول پڑے ہیں جس سے کمال کی خوشبو
آتی ہے مگر افسوس کہ وہ باسی ہیں بہرکیف میں گلچین باغ نظم ہوں اوسے چنکر دامن
آرزو بھر لینا اپنا فخر جانتا ہوں کہ اگلے اساتذہ کے فیض سے بھی محروم نہ رہوں۔
میرے دوستو یہ وہی بزم ہے جہاں رات سودا۔ درد۔ نسیم دہلوی و مومن خاں
شمع محفل سرائی کر رہے تھے۔ اور اس وقت اون کی یادگاروں میں حضرت
اوستاذی ملک الشعرا شیخ امیر اللہ صاحب تسلیم لکھنوی شمع صفت اس دور
کے دیکھنے والوں کی وضع اور آرائش دیکھ کر چپ ہیں مدت سے میرا ارادہ تھا کہ
اس یادگار سودا و درد کی سوانح عمری لکھ کر قدردان اہل کمال سے محنت کی داد لوں
کہ میرا نام سعادتمند شاگردوں میں صفحۂ ہستی پر درج ہو کر یادگار رہے۔ مگر کل امور کے
لئے اوقات مقررہ کا انتظار ضرور ہے۔ دوسرے زمانہ کے تفکرات نے جیتے جی
مار ڈالا اور اگلے ناچیز کی صنعتوں کے قدردان تھے وہ بھی اوٹھ گئے اور نئے کارخانے
درہم برہم ہو گئے اہل کمال کی قلمی کتابیں عطاروں کی پڑیا باندھنے کی غرض

سمجھتا ہوں ۔ مدت کے بعد باغ تنہائی میں بہار آئی جناب منشی محمد الدین صاحب فوق ایڈیٹر اخبار پنجہ فولاد کے کہ میرے قابل دوست اور قدردان ہیں حیات تسلیم کی قدردانی کی۔ خدا سلامت رکھے۔ اسوقت لاہور عجب مقام ہے اور کیوں نہ ہو کہ یہاں کی فرش زمین پر بڑے بڑے اہل کمال بیٹھے ہیں۔ اے لاہور تیری خوش قسمتی پروتی یاد آتی ہے

ہائے افسوس جسوقت یہ تذکرہ مرتب ہوا تھا مکرمی منشی امیر احمد امیر مینائی اور میر خورشید علی نفیس لکھنوی زندہ تھے۔ آج نگاہیں ہر طرف دوڑا کر انکو دیکھتا ہوں مگر پتا نہیں ملتا۔ کل کی باتیں کہانیاں ہو گئیں ؎ عرش

زندہ جو کل تھے آج اونہیں کا فسانہ ہے
کس کس کو رو لیے یہی رنگ زمانہ ہے

بندہ عرش کفش بردار استاد تسلیم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس آفتاب سپہر نظم کی روشنی اقلیم معانی میں مدت سے پھیلی ہوئی ہے جہاں شہرت کا ہر ذرہ اختر پُر نور کی طرح فیض کرم سے روشن ہے اور اسکی روشنی کی اہل نظر کی آنکھوں میں جگہ ہے اوسکے آگے اور سخنداں کا چراغ قطرہ شبنم کی طرح فنا کا دم بھر رہا ہے۔

یہ اوس باغ سخن کا گل سرسبز ہے جسکے گلبند سودا اور درد دہلوی تھے۔ یہ وہ آئینہ ہے جسکی نشو و نما سے باغ عالم میں آجتک نسیم دہلوی کا طوطی کلام زمزمہ پرواز ہے۔ اس کا کلام باغ مقبولیت کا وہ پھول ہے جسکو گلاب کی طرح ہر باغ اور گلدستوں کی طرح ہر محفل میں پاتا ہوں۔

یہ زمین کمال کا وہ بحر ناپیدا کنار ہے جس سے لاکھوں چشمے تشنہ کام سیراب ہوئے سینکڑوں قطرے دریا ہوگئے ہزاروں جنگل تر ہو سرسبز ہوگئے اور خشک نہیں آجتک اس بحر کا ہر قطرہ وفور دریا دلی سے جام آسمان کو لبریز کرنیکی ہمت رکھتا ہے اللہ رے ظرف دماغ۔

اس شہنشاہ ملک سخن کے سر پر علم معانی کا وہ مرصع تاج ہے جس میں گوہر فصاحت و الماس بلاغت ستاروں سے زیادہ درخشاں ہیں ان جواہرات کے پرکھنے والوں کا بیان ہے کہ اس تاج کا ہر گوہر بہ حیثیت اعظم اور بحر تاروں سے بھی زیادہ قیمتی ہے مان جواہر پاروں کے قدردان چل بسے۔

جب یہ بادشاہ کمال عالم ارواح سے سیر کشور اجسام کرتا ہوا جہان نظم کی طرف چلا تو مکان قدرت کے دروں سے اسکے نفیس پردے اوٹھ گئے نوشتہ تقدیر بدیہی چیزوں کی طرح ساکنان فلک اور اہل زمین پر آشکارا ہوگیا فرشتوں نے تاج مبارک پہنا کر کہا کہ تو شہنشاہ اقلیم سخن ہے تجھ پر ہند کی قدیم شاعری ختم ہوگی تیرے قدردان بھی بادشاہی ہو گئے۔ لکھنؤ تجھے بزم سخن کا تخت بخت نصیب ہوگا۔ سچ ہے۔ آخر وہی ہوا۔ اس وقت لکھنؤ اور دہلی کے اساتذہ آپ ہی کو مستند فرماتے ہیں اور کہنہ مشق کہتے ہیں

نسیم

تسلیم باغ دہر میں غنچہ نسیم سے ہ کہتی ہے خلق بلبل ہندوستان مجھے

اب زنگ زمانہ اور ناقدردانی کیوجہ سے ہرگز امید نہیں کہ پھر ایسا قادر
اوستاد دنیا میں پیدا ہو اور یہ عزت حاصل کرے کہ اوستاد ذوق اوستاد [illegible]
ہر چند کہ بعض دہریوں کے منہ میں زبان ہے پیچھے ہی فرمائینگے کہ شاگردی نے بہت
بڑھا دیا مگر انصاف کی عینک سے اگر اس سچے تذکرے کو دیکھیں گے تو مصنف
آبحیات کی طرح مجھے بدنام نہ کرینگے غریب ہمدرد آزاد دہلوی بھی بدنام ہے
اور وہ صرف اس وجہ سے کہ اوستاد کی اتنی تعریف کی۔

نام اور حالت وطن

آپکا اسم گرامی احمد حسین اور عرف امیر اللہ ہے۔ عرف شہرہ عالم ہے تخلص
آپکا تسلیم ہے۔ آپکے والد مرحوم کا اسم گرامی مولوی عبد الصمد تھا۔ آپکے آبا اجداد کا
اصلی وطن قصبہ بدیع السرا عرف بدو سرائے مضافات دریاآباد ہے۔ مگر قصبہ
ناکور چھوڑ کر فیض آباد اودھ میں مقیم تھے۔

وطن چھوڑنیکی وجہ

اے نئی روشنی والے نوجوانو عینک لگی ہوئی آنکھوں سے ادھر دیکھو۔
اگلے بزرگ نوکری حتی المقدور نہیں پسند کرتے تھے اپنے نسب نامہ کو الٹ
کر دس بیس پشت کے لوگوں کی حالتوں کو دیکھو انہیں تمہاری طرح ملازمت پر
فخر نہ تھا زراعت سے انہیں دلچسپی تھی بڑے بڑے کھیتوں کی سیر پسند تھی
آپکے والد مولوی عبد الصمد صاحب مغفور زمینداروں کی مالی فیاضی کیا
کرتے تھے اور وہی معاش کا ذریعہ تھا اور دو گاؤں حسن پور اور پہاڑپور بزرگوں
کی یادگار بطور زمینداری کے رکھی تھے۔ ایک مرتبہ اتفاق وقت کہ روپیہ وصول
نہ ہوا گیارہ ہزار روپیہ باقی ہو گیا ناظم دریاآباد نے سخت طلبی کی یہانتک کہ
آپکے والد اور بڑے بھائی منشی عبد اللطیف صاحب دونوں قید ہوئے اور
ناظم نے ہر طرح کی تکلیف دینی شروع کی آپکے دادا صاحب زندہ تھے۔
اون کو تاب نہ آئی اور اولاد کی یہ تکلیف دیکھی نہ گئی جسقدر سرمایہ گھر میں موجود

[illegible] حقیقت کی اور یہ دونوں گاؤں راجہ رام سنگھ و ہم چند لیکے پاس گرو
رکھکر آپکے والد و جد بزرگوار کو قید سے چھڑایا اور روپیہ ادا کر دیا۔ رعیت
چونکہ اپنے مرہونہ گاؤں میں رہنا گوارا نہ کیا اس لئے آپکے بزرگ فیض آباد
اودھ میں آکر آباد ہوئے۔ مگر یہاں بھی گردش ایام کا چتر سر پر پھرتا رہا آپ و
والے نے مستقل طور پر رہنے دیا لیکر یہی فکر نے دائرہ لکھنؤ میں لاکر صورت
[illegible] پھرایا۔ آخر یہاں آپکے والد صفدری نام ایک پلٹن میں اوشدار ہوئے
اوشداری ایک عہدہ کا نام تھا کہ پانچسو آدمی کا افسر ہوتا تھا) تیس روپیہ
ماہوار آپکے والد کو ملا کرتے تھے۔ جب آپ کی عمر دس بارہ برس کی ہوئی تو
اوسی پلٹن میں سفارش وغیرہ سے بھرتی ہو گیا نوکری وغیرہ نہیں کرنی پڑتی تھی
مگر پانچ روپیہ ماہوار ملتے تھے۔ مختصر یہ کہ لکھنؤ ہی کو آپکے وطن ہونے پر فخر ہے

حالت تعلیم

آپ نے فارسی کی کتابیں اپنے والد اور مولوی شہاب الدین صاحب مغفور
شاگرد میرزا ناطق گرانی سے اور عربی کی کتابیں اپنے بڑے بھائی سے کہ علامہ
دہر فاضل جلیل القدر مولوی ولی اللہ صاحب مغفور کے شاگرد تھے پڑھیں
(یہ وہی مولوی ولی اللہ صاحب ہیں جنکے انتقال کی تاریخ کلیات تسلیم میں
یوں مندرج ہے)

قطعہ تاریخ وفات حقیقت آگاہ معرفت دستگاہ حضرت شاہ ولی اللہ بھڑایچی قدس سرہ

آہ جب حضرت ولی اللہ شاہ بھر سیر روضۂ رضواں چلے
خامۂ تسلیم نے لکھا یہ سال • بادشاہ کشور عرفاں چلے

۱۲۸۳ھ

اکثر آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ ہمارے اوستاد مولانا محمد عبد الاحد صاحب
ستشاد فرنگی محل لکھنؤ کے بزرگوں کے فیض سے ہمکو چار حرف آگئے ہیں

حضرت تشناد کو میں باوجود بے ہستی عندو بھکم جانتا ہوں وہ ماہر فن اور عالم اقدس
ہیں۔ راقم ہیچمدان قرش کے پاس اس مضمون کے اکثر سرفراز نامے بھی موجود ہیں۔
آپ خوشنویس بھی ہیں اور اس فن میں آپ کو منشی عبدالحی صاحب
سندیلوی سے کہ آپکے والد کے بڑے دوست تھے تلمذ حاصل ہے۔
چنانچہ کلیات تسلیم آپکے قلم سے لکھا ہوا مطبوع ہو کر صفحہ ہستی پر یادگار ہے
وصفحہ ۸۳۰ کلیات تسلیم) میں ہمارے مکرم منشی فدا علی صاحب عیش مرحوم
لکھنوی کہ کہنہ سال مشاق تھے تقریظ میں لکھتے ہیں کہ (بہ تصحیح تمام وتنقیح مالاکلام
بخط خاص مصنف علام لیبب ہو کر مطبوع طبائع عشاق انام وپسندیدہ کافہ
خاص وعام ہوا) اسے سبحان اللہ کیا پختہ خوشخط حرف ہے۔
فن شاعری میں آپ نواب میرزا محمد اصغر علیخان نسیم دہلوی شاگرد رشید
مومن خاں دہلوی کے شاگرد رشید ہیں (یہ وہی مومن خاں ہیں جنکی ہمعصری پر
غالب مرحوم کو فخر تھا یہی دو اوستاد اپنے رنگ میں آجتک یگانہ تسلیم کئے
جاتے ہیں) اور آپ سے تلمذ کا ایک خاص سبب ہوا وہ یہ کہ آپکے بڑے
بھائی منشی عبداللطیف صاحب حضرت نسیم دہلوی کے بڑے دوست
تھے۔ حضرت اوستاد مدظلہ علم عروض وقوافیہ میں یگانۂ روزگار ہیں ہندوستان
میں موہوم ہے۔ بارہا ہیچمدان کہ لاینحل سیجھے بات کی بات میں معرے کی
طرح آپ نے حل کردی۔
نئی روشنی والے دوستو! اگلے لوگوں کی محبت اور حالت ہی اور تھی وہ
پختہ وضع لوگ تھے۔ اونکا کیا کہنا۔ حضرت اوستاد اوسی گئے ہوئے
قافلہ کی یادگار ہیں۔ دیکھو شاگردی کے مد میں کسقدر اگلے ارتباط کی پابندی کی
اب تو وہ زمانہ ہے کہ کسی کی دوستی اعتبار کے لایق نہیں اور اگر تجھے تو
آجکل کے انگریزی دوستوں کا شمار تاروں سے زیادہ ہے ایک شیشی
لیونڈر اور ایک بکس سیگار میز پر رکھ لیجئے اور تماشا دیکھئے۔ اب وہ
سچی محبت کہاں۔ اگر غور سے دیکھو تو اس اندھیری دنیا میں یہی ایک شمع
آخر ہے۔ جسکی روشنی جہان میں پھیلی ہوئی ہے۔ ورنہ وہ زمانہ وہ لوگ

[illegible] نشان [illegible] کا بھی پتا نہیں [illegible] زبان [illegible] سے بھی [illegible]
جن سکوں سا بچے شعر اور آجکل کی کیٹیوں کے جلسوں کے فقیر ایسے قابل ہیں جو حضرت
تسلیم مدظلہ کے شاعری کے رنگ کو سمجھ سکیں۔ اسے غالب خدا جانے کیا کہہ گیا
ع اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

سلسلہ شاعری کا حال

میں نے رہے سہے اگلے بزرگوں سے پوچھا اور تذکرہ آبحیات دیکھا مصنف آبحیات کی تحقیق میرے خیال میں ضرور اعتبار کے لایق ہے۔ حضرت اوستاد کی شاعری کا سلسلہ سودا۔ اور درد دہلوی سے ملتا ہے اور وہ یوں کہ حضرت تسلیم لکھنوی نسیم دہلوی کے شاگرد ہیں اور نسیم مومن خاں صاحب کے شاگرد اور مومن شاہ نصیر دہلوی کے شاگرد تھے اور نصیر شاہ محمدی مایل کے شاگرد تھے اور مایل شاگرد قیام الدین قایم مرحوم کے تھے۔ اور قایم میری طرح دو اوستادوں کے شاگرد ہوئے یعنی سودا اور درد دہلوی سے مشورت لی۔ اس تحقیق میں حقیر کا بہت بڑا وقت صرف ہوا حضرت تسلیم مدظلہ سے بھی اسکی تحقیق کی اوستاد نے فرمایا کہ اسکی تحقیق کامل طور پر تو مجھے نہیں ہے مگر کسی قدر ہے مصنف آبحیات کا بیان قابل اعتبار ہوا سبحان اللہ اور سودا اور درد خدا و مدمخ ہو اور یہ اون کی یادگار ہیں سردست لکھنؤ میں یوں تو اکثر شاگرد حضرت نسیم دہلوی کے ہیں مگر یہ شہرت اور مقبولیت عام کا تمغہ کسی کو نصیب نہیں لکھنؤ تو لکھنؤ دہلی کو اگر آپ کی ذات پر فخر ہے تو بیجا نہیں کیونکہ دہلی کی مردہ شاعری اور وہاں کے بزرگوں کا نام اسی پیغمبر آخر زمان نظم سے دنیا میں قایم ہے۔

بہیچمدان ۱۳۱۱ھ میں بنارس ہوتا ہوا لکھنؤ گیا وہاں۔ مکرمی میر خورشید علی نفیس چراغ خاندان انیس زندہ تھے ملے دیر تک ادہر اُدہر کا تذکرہ رہا۔ اس کہنہ سال نے بھی حضرت اوستاد تسلیم کا نام بڑے اعزاز سے اپنی زبان پر لاکر یہی کہا کہ ایسے شعرا کو جانے دیجئے یادگار سلف اور مستند ہیں تو یہی ہیں اور غزل گوئی اردو کی انہیں سے قایم ہے جن آنکھوں میں اس

تحقیق حقیر عرش

اس میں شک نہیں کہ حضرت تسلیم کا رونا سچ ہے مگر پھر بھی جانے شکریہ منشی
تحمل حسین صاحب ایک میرے معزز ہمدرد ہیں دشمنوں سے خدا بچائے مجھے جیتا جی
مرشد لاہوری نے ایک بار لاہور سے لکھا کہ آپ کس خیال میں بیٹھے ہیں اس وقت
ایک صاحب رامپور سے آئے ہیں اون سے معلوم ہوا کہ آپکے اوستاد ملک الشعرا
تسلیم راہی ملک بقا ہوئے۔ خدا دیکھ کر میں فرط حسرت سے نقش دیوار ہوگیا اب نہ
تو مرتا ہوں نہ بولتا ہوں۔ بتلائے آفتاب غروب ہو جائے اور اخباری دنیا میں خبر
نہ ہو۔ تھوڑی دیر بعد ہوش آیا کہ اے ہر چند لکھنؤ اور دہلی میں اور اوستاد موجود
ہیں۔ مگر اونکے جوڑ کا کون ہے اب اپنا دیوان کس کو دکھاؤں جن آنکھوں سے کہ
ناسخ مرحوم کے دیکھنے والے کو دیکھ چکا ہوں تو اور کس کو دیکھوں۔ بہتر ہے کہ اپنے
کلے دیوان کی طرح اس دیوان کو بھی جلا کر دل کی لگی بجھاؤں۔ (ہیچمدان عرش نے
ایک دیوان بنارس میں عاشقانہ صاف رنگ کا لکھا تھا ناسخ مرحوم کے کفش بردارو
کی صحبت میں وہ کلام ناپسند آیا آخر بیس جزو کا دیوان جلا کر بیٹھ رہا) مگر پھر
استقلال نے اپنے دامن سے آنسو پونچھکر کسی قدر اطمینان دیا اور نشان منشی
تحمل حسین صاحب کا موجود تھا اونکو خط لکھا۔ میرے مہربان نے بڑی تشفی کے ساتھ
ایک عنایت نامہ بھیجکر یہ لکھا کہ یہ خبر محض غلط مشہور ہے۔ اوس کے بعد حضرت
اوستاد نے بھی رامپور سے تشفی کی۔ غرض اس کہنہ سال سن رسیدہ کی بابت
اکثر ایسی خبریں اوڑی ہیں اور بارہا پورب کے بوڑھے شاعروں نے مجھکو دیکھ کر
حیرت کی نظر سے پوچھا ہے کہ کیا اوستاد تسلیم زندہ ہیں۔ اور اس کا خاص
سبب ترک سخن ہے

میرے دوستو یہاں اس عبارت سے صرف غرض یہ ہے کہ میں نے منشی
تحمل حسین صاحب کی تحریر دیکھی استعداد معقول تھی اور عبارت دلخراش۔ خدا
انہیں اگر ذوق سخن عطا کرے تو اپنے والد کا نام روشن کر سکتے ہیں کیونکہ پانی کا ایک

قطرہ کنار صدف میں رہ کر گوہر ہو جاتا ہے۔

اور متعلقین کی مختصر حالت

حضرت تسلیم مدظلہ کے صاحبزادہ منشی تجمل حسین صاحب کی والدہ مدت ہوئی کہ لکھنؤ اپنے وطن سے آئیں اور ہیضہ میں مبتلا ہو کر قضا کر گئیں۔ پھر دوسری شادی وہیں کی منشی تجمل حسین صاحب کی یہ والدہ ابتک رامپور میں تھیں [illegible] میں قضا کر گئیں ایک دم ساد اا قدیم وقت کی رہ گئی تھی افسوس وہ بھی ہیضہ میں مبتلا ہو کر راہی عدم ہوئی۔ آخر وقت میں اس نے نمک کا بڑا پاس کیا اور استاد کی بہت خدمت کی۔ اب استاد کی بیکسی پر رونا آتا ہے۔ اور اس پر یہ بیان آپ پیچھے دل زلزلہ دیتا ہے کہ بھائی اب یہ بڑا زمانہ آخر ہے کہیں لوح دیگر ہوا تو [illegible] ایسا کون ہے سارے خانہ ویرانی تیر اثر ا ہو۔ ضعیفی کا عالم اور یہ تتمہ فرش۔ جو حضرت تسلیم کی علالت پر تحریر کرتے کرتے مر جائیگا جیتے جی چاہتا ہے کہ گنگا کو ترک کر کے رامپور چلا جائے۔ اور آخری وقت میں اس استاد کا ساتھ دے۔ مگر اے دکھ درد کے سمجھنے والو۔ متعلقین کو کس پر چھوڑوں۔ دکی فارغ البالیاں جاتی رہیں گھر تباہ ہوا کئی لاکھ کا قرضہ اد ہوں لگا ہے کتابے کی تربیت بھی خدا پناہ دے۔ تو جانے شکر ہے۔

حال ملازمت اول

"میرے دوستو۔ آخر مجبوری نے تباہ کر کے ملازمت کا خوگر کر دیا۔ اب بتاؤ ملازمت نہ کرتے کیا کرتے"

محمد علی شاہ بہادر خلد آشیان کے زمانہ میں آپکے والد بہت بیمار ہوئے امید زندگی کی نہ رہی۔ بادشاہ کے حضور ایک عرضی پیش کی مضمون یہ تھا کہ خانہ زاد بہ سبب پیرانہ سالی و علالت قابل بجالانے خدمت کے نہیں رہا۔ امیدوار کہ میرا لڑکا مسمی محمد امیر اللہ کہ نوجوان اور پڑھا لکھا ہے میری نوکری پر عوضی مقرر ہو جائے۔

"لے تھے۔ زمانہ اوس وقت نوکریاں اپنے وارث کے رہتے ہوئے دوسرے کو نہیں دی جاتی تھیں" چنانچہ اوس عرضی پر حکم ہوا کر (موافق سوال سابق) عمل آمد ہو اور آپ اپنے والد کی جگہ پر اوہدہ دار ہو کر پلٹن میں رہنے لگے تیس روپیہ ماہوار ملنے لگا مدتوں رہے اور اوس زمانہ میں حضرت نسیم دہلوی اور ان کے ہمعصر اوستادوں کی صحبت میں برابر بیٹھنے اوٹھتے۔

اے دوستو یہ اور ہی زمانہ تھا۔ جس وقت کا یہ قصہ ہے اوس کا تذکرہ لیجیئو۔ یہ گورے چہرے والے یورپین بہی شاید کہیں کہیں ہوں۔ ورنہ شاہی زمانہ تھا ہمارے علم عربی و فارسی کی قدر تھی۔ الہی تو نے زمانہ کا ورق کس طرح الٹ دیا۔ میری آنکھیں اوس وقت کی لکھی ہوئی عبارت کو پڑھنا چاہتی ہیں۔

حضرت اوستاد مدظلہ فرماتے ہیں کہ یہ وہ زمانہ ہے جو میں نے ناسخ اور آتش کو دیکھا۔ اپنی آنکھوں کی دیکھی ہوئی حالت فرماتے تھے کہ ٹکسال جو محلہ چوک لکھنؤ میں موجود ہے ناسخ وہیں رہتے تھے۔ صبح و شام پھاٹک پر آ بیٹھتے تھے چند لڑکے نابالغ سے ہنسی دل لگی کر کے لڑکوں کو کچھ سودا کھانے پینے کا دلوا کے اپنے کمرے میں جا بیٹھتے تھے پھر شاگردوں سے یا اور احباب سے صحبت رکھتے تھے۔

اے اوستاد ناسخ۔ آج تم کہاں ہو۔ خدا کے لئے اپنی زیارت سے خواب ہی میں مشرف کرتے۔ تمہارا عاشق کہاں عرش خستہ جگر تمہارے دیوان کو دیکھ دیکھ کر روتا ہے ع

یاد آتے ہیں مجھے حضرت ناسخ جو وزیر ٭
کیا ہی اشکوں کی لگاتی ہے جھڑی میری آنکھ

آتش مرحوم کی حالت اپنی آنکھوں کی دیکھی یہ فرماتے تھے کہ میں نے آتش کو بہت دیکھا ہے جس محلہ میں میں رہتا تھا اوسی محلہ میں وہ تھے انکے بیٹے محمد علی جوش سے بہی ملاقات تھی اوس وقت میں آتش کی یہ وضع تھی داڑھی حلق سے لگی ہوئی اور ڈھیلے ڈھالے انگرکھے پہنتے تھے۔ ان سے اور ان کے

علاقہ تھا ہمدم محبت سے ملاقات تھی کیا کہوں وہ کیا زمانہ تھا
ہائے زمانہ تونے مار ڈالا - اے زندگی پر اکڑنے والو سدا حال رونے کا ہے
پوچھو مرے بس جالے دو - ابھی رومال نچوڑ و گنگا تو طوفان ہوگا - صفحہ ہستی
کی کیسی بولتی چالتی تصویریں نظروں سے پنہاں ہو گئیں - خدایا وہ زمانہ
والے لوگ کیا ہوئے - ان واقعات کو سنکر جی چاہتا ہے - کہ کسی ایسے مقام
سنسان میں چل کر رہیے جہاں بقول استاد ع

ذرہ و اختر زمین و آسمان کوئی نہ ہو

یہ وہی دنیا ہے یاد و سہری میں اون حالات کا سننے والا ہوں - اوسپر
آنکھوں میں آنسو ہیں - میرے دوستو حضرت تسلیم کے دل سے پوچھو خدا
جانے کیا حال ہوگا - اسوقت ہندوستان کے مشہور و معروف مستند
اوستادوں میں یہی ایک باقی ہیں جو اپنی آنکھوں سے بھری محفل کو
ناسخ و آتش کے درہم برہم ہو جاتے ہوئے دیکھ چکے ہیں صبح ہو گئی ہے
سینکڑوں شمعیں جل کر بجھ چکیں یہی ایک شمع آخر ہے جس سے یہ نشان
ملتا ہے کہ رات ایک محفل تھی اور وہی محفل تھی - اب کمیٹیوں کے جلسے
رہ گئے ہیں - حضرت اوستاد کا ایک مطلع یاد آتا ہے معلوم ہوتا ہے
کہ پرانی شاعری اور آجکل کے شعرا کی حالت دیکھ کر بزم سخن میں سخت گھبرا
گئے ہیں اور فرماتے ہیں کہ -

کیجئے ایسا جہاں پیدا جہاں کوئی نہ ہو
ذرہ و اختر زمین و آسماں کوئی نہ ہو

اور گھبرانے کا سبب بھی مقطع میں موجود ہے - سنئے
تو کہ بیٹھ کیا کریں تسلیم ایسی بزم میں جسمیں سب اوستاد ہوں اور نکتہ داں کوئی نہ ہو
[illegible]

دوستو میرا شوق مجھے اسوقت ایک ایسی بزم میں لے جاتا ہے
جہاں نئی شاعری اور پرانی کے مضامین کے [illegible] نذر دیتے ہیں اور [illegible]
کرنے والے بیٹھے ہیں - آپ سننے کے قریب ایک شمع ہے -

[illegible] ہے۔ اور یہاں پہ ایک بیاض تیار ہو رہی ہے۔ وہ بھی دل
[illegible] کسی طرح محض [illegible] ہے ہاں اس میں ایک مطلع ہے وہ سنا
[illegible] حیرت افزا خموشی سخن آرائی ہے
بے زبانی ترے میری ہے وہی گویائی ہے
[illegible] سبحان اللہ کیا کہنا۔ رشک کی آگ میں جلنے والو اس شمع کی گفتگو
سمجھ گئے نا۔

واجد علی شاہ بہادر خلد مکان کے وقت میں ایک خاص وجہ
سے آپ عہدہ داروغہ داری سے برطرف ہو گئے۔ تین برس تک
[illegible] روز بجز شاعری بیکاری میں اور کوئی شغل نہ رہا۔ اپنی بحالی
کے لئے بہت کوشش کی مگر کارگر نہ ہوئی۔ آخر متوکل ہو کر بیٹھ رہے۔
خدا نے بعد تکلیف پھر راحت دی۔ تحمل توکل میں پھل آئے اس کا
مزا چکھ کر اب دربار شاہی میں آئے ہیں۔

دربارِ شاہی اور حالِ ملازمت بارِ دوم

[illegible] یہاں سبز مخمل میں منڈھی ہوئی کرسیاں اور بلور کا
میز اور لیمپ نظر نہیں آتا میری آنکھوں سے دیکھو قاقم و سنجاب
[illegible] قالین کا فرش ہے۔ فرشی جھاڑ اور کنول روشن ہیں۔ ایک طرف
تخت شاہی ہے۔ جس پر بادشاہ جلوہ افروز ہیں اور فرش پر بڑے
بڑے ذی علم اور امیران قرن بیٹھے ہیں۔ محمد رضا خاں برق لکھنوی
شاگرد رشید شیخ ناسخ استاد سلطان کو دیکھو اک بیاض کی غزل
[illegible] نظر اصلاح حاشیہ چڑھا رہے ہیں۔ شعر شاعری یا عیش و
عشرت کا تذکرہ [illegible] فن کے ماہر فارغ البال نظر آ رہے ہیں
[illegible] برہم ہیں امانت وغیرہ بھی ہیں۔ بتلائیے صحبت آپ حضرات کو کیونکر
پسند آئے گی۔

اس بادشاہ اقلیم سخن کا یعنے استاد تسلیم کا قدر دان اور جوہر شناس
کے اور کون ہوتا جب واجد علی شاہ خلد آشیان کا فیض عام مشہور جہان
ہوا اور اہل کمال کا مجمع ہوا تو استاد ہی کہ اقلیم نظم کے بادشاہ تھے
بوساطت جناب کپتان مقبول الدولہ احسان الملک میرزا مہدی علیخاں
بہادر ثابت جنگ قبول تخلص شاگرد رشید شیخ ناسخ کہ استاد کے
بڑے دوست تھے۔ اپنے قدر دان سخن واجد علی شاہ تک پہنچے اور
زمانے کی ضرورتوں سے مجبور ہو کر اپنے استحقاق سوز دن کر کے اور خوشخط
لکھ کے ایک عرضی پیش کی۔

اس سے فارسی کی استعداد ظاہر ہوتی ہے۔ میرے نوجوان
دوستو۔ قبول کو جانتے ہو۔ بڑے ماہر فن اور بڑی عزت شخص تھے۔
اوستاد اُن کے ملنے والوں میں ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ کہ امیر مرحوم
اور داغ کم عمر اور زیر تعلیم ہوں گے۔ کیونکہ ان دونوں اہل کمال
کے خطوط اور بیان نے یہ ظاہر کیا ہے کہ استاد تسلیم مدظلہ کے شاعری
کی عمر ہم لوگوں کی عمر سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ بتاؤ میں انکی صحبتوں میں
ہمعصری کے خیال سے ایسے کہنہ سال کو زبردستی کیونکر بٹھا دوں۔
زمانہ پانے سے کیا ہوتا ہے۔

عرضداشت آنحضرت ابو المنصور ناصر الدین سکندر جاہ فیض زمان محمد واجد علی شاہ خلد اللہ ملکہ

بعرض شہنشاہ عالی مکان — فلک آستان و ملک پاسبان
ہنرمند و ہم قدر دان ہنر — چو خاقان و قیصر بہ گیتی سمر
بشان و بشوکت [illegible] و بجاہ — جہان تا فنا ہست چو خورشید و ماہ
[illegible] تسلیم شوریدہ سر — ز دل می کشد نالہ نم اثر
بہ لطف و کرم ساعتے ہوشدار — بافسانۂ من دمے گوش دار
از دست گردوں بجان آمدم — ز بیچارگی در فغاں آمدم

[illegible] یکچند بخت بعطا گذشت
بعهدی که دولت رسیدی تو بود
[illegible] خلعت را بعهد عز و شان
بهمراه مهدی علی خان قبول
هم از خوشنویسی هم از شاعری
نفس [illegible] نکهت بر آورده
حیاتم به عیش و طرب مے گذشت
که ناگاه این چرخ نامهربان
حسد برد بر عیش و آرام من
برضا را منع کرد بر ملک و مال
نه آن باده ماند و نه آن جام ماند
چو ارباب جوهر چه ارباب جاه
بسے جاده ہائے غربت شدند
من از تیره بختی چو دود و فغان
چو نقش قدم خاک بر سر مدام
فلک را به این ضعف تاب و توان
کنون بر سرم آنکه جفای رود
بسے کردم اندیشه با جان خویش
بدرگاه آن شاه گردون وقار
[illegible] الم شادمانی کنم
بیاهم چو غنچه بخود از نشاط
نویسم قصیده بعهد عز و جاه
به شیرین و گر تاب سنبل درہم
ولیکن چه سازم که بیمایگی
که در رشک [illegible] گوهر نماند

که [illegible] چو گل گذشت
جهانگیر نقش هم نگین تو بود
همی خواند بر منبر آسمان
مرا بود اعلان خدمت حصول
قوی داشتم جهان چاکری
گذشته نه بے خنده چون گل دمے
به آرام و دل روز و شب میگذشت
دگرگونه شد در پے امتحان
نمک ریخت در باده جام من
فتاد اختر نیکخو در وبال
گر از شکوه بخت ناکام ابد
به یکبار گشتند جمله تباه
بسے زاویه گیر تربت شدند
نه در خاک رفتم نه بر آسمان
به بیچارگی می کنم صبح و شام
هنوز است با من سر امتحان
که از باد بر نقش پا می رود
کزین شهر بیرون کنم رخت خویش
کشم انتقام از غم روزگار
به پیرانه سر نوجوانی کنم
با فسردگی کم کنم ارتباط
بخوانم حضور شه هم کلاه
بگوش گل آواز بلبل دهم
رسیده است اکنون بدان پایگی
بزردی او صورت زر نماند

نہیں است بس در عشاق دوستاں	گردارم وفائے تو در بزم باں
بود پاسئے پرکار تا در سفر	بود نقطہ تا محور مرکز مستقر
نمود ے تو باد ا بگردش مدام	محبت تو دارد بآرام کام

نمکخوار سرکار عالی جناب

جگر خستہ تسلیم خانہ خراب

جناب سحر فیرانی کی باتیں نہیں بھولیں. حقیقت یہ ہے کہ اس عرضی میں جو کچھ اپنی بے سرو سامانیوں کو تباہیوں اور حیراں دیدہ جو نے کا حال افسوس کے پیرایہ میں لکھا ہے وہ کچھ اس طرح ادا کیا ہے کہ مجھے سعدی کی فصاحت یاد آ جاتی ہے. جناب سحر نے حضرت تسلیم کے فارسی نظم پر مجھے بھی کہا کہ زبان اردو تو انکی زبان ہیں ہے فارسی میں بھی وہ استاد ہیں. سعدی کے جو تعطلی حالت بیکسی ہے وہ ہی رنگ ہے. جسکو میرے ناظرین دیکھ رہے ہیں گویا نخل فکر کی خوشنما پتوں پر ہلکا دانی رنگ ہے اور وہ صفائی ہے اور اس میں گلاب کے دو چار پھول ہیں. وہ رنگینی ہے. اللہ کیا خوشنما درخت ہے آنکھوں میں تراوت آگئی۔

اس عرضی کے ساتھ ہی ایک قصیدہ بھی نذر کیا تھا چنانچہ وہ اہل نظر کے ملاحظہ کے لئے درج کرتا ہوں۔

خاقانی اور عرفی کے کلام کا مزہ آتا ہے. بعض موقعوں پر صنعت غلو نے قصیدہ کو ستارے سے زیادہ روشن اور بلند کر دیا ہے. دوربین کی ضرورت نہیں جنکی لگی ہوئی آنکھیں کافی ہیں ع

حاجت مشاطہ نیست روئے دل آرام را

قصیدہ

جس طرح نہ دل تڑپے رگ جاں کے برابر	ہر دم ہے دم خنجر براں کے برابر
ناکامی قسمت ہے جھکا تہ گردوں	ہر روز تمنا شب ہجراں کے برابر
تدبیر سحر شام کو ہوتی ہے دگرگوں	کیا کیا ہیں کرم گردش دوراں کے برابر
ادم میں یہی تدبیر ہے تقدیر سے ایسی	جس طرح پشیماں ہو پشیماں کے برابر

بتقواسے خوشنویس والے خوشگو   ہر دو فن میں یکتا و ہنر و دفتر
اسم تم مندرج ۔ دفتر شد   لیست و ٥٥ روپیہ مقرر شد

غرض وہی تیس روپیہ ماہوار جو پنشن میں ملتے تھے ابتدا مت جیب خاص بادشاہ سے تا انتزاع سلطنت آپکو ملتے رہے تنخواہ لانے کے لئے آپکو جانا بھی نہیں پڑتا تھا۔ گھر بیٹھے آپکے بڑے بھائی منشی عبد اللطیف صاحب مرحوم کہ ملازم منشی خانہ شاہی میں تھے پہنچا دیتے تھے چنانچہ عرصہ تک آپ نے آرام سے زندگی بسر کی۔ مگر زمانہ غدر کا جب سامان پیدا ہوا آپ پھر او شد ار مقرر کر دئے گئے اور کام انجام دیکر تیس روپیہ ماہوار خزانہ شاہی سے لیتے رہے۔

غدر کا اثر

اُسے لکھنو سے ۔ قصر میں جنکے ہزاروں جھاڑ ڈکو جلتے تھے اُنکی تربت پر بھی اب جلتا نہیں شب بھر چراغ قاقم و سنجاب اور مخمل کے فرش پر بیٹھنے والے پاؤں پھیلائے خاک میں رو رہے ہیں۔ اُنکے وہ بڑے بڑے محل جہاں اہل علم و اہل ہنر بیٹھتے تھے آج وہاں ابابیل نظر آتے ہیں جن کے در پر ہاتھی کھڑے ہوتے تھے وہاں کتے بھونکتے ہیں۔ وہ بیگمات و مخدرات عظمت سمات جنکے جسم میں چادر گل گڑتی تھی۔ آج اندھیری تنگ قبروں میں سخت زمین پر ٹھٹھر رہی ہیں۔ میرے احباب نے یہ مطلع سنا ہوگا کہ

بر مزار ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

وہ باغ جہاں سوائے پھول پھل کے کہیں سبزہ بیگانہ تک نہ تھا آج کانٹے سے بھی زیادہ خشک ہے۔ ہر طرف خاک اُڑ رہی ہے۔ سلطنت لٹ گئی۔ اہل علم و اہل ہنر کے تتر بتر ہو گئے۔ دنیا منقلب ہو گئی۔ [illegible] کے متوسلین بعض آباد سے چلے آئے۔ صرف آپکے بڑے بھائی لکھنو میں تھے حضرت [illegible] آپ چلے آئے تھے مگر افسوس اس زمانہ میں

نواب کلب علی خاں والئ رامپور ولی عہد تھے نوکری کرلی

حال ملازمت بار سوم

یہ نیرنگ دنیا کو دیکھ کر تارک دنیا ہو جانے کو جی چاہتا ہے۔ جس چمن کو فصل بہار
میں شگفتہ پایا۔ جہاں گلاب اور ہر طرح کے پھول کھلے تھے۔ خزاں میں
اُسے دیکھ کر بے اختیار رونا پڑا۔ نہ وہ پھل نہ وہ پھول نہ وہ قمری نہ وہ بلبل۔
جس محفل میں شام کو ساقی اور ستار مئی اور دلدار یار غمگسار بیٹھے تھے اُسی
کو صبح کو دیکھا تو گورستان کا عالم یاد آگیا۔ نہ وہ لوگ نہ وہ باتیں مختصر یہ کہ ہر
شے میں انقلاب ہے العالم متغیر و کل متغیر حادث۔ انسان
کی ہستی کو دیکھیے کبھی ایک بچہ تھا۔ کبھی جوان تھا۔ کبھی پیر ناتوان تھا۔ اب
تو اب خاک میں جا کر سو رہا چار دن تو عزیز و اقربا قبر پر شمع بھی جلا گئے اب
ان کا بھی پتا نہیں خدا جانے انکو کس کی نظر کھا گئی۔ لوح مزار بھی نہیں جو یہ
ظاہر ہو کہ یہ فلاں شخص کی قبر ہے افسوس۔

زمانہ غدر میں حضرت استاد مدظلہ بھی نہایت پریشان رہے۔ رامپور میں
طیب علیخاں بہادر سے ملے اور قصیدہ نذر کیا۔ سلام کرنے کو بار جاتے رہے
مگر وہ اس وقت میں ولی عہد تھے قلیل و کثیر کچھ مقرر نہ ہوا آخر زمانہ آشوب
میں اوقات بسری کا یہ ذریعہ ہاتھ آیا کہ ایک بیگ لڑکے کو پڑھانے کی نوکری کی۔
تیس روپیہ ماہوار اور کھانا ملتا تھا۔ دس بارہ مہینے اسی نوکری میں بسر کیے
یہ وہ زمانہ تھا کہ بڑے بڑے ذی دول اور اہل کمال خدمتگاری کی تلاش
کرتے تھے ورنہ نہیں ملتی تھی۔ شہزادے بھیک مانگتے تھے اور محروم
رہ جاتے تھے۔ دس دس گیارہ مہینے تک ڈاک اور رستے کا انتظام چونکہ
صاف نہ تھا اس لیے حضرت تسلیم مدظلہ تڑپ تڑپ کر رہتے تھے آپ
و دات تھا ہی لوگ سب چھوڑ دیا تنہا کسی کی کسی کو خبر نہ تھی کہ کون زندہ
ہے مردہ کہاں ہے اور اسی زمانہ میں آپ کا قدیم دیوان بھی ہمراہ اثاث البیت
کے لٹ گیا ڈھانے یہ اوسی لکھنو کا ذکر ہے جس کی تاریخ نے یوں ذکر کیا

پہنچ سکے۔ مگر چونکہ یہ کلمہ عالم یاس میں نواب نے کہا تھا۔ حضرت تسلیم نا پسند سے گوارا نہ کیا۔ اور استاد نے فرمایا کہ خدا وہ دن نہ کرے کہ حضور ہوں اور میں وثیقہ کی تنخواہ کھاؤں ایسے اہل شاگرد اب چراغ آفتاب لیکر بھی کوئی ڈھونڈھے تو مل نہیں سکتے۔

اے سبحان اللہ۔ اگلے بزرگوں کے خیالات کسقدر پاکیزہ اور صاف تھے۔ بات یہ وہ لوگ کیا ہوئے۔ بھلا آج کوئی رئیس کسی کو کچھ عطا کرنے کو کہے تو وہ بغیر عدالت رجسٹری تک پہنچائے کب مان سکتا ہے۔

حق تو یوں ہے کہ ان رہے سہے چند کہنہ سال لوگوں کے بعد دنیا میں ایسی باتوں کا مذکور ہی نہ ہوگا۔

اوسی زمانہ میں آخر انقلاب نے وہ دن دکھایا کہ سنہ ۱۲۸۲ھ میں پہلے حضرت نسیم دہلوی راہی ملک بقا ہوئے۔ اور حضرت اوستاد نے یہ تاریخ وفات کہی

کیا کیوں سوختہ خانی تسلیم	داغ ہے سوز نہانی ہے ہے
اوڑھ گئے گلشن فانی سے نسیم	رشک قدسی و قرانی ہے ہے
ہر طرف سے یہی آتی ہے صدا	موجد شعلہ بیانی ہے ہے
منھ سے نکلی دم شیون تاریخ	ناظم ملک معانی ہے ہے

۱۲۸۲ھ

اس کے بعد حضرت تسلیم مدظلہ نے اپنے اوستاد نسیم دہلوی کا کلام بلاغت نظام کہ بے نظیر ہے مرتب فرمایا اور نواب محمد تقی خاں کی سرپرستی اور سعادت سے وہ دیوان سنہ ۱۲۹۵ھ میں چھپوایا۔ اسکے بعد آں قدح بشکست و آں ساقی نماند۔ خود نواب صاحب راہی ملک بقا ہوئے۔ اور اوستاد کو شمع سان روتا ہوا چھوڑ گئے۔ اب جو اہل کمال رہ گئے تھے انہیں اپنے کلام کے چھپوانے کا اور ترک سخن کا خیال پیدا ہوا کیونکہ اپنا یادگار چھوڑنا ضرور تھا اوس وقت میں اہل علم و ناسران فن کے بڑے قدردان منشی نول کشور صاحب موجود تھے انہوں نے حضرت اوستاد مدظلہ کا کلیات اپنے مطبع میں سنہ ۱۲۹۰ھ میں چھاپا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اوستاد جلال میں آپ کے ہمعصر جناب آغا علی شمس

حال ملازمت پانزدہم

جب ملک میں ایسا قدر شناس اہل کمال نہ رہا اور نواب کلب علی خان بہادر والی
رامپور مسند نشین ہوئے شعر و شاعری کا چرچا ہوا۔ تو انھوں نے حضرت
امیر مینائی کو لکھنؤ سے بلا کر شاعروں میں تیس روپیہ ماہوار پر نوکر رکھا
حضوری میں رہنے لگے۔ وہ زمانہ تھا کہ قلق۔ امیر۔ بحر۔ منیر وغیرہ موجود
تھے۔ دو برس کے بعد عدالت فوجداری میں ناظر کیا۔ پھر سرشتہ دار کیا بعد ازاں
آپ محکمہ صدر میں ناظر ہوئے پچاس روپیہ ملنے لگے۔ پھر مدرس فارسی
ہوئے۔ پھر ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہوئے۔ اب سرکار رامپور سے بطور
پنشن [illegible] ماہوار ملتے ہیں۔ گو کچھ کام کرنا نہیں پڑتا ہے مگر صبح سرکاری
کتب خانہ میں حاضری ضرور ہے۔ لکھنؤ کی آمد و رفت بوجہ صاحبزادہ منشی
محمد حسین صاحب اور احباب کے اب تک برابر جاری ہے۔ شاعروں
کی شرکت امیر۔ منیر وغیرہ کے بعد امیر و داغ و جلال کے وقت میں کچھ
ہوتا تھا کبھی امراء سے تشریف لے بھی جاتے تھے۔ تو لوگوں کی غزلیں
سنکر چلے آتے تھے کبھی کچھ شعر پڑھ دیتے تھے مگر گویا ترک سخن کر چکے ہیں
دربار کی آمد و رفت بھی قریب بند ہے عید وغیرہ میں بھی قصیدہ لیکر نہیں جاتے
فہرست نذر میں آپ کا نام ہوتا ہے صرف دستخط کر دیتے ہیں۔ عمدہ بات یہ
ہے کہ نواب حامد علی خان بہادر خلد اللہ ملکہ والی رامپور کو وہ شوق سخن نہیں
والی منگرول آپ کے بہت بڑے قدردان ہیں۔ والی منگرول نے ایک
زمانہ میں اہل کمال کی بہت قدردانی شروع کی۔ ہرچند خود شاعر نہیں ہیں
مگر پھر بھی ادھر ادھر کے شعرا نے آمد و رفت شروع کی قصیدہ پر قصیدہ
گذرنے لگا۔ کثرت سخاوت نے ریاست کو قرضدار کر دیا۔ اب چیدہ لوگوں کی
آمد و رفت باقی ہے۔ حضرت شمشاد لکھنوی کے بھی بہت [illegible]
ہیں اور اکثر یاد فرماتے ہیں) ایک برس آپ منگرول بھی تشریف لے گئے
تھے وہاں جا کر جو آپ نے مجھے سرفراز نامہ بھیجا تھا وہ یہ ہے

[illegible] والیصاحب [illegible] بہ نظر قدر دانی عزت افزائی چاہتا ہے کہ
تعلیم ہیں رہے پچاس روپیہ ماہوار اور جو خرچ کہ ہوگا دونگا۔ کسی طرح کی
تکلیف نہ ہوگی میں نے ہاں نہیں کچھ نہیں کہا۔ اور نہ میرا ارادہ ہے کہ یہاں
رہوں۔ لوگ کیا کہیں گے میرے دوست آپ نے اسکا مطلب سمجھا۔
یعنے رامپور والوں کا یہ طعن ہوگا کہ آخر وقت میں انہوں نے ریاست کا
کچھ خیال نہ کیا اور پچیس روپیہ کو کم جانا) دوسرے یہاں کی آب و ہوا
بھی بسبب [illegible] و نیک ہونے سمندر کے بہت خراب ہے۔ اور خلقت
غیر مانوس نہ میں اونکی زبان سمجھتا ہوں نہ وہ میری۔

واقعی ان حالتوں میں آپ کس طرح تشریف رکھتے ترک کا خیال کیا
اور اوسی پنشن کو غنیمت جانکر واپس آئے۔ مگر بطور پنشن ریاست منگرول
سے بھی کچھ ضرور ملتا ہے کیونکہ ایک بار لکھا تھا کہ میری چودہ مہینے کی تنخواہ
چاہیے نہ اونہوں نے عنایت فرمائی نہ میں نے طلب کی اور سبب ترک
سفر کے کوئی قصیدہ بھی نہیں بھیجا والئی منگرول کے میر منشی محمد اصغر علیخاں
صاحب رامپور کے رہنے والے ہیں ابھی آئے تھے مجھے ملے تھے میں
نے اون سے بھی اپنی تنخواہ کی بابت کچھ ذکر نہیں کیا۔ پندرہ روپیہ ماہوار
اس ریاست سے بھی ملتے ہیں۔

حال عمر

آپکی عمر الہم زندہ قریب ستر برس کے ہے۔ آپ نے خود بھی ارشاد
فرمایا اور ظاہر بھی یہی ہوتا ہے نوّے سال سے آپکی عمر متجاوز ہے۔

آخری سفر

جب رامپور میں چند لوگوں کی برطرفی کی خبر مشہور ہوئی۔ تو پہلے امیر
لکھنوی نے رامپور چھوڑا بھوپال ہوتے ہوئے فکر معاش میں دکن گئے۔
اور وہاں کی خاک پر پاؤں پھیلا کے سو رہے ہیں۔ اسکے بعد داغ کی باری آئی۔

پہلی حضرت [illegible] ہے تمنا ہے کہ دلی سے یقین [illegible]
یار [illegible] دیکھو یہ تمام شاعروں میں داغ ہی کے لئے مبارک ہوا کیونکہ
اسقدر روانی ایسی کی گئی جانکے استاد ذوق مرحوم کی بھی نہیں ہوئی
ہرچند وہ دلی کی گلیوں پر دکن کو صدقہ کرتے تھے۔ مگر وہی دکن اسوقت
اس مرحوم کے نام کو شاگرد کے نام سے تمام عالم میں روشن کر رہا ہے جناب
بصیرہ بلوی استاد ذوق مرحوم بھی یہی گوشہ گیر ہیں پھر حضرت استاد
کے قدم استقلال کو جنبش دی سیدھے ٹونک گئے وہاں آپکے ایک
بڑے سعادتمند شاگرد وزیر محمد خان مرحوم آپکے قدر دان تھے۔ جب آپ
وہاں پہنچے معلوم ہوا کہ وہ توکل فرما گئے۔ اب کہاں جاتے متفکر دل
ہوتے ہوئے رامپور چلے آئے۔ نواب کو خدا نے فرزند تاجدار [illegible] عطا کیا تھا
اس خوشی میں برطرفی رہ گئی آپ بھی رہ گئے۔ ہر چند کہ امیر کے انتقال
کے بعد آپکے معزز احباب نے آپکو دکن کی طرف جانے کی رائے دی مگر
آپ نہ گئے بلکہ حال ہی الحال۔ چمن کچھ اور کہتی ہے۔ وطن کچھ اور کہتی ہے
والی طرح میں آپ نے ایک آہ سرد کھینچکر یہ مطلع پڑھا کہ
میرے دل میں تمنائے دکن کچھ اور کہتی ہے۔ مگر یاد امیر و وطن کچھ اور کہتی ہے
اس سے صبر و قناعت کی بو آتی ہے۔

شاگردوں کا مختصر حال

یہ وہ معاملہ ہے جسکے بارہ میں زبان قلم کی طاقت گفتار زائل ہوئی جاتی
ہے میں نے چند قلمی عریضے بھیجے کہ حضرت استاد نے یہاں یہی کہا کہ
شاگردی اور استادی کیسی شاعران نو و کہن کا دلال ہوں اگر یہ اصرار جو
اکثر لوگوں کا نام آپ نے فرمایا۔ بالکل صحیح ہے۔ اونکا نام نامی درج تذکرہ کرتا
ہوں اور اونکے بارہ میں مشفقانہ رائے بھی ظاہر کرتا ہوں)
مرحوم نوروز علی خان رشید الکھنوی۔ استاد نے انکا نام حق تعریفوں
کے مستحق ہونے کے لایق لکھا وہ مجھے انکی حالتوں کے لکھنے کو مجبور کرتا ہے

بھی بہی جولی صحت ہتی بہت یاد کار ہیں۔

سید عطا کریم صاحب عطا۔ بہاری۔ آپ بہت مضمون رس ہیں۔ میرا انکا ساتھ کیا کہ وہ ایک مشاعروں میں ہوا ہے۔ فضل شاعروں بہت نہیں ہے۔ مگر وہ بیش ہمیشہ کچھ کہہ لیتے ہیں۔ اوستاد نے اکثر تذکرہ انکی غزلوں کے اصلاح کا مجھ سے کیا ہے۔ بڑے صاف باطن شخص ہیں۔

مولوی ظہیر احسن شوق نیموی آپ کا نام اخباری دنیا میں تحقیق اور جلال اور آزاد سے جھگڑنے کے باعث روشن تھا مگر اب انہوں نے لو یا ترک سخن کیا صاحب دیوان ہیں۔ مجھ سے ملاقات بھی ہے۔ اور مشاعرہ میں میرا انکا ساتھ رہا ہے۔ اب داغ کی تعلید کرتے ہیں صاف شاعری آپکو پسند ہے۔ ذی علم ہیں۔ حضرت اوستاذی الشعر شمشاد فرنگی محلی لکھنوی کے بھی شاگرد ہیں زیادہ تر لوگ انہیں شمشادی کا شاگرد جانتے ہیں۔ عظیم آباد میں لیا ہستکرتے ہیں۔

مولوی نظیر حسین فریاد۔ آپ بھی صاحب دیوان ہیں کلام اچھا شگفتہ ہے۔ طبیب ہیں۔ آپ صوبہ بہار میں تشریف رکھتے ہیں۔

انکے علاوہ منشی گور پرشاد قیس اور بہتیرے لوگ ہیں جنکا نام معلوم نہیں۔ مدراس اور رامپور میں سینکڑوں شاگرد ہیں۔ کیا کروں میں نے تو چند بار اوستاد سے پوچھا آپ نے بتایا نہیں۔ ایک بار اوستاد نے سرفراز نامہ میں لکھا تھا کہ میں اس قابل نہیں ہوں جو کسی کو اپنا شاگرد کہوں آپ لوگوں کی شرافت ہے جو مجھے اپنا اوستاد فرماتے ہیں۔ کیا کہوں کبھی کبھی کے کہنے والے مشاعرے کے شوقین بہتیرے ہیں ویسی ہی انکی غزل بھی دیکھ دیتا ہوں کبھی مجھے یہ بھی نہیں پوچھے کہ تعرف کیوں کیا لکھنو میں جو لوگ تھے مر گئے۔ اب امیر مرحوم کے اکثر شاگرد دلی نے اور رامپور کے اکثر مشتقوں نے دق کر رکھا ہے۔ ترک سخن ذکر و کی بتلائے کیا کروں۔ ہاں آپکے اطراف میں سید عطا کریم عطا اور نظیر حسین صاحب فریاد بہار میں خوشگو ہیں

اور پٹنہ میں حقوق ہیں۔ اور گیا میں بجز [illegible] اور کہیں نہیں۔
اور ہاں میں بھول گیا۔ ایک بار آپ نے پرلیس ہو کر اون دنیں منشی
جعفر علی قادر کا نام لیا تھا کہ یہی مجھے اپنا کلام دکھاتے تھے اب دیوان کی فکر
کے باعث ترک سخن کیا گیا کہ اکثر حضرات نے میری معاملت سے اوستاد کے پاس
اصلاح کی درخواست کی آپنے صاف لکھا کہ اور لوگ موجود ہیں۔ اسے ذوق کہکے چشم
حقارت سے دیکھئے۔ سب تمہارے یہ غزلیں لکھا کریں ہم سے کم نہیں۔
اخباری دنیا میں بسر کرنے والا عرش بھی اپنے کو پانچوں سواروں میں داخل کر
بلوہ یادگار سلطہ دہر کچھ اپنا حال رقم کرتا ہے کہ یہیدان کو شاگردی پر فخر نہیں صرف
غلامی پر مدت سے فخر ہے۔ صاحب دیوان ہوں مگر کلام ناپسند طبع ہے۔ عربی
فارسی کی کتابیں عالم باعمل مولانا محمد اسحاق صاحب رحمتہ اللہ اور مولوی عبدالکریم
صاحب سے پڑھی ہیں مگر وہ کچھ نہیں۔ چند کتابیں اپنی تصنیف سے بیش قیمت ہیں
مگر وہ کیڑوں کے نذر کے لئے الماری میں بند کر دیں کیا کروں فصل نکل گئی۔
مضمون کے شعر پسند کرتا ہوں مگر نئی روشنی والے بگڑتے ہیں۔ سوپشت سے
تعلقہ داری بھی ہے۔ مگر والد مرحوم یعنی جناب منشی بندہ علی صاحب وکیل
و رئیس شہر گیا مغفور کے وقت کا تین چار لاکھ روپیہ قرض ہو گیا و حالت بگڑی
ہے۔ اوستاد کے آخری وقت میں اونکی شہرت کو مٹا رہا ہوں۔ اور پیر کبھی
کوئی اوستاد بھائی ساتھ نہیں دیتا اپنی مشق کے بارے میں کیا لکھوں عمر گذر
گئی مگر ہنوز تر دو تزلزل ہے۔ سب شاگردوں میں خدا نے مجھی کو بدنام کننده و ننگ
بنایا ہے۔ جو دل میں پیدا ہوا حتی المقدور اپنا کلام کی جتنوں میں رہ کر زبان کی
درستی کی کوشش کی۔ مگر آپ ووا تنے زیادہ گیا ہی میں رکھا اور اسی کو وطن
مشہور کر دیا۔ اوسپر اہل وطن نے کچھ اس طرح دل بڑھایا کہ مجھے نہ پوچھئے
لکھنو۔ دہلی۔ بنارس و غیرہ کی بہت سیر کی مگر ہنوز جی نہیں بھرا۔ حضرت اوستاد
فرماتے ہیں کہ ہے اور میں جنکو ہے اسے تسلیم شاگردی پہ ناز
میں تسیم دہلوی کے کفش بردارون میں ہوں
اوسی طرح یہیدان بھی اپنی شاگردی پر فخر کرتے کرتے مر گیا

مزے مزے کی باتیں

ہائے دل نہیں مانتا کیا کروں۔ عرش

باعث الفت گیسو مجھے لے آئی ہے عشق پیچاں ہے تیرے باغ کی دیوار و در پر

ناظرین میری آنکھوں سے دیکھیں اس محفل میں چند جہاں دیدہ بلند پروازی کی بال کی کھال کھینچ رہے ہیں۔ بعض اکڑ کر تکیہ لگائے بیٹھے ہیں بعض نوعروس کی طرح سنگار کر کے بے اختیار درد و غم بھلا کر ہنس رہے ہیں۔ اللہ اللہ کیا فارغ البالیاں ہیں خدایا وہ کیسے لوگ تھے کیا اوسوقت بھی یہی دنیا تھی۔ آج تو اون تذکروں کے سننے والے مجھے جھوٹا سمجھ رہے ہیں۔ اون کو کیا کروں۔

حضرت اوستاد ارشاد فرماتے ہیں کہ بلند پروازی کا زمانہ گذر گیا اب تاویل اور استعارہ وغیرہ کوئی چیز نہیں لوگ پرانی لکیر کا فقیر جانکر داد دیتے ہیں عذر مجہول پیش کرتے ہیں کہتے ہیں کہ شاعری ہے کہ مجذوب کی بڑ۔ ہاں رشک مرحوم کے وقت میں یہ ہوا چلی تھی شعرا تمسخر کرنے لگے۔ اور یہ رنگ پسند نہیں کیا۔ منیر مرحوم اور قایل وغیرہ نے اسکو برتا ایک مشاعرے میں قایل نے پڑھا کہ

چھرا چلا فلک پہ بیٹھا نہ جنگ کا وہ چھوٹا ہے بل گاؤ پہ کتا تفنگ کا

اہل نظر نے بھری ہوئی بندوقیں بہت دیکھی ہونگی اس چھرے کو دیکھیں ادہر چیز ہے۔ ایک چھرا تیر کے دل میں سوراخ کر ڈالے اب منیر مرحوم فرماتے ہیں کہ

ع پیٹھ پر تیرے پڑیں گورتے کی چھڑیاں توسہی۔ انکا ایک دیوان ہی اسی رنگ میں ہے اوستاد ناسخ کی تعلیم کا اثر ہے چھڑی نہیں بہولی اب رشک مرحوم کہ مستند اوستادوں اور ناسخ کے ارشد تلامذہ سے تھے۔ کہتے ہیں کہ

چاول الماس گوشت لخت جگر فرقت یار میں پلاؤ نہیں

غرض ادہر یاران طریقت اہل مشاعرہ کے لئے خیالی پلاؤ ہی پکا رہے تھے کہ ایک نازک بدن بیگم صاحبہ آگئیں۔ لیجئے انکی خاطر کیجئے مگر یہ تو کچھ اپنے ساتھ گھر سے بقچو تحفہ لیتی آئی ہیں۔ ناظرین نے انکو پہچانا۔ لیجئے چہرے

ہے کیونکہ دھتا ہے صاف صاف دیکھ لیجئے۔ اے لاحول ولا قوۃ میں
کس خیال میں تھا۔ یہ نوجوان صاحب ریختی گو ہیں۔ اسے لیجئے انکا دعویٰ ہے کہ
استعارہ کی بال کی کھال جو یہ لوگ کھینچکر مشاعرہ میں چھوڑ گئے ہیں اوسکی کھال
کھینچوں گا۔ آپ کہتے ہیں کہ ع

اب بدلے شاعری کے فقط رنگینی کثافت و ایہام پہنو انگرکھا ہانتی کے تھان کا
ہاہو ہو ہو۔ اس انگرکھے کے آگے مینبر مرحوم کا وہ کرتا کیا مال ہے غرض یہ کہ سیکڑوں
شعر مہمل کہہ کے جناب رشک کی طرف کہ اوسوقت وہ اوستاد تھے منسوب
کرنے لگے۔ اوسی بلاؤ نہیں والی طرح میں ایک مطلع کہا کہ

دور سے چھیڑے بلاؤ نہیں رشک بیٹھا ہے بن بلاؤ نہیں

اے سبحان اللہ کیا کہنا۔ مردہ قصابوں کی روح قبروں میں بے اختیار پھڑک گئی
ناظرین اب آپ ہی بتائیں جہاں ہجو پر ہجو ہو وہاں لوگ استعارہ کی
توبہ کیسے کہہ چھپ کر نہ بیٹھیں کیا کریں۔ اوستاد نے ان تماشوں کو بھی طرح
اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ایسے ایسے سینکڑوں قصے ہیں جنکو طوالت
کے باعث نہیں لکھ سکتا۔ کوئی ان حالتوں کو اوستاد کے دل سے پوچھے۔
ہیچمدان بھی پہلے ان بزرگوں کے نقش قدم پر چلتا رہا اور استعارہ وغیرہ سے
دلچسپی رکھتا تھا۔ مگر جب سے یہ حالتیں سنیں جی چھوٹ گیا۔ حق یوں ہے کہ
غزل کا مزا سعدی اٹلی وغیرہ تک ہو گیا

ایک مطلع اوستاد کا یاد آیا ہے۔ اس سے رشک کے پھولوں کی خوشبو
آتی ہے۔ اوس زمانہ کی روش ہی یہی تھی۔

بلبلیں آمادۂ فریاد ہیں گلزار میں حشر برپا ہو رہا ہے کوچۂ منقار میں

مگر مزے میں دودھ اور شربت کا فرق ہے۔ وہاں یہ صفائی اور
لطافت نہیں۔ اہل زبان زبان پر رکھ کر مزا چکھ لیں یہ چیز اور ہے
اور اس میں خداداد تاثیر بہت ہے۔

اوستاد بھی زار زار روتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ

اوج پر ہے چشم تر کا جوش طوفاں آجکل ۔ فلک کف سیلاب ہے گردون گرداں آجکل

ہر چند ہجر اوس مصیبت سے سوا ہے مگر اہل درد اوس مصیبت کو ہجر سے سوا ہی جانتے ہیں یہاں تو وصال کی بھی امید ہے وہاں تو کچھ بھی نہیں شعر احسن بیان اور بلاغت پر نظر ڈالکر موازنہ کریں۔

سعدی کا وہ رنگ جو سہل و ممتنع ہے عجیب رنگ ہے۔ اس رنگ میں بڑے بڑے اہل کمال نے سعدی کا خاکہ اوڑایا مگر اوڑا تو وہ نقش تھا۔ اور نقاشی بھی تو رنگ بھرنا باقی تھا۔ سعدی ایک چیز کے مستثنے کرنے کی خوبی کو کیا خوب بیان کرتے ہیں۔

بنودے بجز آہ بیوہ زنے ۔ اگر بر شدے دودے از روزنے

اوستاد نے اسی رنگ میں مثنوی صبح خنداں میں شکارگاہ کے مقام پر فرمایا ہے کہ

نہ باقی رہا کوئی طائر وہاں
مگر نام کو ایک زاغ کماں

یہاں پر اوستاد سے وہ کام ہوا جو علی حزین سے نہ ہوسکا۔ بہرکیف اس سے میرا مراد یہ نہیں ہے کہ اوستاد ان اساتذہ سے سوا ہیں یا یہ اساتذہ کچھ نہ تھے۔

موجودہ دماغی کیفیتیں

میرے دوستوں نے باغ میں جاکر اکثر کھلے ہوئے پھولوں کو دیکھا ہوگا۔ ہر پھول اپنی طاقت کے مطابق سرسبزی دکھلا کر کھلا جاتا ہے۔ نظر بازوں نے تاروں کو دیکھا ہوگا۔ رات بھر اپنی درخشانی پر نازاں ہوکر صبح سویرے چراغ سحر سے بھی زیادہ اوداس نظر آتے ہیں۔ اس اعتبار سے سمجھنا چاہیے کہ انسان کی قوت بھی ضعیفی تک گویا زائل ہوجاتی ہے۔

حضرت اوستاد کی عمر کی بابت میں لکھ چکا ہوں کہ قریب سو

برس کے ہے۔ اور ستر پچھتر برس کی مشق ہے۔ یہ اوس باغ کا پہول ہے جس کو
انقلاب نے خزاں ہوکر خاک میں ملا دیا۔ مگر اوسکی شان کیہ پہول جسکو میرے
باغبان قدرت نے ایک موزون گلدستہ بناکر ہندوستان کی زیبائش کے
لئے رکھا ہے اب تک سرسبز ہے کیونکہ میری آنکھوں کے آنسو اسکے لئے شبنم
ہیں گرچہ پھر بھی خزاں کے زمانہ کا اثر آنا ضرور ہے کہ یہ گلدستہ کبھی کبھی پژمردہ معلوم
ہوتا ہے۔

یہاں پر حضرت اوستاد کے ایک سرفراز ناموں کا خلاصہ نقل کرتا ہوں۔

(۱) بتیجی مشفقی منشی ظہیرالدین احمد عرش زاد عنایتکم۔ بعد سلام سنت الاسلام
کے ملتمس ہوں آپکی غزل دیکھکر پانچ دن ہوئے کہ روانہ کرچکا اپنی حالت کیا
لکھوں نوے برس سے زیادہ عمر ہے تو وہ بعارضہ باقی ہے: وہ ساعت
عینک میں لکھنؤ سے لے آیا تھا ہو [illegible] ہے مگر وہ دوربین نہیں ہے لکھنے پڑ
کام نہیں دیتی اوسپر بھی کتب خانہ سپرد ہے میں اپنا دوسرا دیوان بھی جمع کر رہا
ہوں ۷۰ جزو لکھ چکا ہوں اغلب کہ ۸۰ جزو ہوجائینگے

رقیمہ نیاز محمد امیر اللہ تسلیم از رامپور

(۲) غزل آپکی دیکھکر منشی اعزازالدین کو درج گلدستہ حدیقہ عادتی کے لئے
دے دی وہ کہتے ہیں کہ میں پرچہ برابر بھیجتا ہوں۔ واللہ اعلم۔ اور اس طرح
میں پرزور غزل لکھکر بھیجئے سے

جنت سے بدل جائے جہنم تو مزا ہو

(چنانچہ ہیچمدان نے دوران علالت میں ایک مختصر غزل بھیجی تھی جو گلدستہ
مذکور میں درج ہے اوستاد کی اس ذرہ نوازی پر مفتخر ہے) میں دیکھکر یہاں
مالک گلدستہ کو درج کرنے کے لئے بھیجدونگا۔ کیا کروں لوگ خواہ مخواہ دق
کرتے ہیں۔ یہاں مہینے میں چار مشاعرے ہوتے ہیں جناب امیر لکھنوی کی
خاطر سے صرف شرکت بھی ضرور ہے مگر اب شعر و شاعری کیا کروں ہر وقت
موت نگاہ میں پھرتی ہے چاہتا ہوں کہ آخر وقت تو خدا کا نام لوں۔

بقول سعدی

اے کہ بیجا رفت درخوابی   مگر این پیچ رو دریابی

۹ ذی الحجہ [illegible] ہجری رقیمہ نیاز امیراللہ تسلیم [illegible]

میرے دوستوں پر ان سرفرازناموں سے پورا حال ظاہر ہوگیا ہوگا۔ ہر چند ضعیف ہیں مگر شوق سخن باقی ہے اور آجتک کلام عیوب سے پاک ہے۔ اور تاریخ گوئی کہ جس سے بڑھکر دماغ سوزی اور طرح کے نظم میں شاعر کے نزدیک نہیں ہے اوس میں بھی ابتک آپکو کمال ہے۔ آپ کی تازہ غزل درج ذیل کی جاتی ہے۔

غزل اوستاد تسلیم

ابتک گئے ہم حسرت ذوق شہادت کم نہیں   ہے دم لبیلو اگر تیغ ستم میں دم نہیں

دردمندان ازل رکھتے نہیں درمان کا غم   سینہ صد چاک گل منت کش مرہم نہیں

روز مرتے ہیں ہزاروں تیغ ابرو دیکھکر   گرمی عالم تمہارا ہے تو یہ عالم نہیں

شادی و غم کا نہیں رکھتے کچھ امتیاز دل   خانۂ آئینہ میں نغمہ نہیں ماتم نہیں

مر مٹے ہم عشق کے شہرے وہی ہیں آجتک   شور رسوائی پس مردن بھی اپنا کم نہیں

نالۂ آتش نشاں ہو نہیں اگر ہیں اوج پر   تو نہیں اے آسمان فتنہ گر یا ہم نہیں

بعد مردن خاک ہی ہوجائیگا کنج گور میں   اپنا بیگانہ نہیں مونس نہیں ہمدم نہیں

سیکھ آئے ہو کہاں سے آج یہ بیگانگی   تم نہیں وہ یار جانی یا وہ عاشق ہم نہیں

بے ثباتی پر بہار باغ کے روتا ہے چرخ   برگ گل پر اشک کے قطرے ہیں شبنم نہیں

بیخودی کا ہو برا کیسے پشیماں آج ہیں   آپ آئے آپ میں بدقسمتی سے ہم نہیں

خط کے آجانے سے حسن و عشق رخصت ہوگئے   اب لگاوٹ کس لئے وہ تم نہیں وہ ہم نہیں

جیتی ہے بعد مردن گور میں دشمن کیطرح   یہ زمیں بھی آسیا رتبے آسماں سے کم نہیں

پاکدامانی کسی مرکے بھی آتی ہے یاد   بے سبب اوگتا لحد پر پنجۂ مریم نہیں

وقت پیری کیا کریں تسلیم ہم فکر سخن
دل میں وہ قوت نہیں کس بل نہیں دم خم نہیں

کلیات امیراللہ تسلیم کو چھپے ہوئے ۱۲۸۹ھ و ۱۳۱۹ھ کے

سے تیس برس کا زمانہ گذر گیا عمر شریف کے اعتبار سے اوس زمانہ میں آپ
ضعیف ہو چکے تھے مگر ذوق جوان تھا خود فرماتے ہیں کہ

پیر ہوں پر ہے جوان ذوق غزلخوانی ہنوز لطف دیتی ہے مجھے میری سخندانی ہنوز

رنگ قدیم کو کیا پوچھئے جو وہ زمانہ ہی مضمون زا شاعرے کا تھا۔ اس زمانہ
جہالت میں کہ فارسی عربی جاننے والے مشکل سے ملتے ہیں اور نا فہم یا انگریزی
دانوں کا شمار تاروں سے زیادہ ہے مگر اوستاد مرحوم کا رنگ نہیں جاتا
اور ایسا خوشنما رنگ ہے۔ جیسے کسی حسین کے گورے گالوں کی ذرا سی سرخی
کہ خواہ مخواہ دل کو بیقرار کر دیتی ہے۔ زبان پر مضمون کا ہلکا رنگ ایسا
موزوں ہے جیسے پلکوں پر آنسو نہ گلاب کے پھول پر پھوار۔
میں کچھ انکا کلام یہاں پر درج کرتا ہوں۔

بھولے سے بھی نہ جانب اغیار دیکھنا — خط و خال ہی ہے خبردار دیکھنا
مانند شمع بیٹھ کے طے کی رہ عدم — یارو یہ معجزہ ہے کہ رفتار دیکھنا
اٹھتی ہے روح دل سے دم نزع ہوشیار — ہم تو عدم کو جاتے ہیں گھر بار دیکھنا
اے درد اضطراب تمنائے دید یار — فرصت میں اک نگاہ کے سو بار دیکھنا
میری خطا نہیں ہے خدایا جو کچھ کہوں — پھر پھیرتا ہے زاہد مکار دیکھنا
تسلیم روئے یار کو حسرت کی آنکھ سے
اچھا نہیں ہے شوق میں ہر بار دیکھنا

اور کیا کا بیدہ ہوتا لاشہ مجھ کمزور کا — سایہ ہے پائے کفن مژگان چشم مور کا
جلتے جلتے شمع کے مانند آخر جل بجھا — منھ نہ دیکھا میرے لاشے نے دہان گور کا
سوز غم سے ہوں میں افتادہ سراپا آبلہ — شیر کا ناخن مجھے ناخن ہے پائے مور کا
دیکھنے کے صاف دل جتنے ہیں سچے قیصر ہیں — خانۂ آئینہ میں حصہ نہ دیکھا چور کا
ضعف میں افتادگی زندان سے کچھ کم نہیں — طوق ہے گردن میں حلقہ موج آہ مور کا
کوئی صدمہ سے فلک شکوہ زبان تک آ گیا — میں لب تصویر ہوں خوگر نہیں ہوں شور کا
تیرہ دل کو نفع کیا تسلیم شو صاف سے
دیکھنا بیکار ہے آئینہ چشم کور کا

۵ قدیم صحبت کا اثر ہے رشک کا زمانہ تھا۔

قریب کام ہے وقت پر نہیں آتا — بجھائے دل کی لگی کو جگر نہیں آتا
کہاں گئے جو عیادت پہ جان دیتے تھے — مزار میں کوئی لینے خبر نہیں آتا
حجاب دیدۂ نرگس سے باغ میں نہ کرو — یہ دیکھنے کی ہیں آنکھیں نظر نہیں آتا
خیال تمام ہے اپنے سے منقطع ہوتا — صدف کے کام کسی دن گہر نہیں آتا
اجل خفا ہے فلک مدعی زمیں دشمن — مرا جہان میں کوئی نظر نہیں آتا
ہنسا ہیں کیا تیری اٹکھیلیاں کہ ہنوز — تجھے وہ نازِ نسیم سحر نہیں آتا

ابھی سے کیا کریں دعویٔ شاعری تسلیم
یہ کام وہ ہے کہ جو عمر بھر نہیں آتا

ہائے دلی تیری بھولی صورت نہیں بھولتی ہے
پژمردہ ہو گئے گل رخسار ہائے ہائے

دلی تباہ ہو گئی مگر وہ باتیں نہیں بھولیں۔ اوستاد بھی ہر چند کہ لکھنو کے متوطن ہیں مگر دلی ہی پر فخر ہے۔ کہتے ہیں میں ہوں تسلیم شاگرد نسیم دہلوی۔ مجھکو طرز شاعران لکھنو سے کیا غرض۔ یوں تو ہر غزل میں دلی کی بو آتی ہے مگر ایک آدھ غزل اوسی رنگ کی درج بھی کرتا ہوں۔

غزل

ہیں اہل صفا بھی ہوں تو کیا ہوں — آئینے کی طرح خود نما ہوں
اس بزم جہاں میں صورت شمع — غیروں کے لئے میں جل بجھا ہوں
نکہت ہوں مگر چمن سے چھٹ کر — ہر یاد میں صورت صبا ہوں
ہوں آہ دل حزیں جہاں میں — جینے میں کمال نارسا ہوں
میں کیا کہوں لطف سیر عالم — ہوں خواب میں خواب دیکھتا ہوں
حال دل گم شدہ ہوں کہتا — افسانہ طراز آشنا ہوں
کم حوصلہ شوق دل نہیں ہے — ہوں جیسے [illegible] میں جا ہوں
کیوں شرط وفا اسی کا ہے نام — تم تو گرو ترک میں بنا ہوں
افسانۂ دوستی ہوں تسلیم — دشمن کا مگر سنا ہوا ہوں

چند جدید تاریخیں حضرت تسلیم کی کہی ہوئی بغرض نمونہ انکشاف حالات دماغ اپنے ناول اور دیوان سے نکالکر درج کی جاتی ہیں یہ محمدان عرش کو باعث فخر ہے

تاریخ دیوان نظم نو نگار مصنفہ عرش

زہے اوج فکر فلک سیر عرش ‏ — ‏ سراپا ہے ایہام حسن کا سخن
کیا جمع دیوان عجب نظام ‏ — ‏ ہوا سرمۂ چشم اہل زمن
نہیں کم زبی زنگ ہلالین ‏ — ‏ بھرا ہیں لفظ در بان دہن
کہا فکر تسلیم نے بہر سال ‏ — ‏ یہ دیوان ہے فخر ارباب فن

۱۳۱۱ھ

ولہ

ہے عرش دیباچہ شیوا بیان ‏ — ‏ کلامش چو اعجاز نفخ سرشت
کنون داد ترتیب منظوم خوش ‏ — ‏ چو گلدستۂ بزم باغ بہشت
پئے سال تسلیم شوریدہ سر ‏ — ‏ ہمہ خوب بے مثل دیوان نوشت

تاریخ ناول ثمرۂ نافرمانی مصنفہ عرش

یہ افسانہ ایسا لکھا عرش نے ‏ — ‏ کہ ہر اہل معنے کو محبوب ہے
نہیں جسکی گفتگو جو بدام ‏ — ‏ زباندان کے نزدیک مرغوب ہے
کہی ہمنے تسلیم تاریخ طبع ‏ — ‏ یہ بے مثل ناول چھپا خوب ہے

۱۳۱۱ھ

معذرت

مجھے نہایت رنج اور افسوس سے لکھنا پڑتا ہے کہ حیات تسلیم کو جس شوق اور دلی خواہش کے تقاضے سے اپنے معزز دوست حضرت عرش کو لکھنے کی تکلیف دی تھی - چند ایک مجبوریوں کے باعث حسب دلخواہ اسکو اچھی طرح چھپوا نسکا کچھ میری بیماری - عدیم الفرصتی پرائیویٹ مصروفیت اور سفر اور کچھ کاتب صاحب اور مطبع والونکی مہربانیوں نے ہندوستان کے مشہور شاعر حضرت تسلیم اور انکے کثیر التعداد شاگردوں اور فن سخنگوئی کے بیشمار شائقوں کو نہایت صدمہ پہونچایا افسوس ہے کہ میں جلدی میں غلطنامہ بھی ترتیب نہ دیسکا دوسرے ایڈیشن میں انشاء اللہ تعالےٰ تمام شکایتیں دور کردیجائینگی اور لکھائی چھپائی نہایت نفیس ہوگی اور اصل بات بھی یہی ہے کہ ع نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول

نیازمند محمد الدین فوق ایڈیٹر اخبار پنجہ فولاد لاہور

اخبار پنجہ فولاد لاہور

(جو ہر بدھ کو پنجاب کے دارالخلافہ شہر لاہور سے شائع ہوتا ہے)

مالک و ایڈیٹر محمد الدین فوق

پنجہ فولاد نومبر ۱۹۰۱ء سے نہایت آب و تاب سے شائع ہوتا ہے۔ یہی ایک اخبار ہے جس نے چند ہی دنوں میں اپنی بے لاگ تحریروں اور اپنے زبردست پولیٹیکل مضامین سے ہمعصروں کے معزز گروہ میں کافی سے زیادہ مقبولیت اور شہرت حاصل کر لی ہے۔ اہل اخبارات کے علاوہ پبلک نے اس اخبار کے متعلق نہایت بیش قیمت رائیں ظاہر کی ہیں اخبارات انگریزی ہوں یا اردو یا کسی اور زبان کے ہمیشہ ایڈیٹر کی لیاقت اور شہرت کے باعث رونق پکڑتے ہیں۔ ملک کا ظاہر ہے کہ پنجہ فولاد کا ایڈیٹر مضمون نویسی میں طاق اور کثیر التعداد تصانیف کے باعث کم سے کم پنجاب میں نہایت عزت کی شہرت حاصل کر چکا ہے۔ انہوں نے پانچ چھ سال تک مختلف اخبارات کی ایڈیٹری سے تجربہ حاصل کرنے کے بعد یہ کام بطور خود شروع کیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس قلیل عرصہ میں لائق اور قابل ایڈیٹر کی محنت سے بفضلہ تعالیٰ جیسی کچھ مقبولیت اس اخبار نے حاصل کر لی ہے۔ وہ حیرت کے قابل ہے۔ اخبار ۱۶ صفحوں پر ہوتا ہے اور تصویر بھی شائع ہوتی ہے مہینے میں دو مرتبہ ملک کے مشہور آدمیوں کے حالات مع تصاویر شائع ہوتے ہیں۔ اور اس وقت تک حضرت فصیح الملک مرزا داغ دہلوی۔ منشی محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار۔ حضور نظام سرکار دکن۔ حضرت شمشاد لکھنوی مشہور شاعر۔ منشی امیر احمد مینائی امیر مرحوم لکھنوی کی تصاویر اور ان کے دلچسپ حالات چھپ چکے ہیں۔ پولیٹیکل، مدنی اور سوشل مضامین پر جس مہذب آزادی اور متانت سے مؤدبانہ طور پر اس اخبار میں بحث ہوتی ہے وہ دیکھنے کے قابل ہے۔ مشہور استادوں کی نظموں، اخلاقی، تمدنی، علمی اور تاریخی مضامین کے علاوہ دلچسپ لطائف و ظرائف اور طبی معاملات بھی ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ شوقین اور اخبار بین ناظرین کیلئے اس اخبار میں دلچسپی کا بہت کچھ سامان ہے۔ نوجوان ایڈیٹر (جس کی عمر ۲۴ سال سے زیادہ نہیں ہے) استاد جہاں نواب فصیح الملک بہادر مرزا داغ دہلوی استاد حضور نظام دکن کا شاگرد ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ مضمون نویسی کے تجربہ اور کثیر التعداد تصانیف کی شہرت کے علاوہ شاعری کی دنیا میں بھی کوئی فرد بشر ان کے نام نامی سے ناواقف ہوگا۔ اخبار کا کاغذ عمدہ لکھائی چھپائی نہایت نفیس اور قیمت صرف (سے ر) روپے مگر پیشگی ما بعد کا کوئی حساب نہیں۔ پیشگی قیمت ادا کرنے والے کو ہر ماہ کوئی ناول مفت نذر ہوگا۔

المشتہر — مینیجر اخبار پنجہ فولاد لاہور

حیاتِ داغ

(یعنے)

ہندوستان کے مشہور شاعر بلبل ہندوستان جہاں اُستاد ناظم یار جنگ
و بیر الدولہ فصیح الملک نواب مرزا خانصاحب بہادر حضرت داغ
مرحوم کی مکمل لائف جسمیں شاعر موصوف کے از عہد تا لحد واقعات
زندگی بیان کر کے اُن کی شاعری پر محققانہ نظر ڈالی گئی ہے -

مؤلفہ

اظہر صاحب ہاپوڑی ملازم دفتر اُردو اخبار لاہور

جسکو

منشی رام اگروال بک مرچنٹ مہتمم تعلیمی کتبخانہ پنجاب
پروپرائٹر اردو اخبار و مالک منشی رام اگروال پریس لاہور

نے اپنے

مطبع منشی رام اگروال لاہور میں چھاپا

۸ر آٹھ آنے

حیات داغ

دیباچہ

برسوں نہیں صدیوں کے بعد زمانہ ایسے شخص کو پیدا کرتا ہے کہ جسکے کارنامے اور سوانح عمری آیندہ نسلوں میں عزت کی نظر سے دیکھے جائیں اور اُن سے سبق حاصل کیا جاوے ۔

دنیا میں لاکھوں علوم و فنون ہیں حتیٰ کہ اُن کا شمار کرنا محالات سے ہے از انجملہ ایک فن شاعری ہے اِس میں شک نہیں کہ موجودہ شاعری یا یوں کہئے ایشیائی شاعری چنداں مفید نہیں اور زیادہ سے زیادہ ہم اُسکی اس قدر عزت کر سکتے ہیں کہ علم ادب کی ایک شاخ کہیں مگر نفس مضمون پر نظر ڈالئے ہی کچھ اور ہی عالم نظر آجاتا ہے ۔ کہیں زلف کی تعریف کی گئی ہے تو اس قدر مبالغہ سے کام لیا گیا ہے کہ کچھ انتہا ہی نہیں ۔ رُخ معشوق کو آفتاب و ماہتاب بتلو دینا تو کوئی بات ہی نہیں غرض ایسی ایسی بہت سی باتیں ہیں جنکی تفصیل لکھنا ہمارا فرض نہیں تاہم موجودہ شاعری سے قطع نظر کر کے ہم قدیم شعرا کے کلام پر نظر ڈالیں تو بڑی آسانی سے ثابت ہو سکتا ہے کہ اہل عرب نے اسی شاعری سے کیسے کیسے کار نمایاں کئے ۔ اُن کے رجزوں نے لوگوں کے دلوں کی کایا پلٹ دی ۔ قوموں کی حالت کچھ اور ہی کر دی ۔

ہندوستان کے بعض طباع حضرات کے بدولت اردو شاعری نے دوسرا رنگ اختیار کر لیا ہے ۔ جو نیچرل شاعری کے نام سے موسوم ہے ۔ اور جس میں زیادہ تر انگریزی سے تتبع کیا گیا ہے بلکہ اکثر نظموں کے ترجمے بھی کئے ہیں ۔ یہ رنگ پھر غنیمت ہے اگرچہ میں خود اس مرض کا مریض ہوں تاہم ایک قابل شخص کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں کہ "اب شاعری کی ضرورت نہیں کیونکہ قوم آسودہ نہیں" الخ اس میں شک نہیں کہ یہ سب پیٹ بھرے کے کھیل ہیں ◆

خاکسار اظہر

مارچ ۱۹۰۵ء

خاندان - وطن - ولادت

حضرت داغ کا خاندانی سلسلہ محمد بن حنیفہ تک پہونچتا ہے۔ خواجہ احمد یسوی رحمۃ اللہ علیہ آپ کے جد بزرگوار تھے۔ اور ان لوگوں میں سے تھے جو قسمت آزمائی کے لئے عرب سے نکل کر ترکستان وغیرہ ممالک میں آئے تھے۔ چنانچہ یہ خاندان جس سے ہمارا ہیرو تعلق رکھتا ہے سمرقند اور بلخ میں آباد ہوا۔ مگر اس کے دو ممبر خواجہ عارف اور خواجہ قاسم مع اپنے متعلقین کے عین اس زمانہ میں جبکہ سلطنت مغلیہ کا شیرازہ بکھرا جاتا تھا اور عنان حکومت شاہ عالمگیر ثانی کے ہاتھ میں تھی اور ملک میں ہر طرف بغاوت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ بزرگان مذکور ہندوستان میں تشریف لائے اور فن سپہ گری کے وہ جوہر دکھائے کہ موخر الذکر کو بارگاہ سلطانی سے نواب شرف الدولہ سہراب جنگ کا خطاب ملا اور اول الذکر کو امیر الامرا نواب نجف خاں بہادر کی رفاقت کا اعزاز ملا۔ حضرت خواجہ عارف کے چھوٹے بیٹے نواب احمد بخش خاں بہادر گورنمنٹ انگلشیہ کے بڑے خیرخواہ تھے چنانچہ محاصرہ بھرت پور کے زمانہ میں آپ جنگ میں بہ نفس نفیس داد شجاعت دیتے تھے اور اس مستحکم قلعہ کے سر کرنے میں آپنے بہت کچھ ہاتھ بٹایا تھا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ انگریزی گورنمنٹ آپ کی خدمات کو وقعت کی نظر سے دیکھتی تھی چنانچہ آپ کو فخر الدولہ رستم جنگ کا خطاب اور ریاست فیروز پور عطا ہوئی۔ رستم جنگ کے سب سے چھوٹے بیٹے نواب شمس الدین خاں بہادر کے گھر ماہ ۱۱۔ ذوالحجہ ۱۲۴۶ ہجری مطابق ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء ایک جیتا جاگتا پتلا مقام دہلی تولد ہوا اور اس کا نام نواب مرزا خاں رکھا گیا۔ یہ وہی ہونہار فرزند تھا جس کی آج ہم سوانح عمری لکھ رہے ہیں اور جس کا پورا نام مع خطاب بلبل ہندوستان جہان استاد ناظم یار جنگ دبیر الدولہ فصیح الملک بہادر نواب مرزا خاں صاحب داغ ہے۔

آپ کے والد نواب شمس الدین خاں کا مکان دہلی میں چاندنی چوک میں واقع تھا۔

حضرت داغ کے والد کا انتقال اور انکی تعلیم کا انتظام

یہ عام طور سے دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ دنیا میں نام پیدا کرنے والے ہوتے ہیں ان بیچاروں

پھر ابتدا ہی سے آسمان ٹوٹ پڑتا ہے - اور انتظام تمام ذرائع ترقی مفقود ہو جاتے ہیں اسی قاعدہ کے موافق حضرت داغ کی صغر سنی کے زمانہ یعنی ۱۲۵۱ھ میں انکے والد نواب شمس الدین خان صاحب کا انتقال ہو گیا مگر آپکی والدہ ماجدہ کو اپنے کچھ زیادہ عرصہ تک پریشان نہ ہونا پڑا کیونکہ ولی عہد سلطنت مرزا صاحب عالم کے اشارہ سے آپ شاہی محلات میں داخل ہوئیں اور انہوں نے شوکت محل بیگم کا معزز خطاب پایا اور یہی ذریعہ حضرت داغ کے قلعہ شاہی میں داخل ہو سکا ہوا اگرچہ آپ قلعہ میں داخل ہونے سے قبل مولوی غیاث الدین صاحب مولف غیاث اللغات سے فارسی پڑھا کرتے تھے مگر اس کے بعد آپنے مستقل طور پر سید احمد حسین صاحب سے جو میر غلام حسین شکیبا کے فرزند تھے درسی کتابیں دیکھنا شروع کیں یعنی کہ فارسی کی تکمیل انہیں حضرت سے کیں اسکے ساتھ ہی ساتھ ہندوستان کے مشہور خوش نویس میر پنجہ کش سے خوشخطی کے اصول سیکھتے تھے - علاوہ ازیں چونکہ قلعہ میں مختلف علوم و فنون کے ماہر موجود تھے خصوصاً فنون سپہ گری کے کملا کا تو وہاں کوئی شمار ہی نہ تھا اسلئے آپنے بھی اس زمانہ کے رواج کے موافق ایک شہزادہ کی حیثیت سے سپہ گری کے اکثر شعبوں میں مشق بہم پہنچائی جنکی تفصیل تو کیا اگر نام بھی لکھے جائیں تو یقیناً ناظرین غیر دلچسپی سے سنیں گے اسلئے ہم انکو چھوڑے دیتے ہیں اور صرف لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ آپنے وہ وہ علوم و فنون اور سپہ گری کے کرتب سیکھے جو اس وقت ایک شہزادہ کو شایاں تھے - از انجملہ ایک فن شہ سواری تھا جسکی آپکو مرتے دم تک مشق رہی -

یہ سب کچھ تھا مگر تاریخ داں اصحاب سے پوشیدہ نہیں ہے کہ اس زمانہ میں - شہزادوں - امیروں - بادشاہوں کے کیا کیا مشاغل تھے - عیش اور نفس پرستی رگ و ریشہ میں خون کی طرح بھر گئی تھی - ہمت مردانہ تشریف لیگئی تھی علمی شغلہ صرف شعر شاعری تک محدود رہ گیا تھا کون نہیں جانتا کہ یہی اسباب اس سلطنت کی تباہی کے باعث ہوئے اسی صحبت میں ہمارے ہیرو شامل تھے اور مصداق کُلُّ اِنسانٍ عَلیٰ دِینِ مُلُوکِہِم - آپ کا رجحان طبع شاعری کی طرف زیادہ تھا -

شاعری کی ابتدا اور مشاعروں کی شہرت

ایک ہندی مثل مشہور ہے کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات محض اسی کے مصداق
جناب داغ جبکہ اُن کا سن شریف بارہ تیرہ سال سے زیادہ نہ تھا اچھی غزل کہہ لیتے
تھے۔ اول تو خود طبیعت دار پیدا ہوئے تھے دوسرے اُستاد ذوق کا فیض سخن
اور سونے پر سہاگہ ہوا۔ ذوق مرحوم چونکہ بہادر شاہ کے اُستاد تھے اسی لئے انکا
بہت سا وقت قلعہ میں صرف ہوتا تھا۔ حضرت داغ بھی ولی عہد سلطنت کے
اشارہ سے اُستاد ذوق کے شاگرد ہوئے قلعوں کے تو وہ ہر مشاعرہ میں شریک
ہوتے ہی تھے مگر شاہ جہاں آباد (دہلی) میں بھی ایسے مشاعرے کم ہی تھے جہاں
جاکر آپ داد سخن نہ لیتے ہوں۔ خدا غریق رحمت کرے اگلے زمانہ کے لوگوں کو کہ
وہ بلا قید سن و سال اچھی چیز کو اچھا اور بُری چیز کو بُرا کہتے تھے آجکل کی طرح
نہ ٹھوک بندی تھی۔ نہ خود پسندی۔ میں نے اپنے وطن سے نکل کر باہر کے چند
مشاعروں کا بھی رنگ دیکھا ہے جن میں ٹھوک بندی ضرور ہوتی تھی یہ ممکن
ہے کہ شوکت کے شاگرد کی غزل کی داد بیان کے شاگرد دیدیں اگرچہ غزل
کے شعر جواہروں میں تولنے کے قابل ہی کیوں نہ ہوں علی ہذا اس کے خلاف
کسی صورت نہیں ہو سکتا کہ طرف ثانی بیان کے شاگرد کی غزل کی داد دیں۔
ہاں اس مقولہ پر ضرور عمل ہوتا ہے ؎

من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو

اس فقرہ سے میرا منشا یہ نہیں ہے کہ میں خدانخواستہ حضرت بیان یا شوکت
صاحب کے شاگردان عقیدتمند کی بُرائی کر رہا ہوں نہیں حاشا وکلا ایسا نہیں
بلکہ عموماً یہی حال ہے یہ نام صرف تمثیلاً پیش کئے گئے ہیں۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ
تھا اب ہم پھر اصلی مقصد کی طرف منعطف ہوتے ہیں۔

حضرت داغ قلعہ اور شہر کے ہر مشاعرہ میں شریک ہوتے تھے اور نکتہ رس
سامعین سے داد سخن لیتے تھے۔ قلعہ میں تو مشاعرہ خاص بادشاہ کی طرف سے ہی ہوتا
تھا۔ مگر شہر میں نواب مصطفٰے خاں شیفتہ و امام بخش صہبائی وغیرہ سر آوردہ

اشخاص کے زیر اہتمام رونق پاتا تھا۔ حضرت داغ ان میں سے ہر ایک میں شریک ہوتے تھے اور اس نو عمری کے زمانہ میں بلا اصلاح غزل ہی پڑھ دیا کرتے تھے ایک مرتبہ قلعہ میں مشاعرہ تھا استاد ذوق۔ حضرت مومن۔ بہادر شاہ ظفر جیسے نقاد سخن موجود تھے جب شمع گردش کرتی ہوئی آپکے سامنے آئی تو آپنے غزل پڑھنی شروع کی خیر اور اشعار پر تو داد ملی ہی مگر جب یہ شعر پڑھا ؎

ہوئے مغرور وہ جب آہ میری بے اثر دیکھی
کسی کا اس طرح یارب : دنیا میں بھرم نکلے

تو محفل مشاعرہ سے غلغلۂ تحسین و مرحبا اٹھا حتی کہ خود بادشاہ سلامت نے حضرت داغ کو اپنے پاس بلاکر ان کی کمر ٹھونکی اور بہت سے توصیفی فقرے اپنی زبان مبارک سے فرمائے۔ اسی طرح ایک شہر کے مشاعرہ میں جب آپ غزل پڑھتے پڑھتے مقطع پر آئے تو آپنے فرمایا ؎

لگ گئی چپ تجھے اے داغ حزیں کیوں ایسی
مجھ کو کچھ حال تو کمبخت سنا تو اپنا

اب کیا تھا چاروں طرف سے تحسین و مرحبا کا شور اٹھا خصوصاً گیر شاعرہ نے آپکی طبیعت کو بہت بڑھا وا دیا علیٰ ہذا القیاس شہر کے ایک اور مشاعرہ میں جسمیں مومن اور ذوق جیسے استادانِ سخن موجود تھے آپنے مطلع ذیل پڑھا

عجب اپنا حال ہوتا جو وصالِ یار ہوتا
کبھی جان صدقہ ہوتی کبھی دل نثار ہوتا

سمجھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ یہ مطلع کس غضب کا ہے اور خصوصاً اس وقت جبکہ تیرہ چودہ سال کے لڑکے کی زبان سے نکلے بس نہیں وجوہات سے حاضرین مشاعرہ تڑپ اٹھے اور اکثر حضرات نے بظاہر نہیں تو دل میں یقین کرلیا کہ یہ ہونہار کسی نہ کسی دن ضرور استادِ زمانہ مانا جائیگا اور اپنے طرز کا موجد ہوگا غرض اس قسم کے بہت سے واقعات ظہور پذیر ہوئے جن سے جناب داغ کی طبیعت روز بروز ترقی کرتی رہی۔ ایک بات یہ بھی تھی ابتک آپ کو مکروہاتِ زمانہ سے کچھ سروکار نہ تھا قلعہ کے شہزادوں کی طرح زندگی بسر

کرسکتے تھے ولی عہد سلطنت ہر طرح انکے نگران حال تھے

حضرت داغ ریاست رامپور میں

زمانہ کے ہتھکنڈوں اور انقلاب کے کرشموں سے کون واقف نہیں ۱۸۵۷ء
کا غدر وہ واقعہ اس کا ایک ادنیٰ نمونہ تھا جس میں ہندوستان کے بہت سے
شہر تباہ ہوگئے۔ لاکھوں خاندان غارت۔ خصوصاً دہلی والوں پر جو مصیبت
پڑی وہ ناگفتہ بہ ہے۔ مرزا نوشہ صاحب جنہوں نے کبھی یہ بھی جاننے کی
کوشش نہیں کی کہ گیہوں کا درخت کس شکل ہوتا ہے اس زمانہ میں پیدل
سفر کیا ہے۔ اور ہزاروں مصیبتوں کا نشانہ بنے ہیں مگر بقول شخصے کہ مصیبت
کبھی تنہا نہیں آتی حضرت داغ پر دہری تباہی پڑی چنانچہ ابھی بغاوت
کی فوری آگ ہندوستان میں مشتعل ہوجانیکا نشان وگمان بھی نہ تھا تقریباً
غدر سے ۸ ماہ پیشتر انکے مربی ولیعہد سلطنت کا انتقال ہوگیا۔ بس یہ سخت
مصیبت تھی اور ایسی سخت کہ مدت العمر نہ بھولے۔ آخر زمانہ میں بھی جبکہ آپ
حیدرآباد میں فارغ البالی کی زندگی بسر کیا کرتے تھے تو اس واقعہ جانکاہ کو
یاد کرکے آنکھوں میں آنسو بھر لاتے تھے۔ غرضکہ ولی عہد کا انتقال ہونا تھا
کہ ان پر مصیبت کا دروازہ کھلنا۔ قلعہ سے جب تعلق ہی نہ رہا تو آپ وہاں سے
معہ اپنی والدہ ماجدہ کے چلے آئے۔ مگر ابھی آپ کی موجودہ پریشانی کو پورے
آٹھ ماہ بھی نہ گذرے تھے کہ ملک میں چاروں طرف آتش بغاوت بھڑک
اٹھی اور گویا آسمان ہی ٹوٹ پڑا۔ باغیوں کے ہاتھ سے اہل دہلی کی عزت کا
جانا بچانا مشکل ہوگئی۔ غرض اُس وقت جو کچھ مصائب حضرت داغ یا اور
اہل دہلی پر پڑے اُن کی تفصیل نہ ہمیں لکھنا منظور ہے اور نہ وہ آسانی سے لکھی
جاسکتی ہے اسلئے ہم اُس سے قطع نظر کرکے آئندہ واقعات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں

جب وہ ہنگامہ ختم ہوگیا تو آپ عرصہ تک تلاش معاش میں سرگرداں اور
پریشان رہے اور اسی تقریب سے ریاست رامپور پہنچے۔ یہ زمانہ نواب یوسفعلی
خان بہادر کا تھا۔ واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت تک آپ کی

شاعری کی دھوم دھام نہ تھی۔ بلکہ دائے خاص لوگوں کے آپکے تخلص سے
بھی کسی کے کان آشنا نہ تھے۔ چنانچہ جب آپنے رامپور پہنچکر دو چار غزلوں
میں زور طبیعت دکھایا تو اہل رامپور نے جو آپکے حریف یا حاسد تھے شعر
ذیل موزوں کیا اور کسی ذریعہ سے حضرت داغ تک پہنچایا ؎

دلی سے چل کے آیا اک مشلی ۔۔۔ آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

کہنے والے نے اس شعر میں حضرت داغ پر پھبتی کہی ہے۔ کیونکہ خلاف
اللہ کے شاگرد کی تحریر کے جنہوں نے لکھا ہے کہ آپکے چہرہ سے معلوم ہوتا ہے
کہ ایام جوانی میں آپ حسین اور خوبصورت جوان ہونگے۔ حضرت داغ
سیہ فام تھے۔ دوسری رعایت شعر ہذا میں یہ رکھی گئی ہے کہ رامپور آتے ہی
آپ اصطبل سرکاری کے داروغہ بنائے گئے تھے۔
اس شعر کا جواب حضرت داغ نے ایک قطعہ میں دیا ہے مگر چونکہ اس کے
اشعار اخلاقی پایہ سے کسیقدر گرے ہوئے ہیں اسلئے ہم یہاں درج نہیں
کرتے ہیں صرف ناظرین کو یہ بتلا دیتے ہیں کہ جواب واقعی چپکو پہنے سے
خوب دیا گیا تھا سچ ہے ہر جیسے کو تیسا۔ حضرت داغ کو رامپور میں آئے
ابھی تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا کہ انکے آقائے نامدار کا انتقال ہوا مگر آئندہ
والی ریاست نواب کلب علیخاں نے بھی آپکی خدمات کو وقعت کی نظر سے دیکھا
اور آپ کو اپنا مصاحب خاص بنا کر اعزاز بخشا اور ہمیشہ مناسب سلوک کرتے رہے
علاوہ انکے اور شعرا بھی تھے جنکو یہ ریاست وظیفہ دیتی تھی مگر آپکی خاص
عزت تھی اور نواب صاحب آپ پر انتہا مہربان تھے۔ کم و بیش چالیس سال آپکو
اس حال میں گذرے۔ مشاعرے بڑی دھوم دھام سے ہوتے تھے کیونکہ نواب صاحب
بنفس نفیس صرف سخن فہم ہی نہ تھے بلکہ سخن سنج بھی تھے اور یہی وجہ تھی کہ اس وقت
علاوہ حضرت داغ کے لکھنؤ کے کل مشہور شعراء۔ امیر مینائی۔ امیر اللہ تسلیم۔
جلال۔ اسیر وغیرہ اصحاب ریاست رامپور میں جمع تھے۔ اکثر شاعری ریاست کی
طرف سے ہوتے تھے۔ اسکے میر مشاعرہ اور منتظم حضرت داغ ہی ہوتے تھے۔ وہاں کے
رئیسوں میں سے بھی اکثر حضرات مشاعرہ اپنے مکان پر کراتے تھے کیونکہ رامپور کو

شاعری سے بوجہ مجمع اہل کمال کے ایک خاص نسبت ہوگئی تھی۔ حضرت داغ
ہر مشاعرہ میں شامل ہوکر دادِ سخن دیتے تھے اور حاضرین جلسہ چونکہ آپ کے رنگ کو بہت
پسند کرتے تھے اسلئے آپکی غزلیں کی غزلیں زبانی یاد کرلیا کرتے تھے۔

حضرت داغ کلکتہ میں

جس زمانہ میں ریاست رامپور پورے شباب کے عالم میں تھی۔ اس وقت نواب خلد
آشیاں سنہ ۱۳۱۷ھ میں کسی سرکاری کام کی وجہ سے کلکتہ تشریف لیگئے تھے۔
چونکہ نوابصاحب حضرت داغ پر از حد مہربانی فرماتے تھے اسلئے ان کو بھی ساتھ
لیا اور وہاں پہنچکر بخلاف اور مصاحبین کے حضرت داغ کو خاص اپنے خیمہ میں
رکھا۔ خیر اس مرتبہ تو لوگوں سے ملنے جلنے کی زیادہ فرصت نہ ہوئی مگر آیندہ
سفر میں جبکہ آپ نوابصاحب کے کسی کام کو تنہا تشریف لے گئے تھے۔ وہاں کے
لوگوں نے ایک گھڑی کو نہ چھوڑا۔ مشاعروں پر مشاعرے کرائے۔ آج یہاں ہے
تو کل وہاں۔ اس وقت فلاں صاحب کے تو اس وقت کسی اور بزرگ کے۔ غرض یہ تھے
اور مشاعرے۔ کلکتہ کے رئیس خصوصاً وہ صاحب جنکو شعر و سخن سے خاص تعلق تھا
آپکو آنکھوں پر بٹھاتے تھے اور بعض بزرگوار تو صرف آپکو دیکھنے کے لئے ہی
سفر دور دراز اختیار کرتے تھے۔ جہاں یہ باتیں تھیں وہاں کلکتہ میں آپکے چند
مخالف بھی پیدا ہوگئے تھے چنانچہ ایک بزرگوار کو یہاں تک چڑ ہوی۔ کہ
مشاعرہ میں اگر شامل تو ہوتے مگر جب حضرت داغ غزل شروع کرتے تو آپ باہر تشریف لیجاتے
ایک مرتبہ آپ حسب معمول مشاعرہ سے اٹھ کر باہر الگ جا بیٹھے مگر آپنے وہاں بھی
دادِ سخن کا اتنا شور سنا کہ کانوں میں درد ہونے لگا لیکن تھے مضبوط مزاج اٹھ کر
اندر گئے اور اس غل و غش کی وجہ دریافت کی تو معلوم ہوا کہ حضرت داغ کو شعر ؎

شبنم سے شب ہجر کی ظلمت نہیں جاتی
سو شوب پڑیں جب بھی یہ رنگت نہیں جاتی

پروا دل رہی ہے۔ آپ بھی داد دینے والوں میں شامل ہوئے اور اپنے
خیالات کا اظہار کرکے حضرت داغ سے معافی چاہی حضرت داغ نے اپنا شعر ؎

جسمیں لاکھوں برس کی حوریں ہوں
ایسی جنت کو کیا کرے کوئی

کلکتہ میں ہی فرمایا تھا اور یہاں کے سخن فہم احباب نے جس قدر داد دی ہوگی وہ محتاج بیان نہیں
علی ہذالقیاس مطلع ذیل بھی آپنے یہیں موزوں فرمایا ؎

اک چشمہ حیوان ہے تو اک چشمہ کوثر | دو قطرے ہیں آب دم شمشیر سے باہر

آپ کلکتہ میں بوجہ ملازمت کے زیادہ عرصہ قیام نہ کر سکے کیونکہ ایام رخصت جلد ختم ہوگئے حتی کہ شہر کی پورے طور پر سیر بھی نہ کر سکے مگر اس میں شک نہیں کہ یہاں کی چہل پہل آپکو بہت پسند ہوئی اور یہاں کی سیکڑوں حسرتیں اپنے دل میں لیگئے چنانچہ آپ فرماتے ہیں

داغ کلکتہ سے لاکھوں غم دل پر لیچلا | یہ سمجھتے تھے یہ شہر ایسی بلا

کلکتہ سے واپس آکر رامپور میں نواب صاحب کی خدمت میں آئے مگر سنہ ۱۳۰۵ھ میں وہاں سے آپ کا قطع تعلق ہوگیا اور دہلی چلے آئے - اور مختلف مقامات مثلاً لاہور آگرہ - علی گڈھ وغیرہ کی سیر کرتے رہے اور آخر اسی سن کے اخیر میں حیدر آباد تشریف لیگئے اور وہاں آپ کی جو خاطر تواضع ہوئی وہ ہم مفصل لکھنے والے ہیں -

حضرت داغ پٹنہ میں

شہر پٹنہ بنگال میں اچھا شہر ہے - آبادی معقول ہے لوگ طبیعت دار ہیں - کلکتہ کے سفر کے زمانہ میں جب وہاں کے لوگوں کو حضرت داغ کی تشریف آوری کی خبر ہوئی تو اُن میں سے چند عمائد ریلوے سٹیشن پر جاکر آپ کا انتظار کرنے لگے - اور گاڑی کے آجانے پر حضرت داغ سے شہر میں جانیکا اصرار کیا - آپنے اگرچہ بہت معذرت کی مگر آخر مجبور ہونا پڑا عین اسی روز ایک مشاعرہ تھا حضرت داغ کو بھی میر مشاعرہ نے مدعو کیا اور شرکت پر مجبور کیا - آپ نے طرح پر غزل لکھی اور خوب لکھی وہاں کے لوگ بڑی محویت سے سنتے رہے آپکی غزل کے مطلع و مقطع یہ ہیں -

اس کعبۂ دل کو کبھی ویراں نہیں دیکھا | اس بت کو کبھی اللہ کا گھر ہم نے نہ سمجھا
کیا پوچھتے ہو کون ہے یہ کس کی ہے شہرت | کیا تم نے کبھی داغ کا دیواں نہیں دیکھا

پٹنہ کے سخن فہم اصحاب نے حضرت داغ کی مہمان نوازی میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا

نوابی خرچوں اور احباب کی خاطر تواضع نے آپ کی مالی حالت کو نقصان پہنچایا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ دہلی واپس چلے آئے۔ اور دہلی میں یا اسکے ملحقات میں کامل دس ماہ تک یعنی اُس زمانہ تک جب تک کہ آپکے پاس نظام دکن کا طلبی کا پروانہ پہنچ گیا قیام پذیر رہے۔

اس مرتبہ حیدرآباد آکر گویا ریاست کے اُمیدوار تھے اور یہ امیدواری کا زمانہ پورے ساڑھے تین سال میں ختم ہُوا اور آپ یہاں کا ہر قسم کا خرچ برداشت کرتے رہے آخر ۲ جمادی الثانی سنہ ۱۳۰۸ھ کو حضور نظام کی غزل بند لفافہ میں سرکاری چوبداروں کی معرفت حضرت داغ کے پاس آئی اور آپنے فوراً درست کرکے واپس کردی۔ اسی تاریخ سے آپ حاضر دربار ہونے لگے اور ۲ ربیع الاول ۱۳۰۹ھ سے آپکا وظیفہ ساڑھے چارسو روپے سکہ حیدرآبادی مقرر ہوا۔ اور پھر ۲ ربیع الاول سنہ ۱۳۱۲ھ میں وظیفہ کی مقدار ایک ہزار روپیہ کردی گئی۔ اور یہی آپکو تاحیات ملتی رہی۔ علاوہ ازیں آئے دن قسم قسم کے انعامات نوابصاحب سے عطا ہوتے رہے۔ مثلاً ایک مرتبہ آپ کو حضور نظام نے سونے کی گھڑی اپنے خاص دستِ مبارک سے عنایت کی اسی طرح تلواریں اور دیگر عطیات آئے دن ملتے رہتے تھے۔

ہر دربار میں حضرت داغ طلب کئے جاتے تھے اور اس موقعہ پر آپ درباری لباس مع حیدرآبادی پگڑی کے زیب تن فرماتے تھے۔

ہر تقریب پر حتیٰ کہ شکار کھیلنے کے وقت بھی حضرت داغ قصیدہ یا کم از کم تاریخ پیش کرتے تھے۔ اور کچھ نہ کچھ ضرور انعام حاصل کرتے تھے۔ ہم اوپر لکھنا بھول گئے ہیں جب حضرت داغ کا مشاہرہ ایک ہزار روپیہ ہوا تھا تو آپ کو تاریخ ورود حیدرآباد سے لیکر تمام امیدواری کے زمانہ تک بقایا خزانہ عامرہ سے ملا تھا۔ گویا اس حساب سے آپ روز اول سے ہی ایک ہزار مشاہرہ کے ملازم تھے۔

حضرت داغ کے بعض خصایل اور مشاغل

حضرت داغ جہاں اپنے کلام معجز بیان کی وجہ سے اس قدر نزدیک و دور مشہور

تھے - وہاں آپ کا مزاج نہایت انکسار پسند واقع ہوا تھا - احباب تو احباب
ہی تھے آپ اُن لوگوں سے بھی جو گو بظاہر اپنے آپ کو بناتے تھے مگر درحقیقت
ان کے مخالف تھے - باوجود ان کے مافی الضمیر معلوم ہونے کے نہایت اخلاق
سے ملتے تھے اور یہی باکمال ہونیکا ایک مسلمہ معیار ہے - آپ نے کبھی دربار
میں یا کسی اور موقعہ پر کسی کی مخالفت کا بیڑہ نہیں اُٹھایا - بلکہ ہر بات میں
انصاف پسندی کو مقدم سمجھا - اگرچہ سن شریف زمانہ شیوخت کو پہنچ چکا تھا -
تاہم آپ بڑے زندہ دل اور لطیفہ گو شخص تھے اور آخر وقت تک یہی حالت
رہی - قیام رامپور کے زمانہ میں تو آپکے سپرد بہت کچھ کام انتظام وغیرہ کا
تھا - مگر حیدرآباد میں سوائے شاعری کے اور کوئی مشغلہ نہ تھا - تاہم آپکا بہت
سا وقت مطالعہ کتب میں صرف ہوتا تھا - آپکا کتبخانہ علوم و فنون کی کتابوں سے
پُر ہے گو اس میں زیادہ کتابیں شاعری کے متعلق ہی ہیں - آپ کو سواری
رکھنے خصوصاً گھوڑا رکھنے کا خاص شوق تھا - اگرچہ خود بہت کم سوار ہوتے
تھے مگر دو چار گھوڑے آپکے اصطبل میں ضرور بندھے رہتے تھے -

آپ کے احبابوں کی تعداد کثیر تھی - علاوہ اُن شاگردوں کے جو در
دولت پر حاضر رہ کر فیضیاب صحبت ہوتے تھے - مگر سب لوگوں کے ساتھ ایسا
برتاؤ کرتے تھے کہ جیسا اُن کے درجہ کے مطابق ہوسکتا تھا - آپ احباب
یا شاگردوں کی درخواست پر اکثر غزلیں کہا کرتے تھے آورد فی البدیہہ ہونے
سکرات سے آپ ہمیشہ بچتے رہے - گو اشعار میں وہی غالب کا رنگ موجود
ہے - اور ان کی پاکبازی میں شبہ ڈالتا ہے -

چند متفرق باتیں

مذہب | آپ کا مذہب صاف طور پر نہیں معلوم ہوتا - کہ سنی تھا یا شیعہ -
مگر ہاں جہانتک معلوم ہے حضرت داغ سنی ہی تھے - گو گستاخی ہوں ہمارے
قول کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ آپنے رامپور کی ملازمت کے زمانہ
میں نواب خلد آشیاں کے ساتھ حج بیت اللہ کیا - اگرچہ وہ اپنے ذیل کے

شعر میں بات کو گول مول کر گئے ہیں تاہم آپ فرماتے ہیں -

یہ داغ ہے صحابۂ عظام کا مطیع
یہ داغ جاں نثار ہے آلِ رسول کا

شادی خانہ آبادی | آپ کی شادی دہلی میں ہوئی اس وقت سن شریف پندرہ سال کا تھا حیدرآباد تعلق ہوجانے پر بیوی کو بھی یہیں لے آئے تھے مگر ان کا بقضائے الٰہی سنہ ۱۳۱۰ھ میں انتقال ہوگیا -

حضرت داغ کا شاگرد بنانا اور اصلاح دینا

اکثر ہر فن کے استادوں کا قاعدہ ہے کہ شاگرد سے کچھ نقد یا شیرینی پگڑی وغیرہ لیا کرتے ہیں - مگر حضرت داغ کے ہاں یہ رواج نہ تھا - بلکہ شاگرد بنانے کے بعد اس سے کہہ دیا کرتے تھے - کہ اگر تم کو توفیق ہو تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ خواجہ حافظ شیرازی - میر - غالب - ذوق - وغیرہ کی فاتحہ شیرینی پر دلا کر تقسیم کردو - آپ کے شاگردوں کی تعداد ہزار کے قریب ہے اور ان میں سے اکثر ہندوستان کے دور دراز شہروں کے رہنے والے ہیں - جن میں سے بعض سربر آوردہ لوگوں کے نام یہ ہیں -

آصف حضور نظام دکن - عزیز - بارق - آزاد - وارث - بیخود - ضیا گوہر رامپوری - آغا شاعر دہلوی - محمد اقبال لاہوری - مبین مچھلی شہری - نوح ناروی - بشیر رامپوری - (جو بے پڑھے ہیں مگر کلام اعلےٰ پایہ کا ہوتا ہے) وغیرہ وغیرہ بہت سے نام ہیں جنکی تفصیل کرنا محالات سے ہے اور ہر ایک بجائے خود استاد کا نام روشن کرنیوالا ہے - اور اس بات کا اندازہ سخن فہم ناظرین ان لوگوں کا کلام مختلف گلدستوں میں دیکھ کر بخوبی کرسکتے ہیں -

سنا گیا ہے کہ حضرت داغ اصلاح دیتے وقت کچھ زیادہ غور اور فکر نہ کرتے تھے بلکہ اُن کے شاگرد حلقہ باندھ کر ایک جگہ بیٹھ جاتے تھے اور نمبروار ایک ایک شعر پڑھتے جاتے تھے - اور اس طرح فی شعر چند منٹ کا وقفہ لگتا تھا - البتہ حضور نظام کی غزل کی درستی میں خاص انتظام ہوتا تھا - غزل سرکاری ہرکارے کے ہاتھ سربمہر

چہ تواں گفت خیر الکلام ما قل ودل ۔

مولانا بخش متوطن کلکتہ مؤلف تذکرہ غنچۂ ارم حضرت داغ کے متعلق یہ تحریر فرماتے ہیں کہ سخنور یکتا شاعر بے ہمتا نواب مرزا خان بہادر۔ دہلی مولد و تقرب یافتہ ومشیر خاص حضور پرنور نواب صاحب بہادر والی دارالسرور رامپور دام اقبالہ۔ خلف فردوس مکان خلد مقام نواب محمد شمس الدین بہادر۔ برگزیدہ ترین شاگرد خاقانی ہند حکیم زماں شیخ محمد ابراہیم ذوق۔ استاد حضرت ظفر شاہ دہلی نور اللہ مرقدہ۔ وحید الدہر۔ فرید العصر۔ خوش خو۔ سخن گو۔ خوش سخن کامل فن شیوا زبان جادو بیان کامل کلام متنوعہ۔ جامع سخن۔ مختلفہ کلامش آب زلالے ہست کہ تشنہ کامان بہ وادی تلاش سخن را با مذاق ما معین سیراب میکند و سخنش سحر ملالے است بیچوں افسوں۔ افسوں سازاں قلوب سامعین را مسخر مینماید۔ متانت کلامش با فصاحت و بلاغت ہمعناں سلامت سخنش با لطافت و نفاست ہم زبان آنقدر تلامذہ دارد کہ حصرش محال مے نماید ۔

مولوی محبوب عالم صاحب اڈیٹر پیسہ اخبار۔ اپنے روزانہ پرچہ میں تحریر فرماتے ہیں شاعری کی دنیا میں جناب نواب مرزا خان صاحب داغ دہلوی بھی ایک نہایت ہر دلعزیز اور نامور رکن تھے۔ پہلے جناب نواب کلب علیخاں صاحب بہادر خلد آشیاں فرمانروائے رامپور نے آپ کی قدر دانی فرمائی اور اخیر میں اپنے کمال شاعری سے اعلیحضرت نظام الملک آصف جاہ حیدرآباد کے دربار میں باریاب اور اور حضور پرنور کے استاد مقرر ہوئے۔ پندرہ سو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی اسکے علاوہ ہزاروں روپیہ اعلیٰ حضرت کی بخشش خاص سے حاصل کیا۔

مرزا قادر بخش بہادر صابر دہلوی۔ مصنف تذکرہ گلستاں داغ مرحوم کی نسبت لکھتے ہیں داغ تخلص ہے۔ شمع افروز بزم محبت گرمی ہنگامہ الفت۔ دوست صداقت تسلیم نواب مرزا نام جوان خوش وجاہت کا۔ کہ پاکی سیرت ولطف وصورت کو بزم خوبی میں فراہم اور صفائی باطن اور حسن ظاہر کو محفل کمال میں باہم رکھتا ہے۔ ادب و تواضع ایک جامہ ہے اسکے قامت احوال پر راست۔ اور خلق و مروت ایک ذخیرہ ہے اسکے گنجینہ جیب میں بے کم و کاست ضمیر صافی الضمیر اور فروغ مشرق اور آفتاب شوخی ۔

مگر او طبع لمعہ برق۔ اور سحاب سخن کی رنگینی اور عبارت کی متانت اور الفاظ کی شستگی اور کلمات کی تنگ وزی حدا وصاف سے خارج ہے۔ فن سخن میں شیخ ابراہیم ذوق غفر اللہ سے استفادہ اور فیض استاد اور طبیعت رسا کی امداد سے آرایش بزم کمال ہوا۔

خاکسار مؤلف کی رائے

جو شہرت اور عزت حضرت داغ کو حاصل ہوئی وہ اظہر من الشمس ہے اور اسکے ماننے میں کوئی شخص تامل نہ کریگا۔ آپ کو جو کچھ اعزاز حاصل ہوا وہ کمال شاعری کی بدولت تھا سچ ہے۔ ع کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی۔

لیکن اس سے یہ حکم نہیں لگایا جا سکتا کہ ان کی شاعری ایسے پایہ کی تھی کہ جسکا مقابلہ کوئی اور شاعر نہ کرسکتا تھا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت داغ نے زمانہ کی رفتار کو دیکھا۔ میرزا غالب مرحوم سے آسان کہنے کی فرمایش کی گئی تھی مگر ان کی بے نیاز طبیعت نے زبان سے کہلا دیا کہ ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا   گر نہیں ہے میرے اشعار میں معنی نہ سہی

لیکن حضرت داغ نے اس سے فایدہ اٹھایا اور یہی وجہ ہوئی کہ زندگی میں ہی اسقدر شہرت اور عزت حاصل کی جو آجتک کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوی۔ عام لوگوں کو ان کی غزلیں از بر یاد ہیں۔

اعلیٰ حضرت نظام دکن کی فیاضی اور سونے پر سہاگہ ہوئی اور حضرت داغ کو آسمان پر چڑھا کر چھوڑا ورنہ امیر مینائی اور مضطر خیرآبادی وغیرہ صاحب بھی ان سے کم نہیں۔

متقدمین یا معاصرین سے حضرت داغ کے کلام کا مقابلہ

غزل مرزا غالب مرحوم

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو   نہ ہو جب دل ہی سینہ میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو   نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا   تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم تھا   ہوئے تم دوست جسکے دشمن اسکا آسماں کیوں ہو

حضرت داغ مرحوم

مرادیں مان رہا ہوں قضا کے آنے کی
بُری گھڑی تھی دل مبتلا کے آنے کی

مری بلا ہے فرقت میں رات دن نالاں
مجھے تو عید ہے روز جزا کے آنے کی

شب وصال نہ ٹھہرے حیا کے آنے کی
کہ پھر کبھی نہیں یہ رات جا کے آنے کی

کرینگے صبح قیامت بھی انتظار بہت
کہ عادت آپ کو ہے دن چڑھا کے آنے کی

شب فراق ہجوم بلا سے کیا مرتا
کہ راہ بند ہوئی تھی قضا کے آنے کی

تمہارے دن میں قیامت اٹھائے پھرتی ہے
تمھاری عمر ہے ناز و ادا کے آنے کی

شگاف چرخ سے آہ کیا ہوا حاصل
کہ اور راہ کھلی ہر بلا کے آنے کی

لگائے بیٹھے ہو مہندی عبث شب وعدہ
تمہیں اُمید ہے رنگ حنا کے آنے کی

جواب وصل پہ کیونکر نہ ہوں میں شادی مرگ
خوشی بھی اور خوشی دلربا کے آنے کی

سما خیال تو آنے دیا نہ تم نے مگر
ہوئی نہ روک دل مبتلا کے آنے کی

ابھی تو کھیل ہیں اے داغ شوخیاں اُنکی
پھر آرزو بھی کروگے حیا کے آنے کی

حضرت امیر مینائی مرحوم

غبار اپنے لب بام تک بلند ہوا
ہوائے تند کا جھونکا مجھے کمند ہوا

جہاں کسی کا دکھا دل میں دردمند ہوا
جلا میں آگ پہ نالاں اگر سپند ہوا

کوئی حسین نظر آیا تھا میں عاشق زار
جو گرم ناز ہوا میں نیازمند ہوا

نہ پوچھ الفت خال سیاہ کا باعث
پسند آپ کی جو آپ کو پسند ہوا

لکھا تھا خط میں جو حال اپنی چشم تر کا
ہزار بند لفافہ کیا نہ بند ہوا

برنگ شمع جلایا یہ سوز الفت نے
کہ شعلہ آگ کا سر سے میرے بلند ہوا

کھلا ہے باب اجابت دعا تو کر غافل
در کریم سنا ہے کبھی کہ بند ہوا

امیر پائے طلب جب سے توڑ کر بیٹھے
کبھی نہ ہاتھ سوئے اغنیا بلند ہوا

حضرت داغ مرحوم

شب فراق جو دست دعا بلند ہوا
ندائیں آئیں کہ باب قبول بند ہوا

تمہارے لطف و عنایت کا وہ کیا کہنا — کہ جس کا درد کیا وہ ہی دردمند ہوا
کھلا یہ عقدہ مجھے دیکھ کر عدو پہ فدا — کہ جس نے ناز کیا وہ نیاز مست ہوا
الٰہی اُس بت مغرور سے یہ سنوا دے — نیاز مند ہوا میں نیاز مست ہوا
وفا نہیں نہ سہی شیوۂ جفا ہی سہی — پسند آپ کی جو آپ کو پسند ہوا

میری زباں نہ تھکی رات کٹ گئی ساری
کھلا جو شکووں کا دفتر تو پھر نہ بند ہوا

حضرت امیرمینائی

نہ کور باطن ہوئے برہمن ذرا تو چشم تمیز وا کر — خدا کا بندہ بتوں کو سجدہ خدا خدا کر خدا خدا کر
جو آنکھ کھولی تو کچھ نہ دیکھا سحر کو سنسان تھی گلی — ہوا نہ ہمراہیوں سے تنہا کہ ساتھ لیتے مجھے جگا کر

مطلع

شب جدائی ہوئی یہ حالت رہی تپ درد و غم کی شدت
جو ہوش آیا تو ہم نے پٹکا زمیں پہ تکیہ سے سر اُٹھا کر
خدا ہی باندھے ہوا کچھ ایسی کہ دل ہو اُس گرم خو کا پانی
کیا ہے لوگوں نے آگ اُس کو لگا لگا کر بجھا بجھا کر
طبیب سے کوئی جا کے کہہ دے دوا کی ہے فکر تجھ کو بیجا
یہ درد دل ہے علاج کیسا خبر ہے کچھ ہوش کی دوا کر
قدم کو لغزش زباں کو لکنت ہے رعشہ ہاتھوں کو سر کو جنبش
کدھر گئی ہائے نوجوانی ان آفتوں میں پھنسا پھنسا کر
چمن ہے کشتوں کا تیرے مدفن یہ لالہ و گل نہیں شگفتہ
صبا نے گویا کہ تربتوں پہ چراغ روشن کئے ہیں لا کر
جو آئینہ ہو تو ٹوٹ جائے ۔ جو آنکھ ہو تو وہ پھوٹ جائے
خدا نہ منہ غیر کا دکھائے فروغ عارض ترا دکھا کر
سخنوروں سے معاملے میں سوائے ذلت حصول کیا ہے
چمن میں بحثی جو ہم سے بلبل تو سنیں بڑے پھول کھل کھلا کر
یہ کس کی تیغ جفا کا یا رب ہر ایک دل پر ہے رعب غالب

ہلال کی ہے خمیدہ گردن - سپہر چلتا ہے سر جھکا کر
ابھر میری رگ و گلو کو یہ تیغ قاتل کی آرزو تھی
ملے وہ آکر جو بعد مدت تو خوب روئے گلے لگا کر

حضرت داغ مرحوم

کیا ہے پندار اُس صنم کو ہزار طوفاں اُٹھا اُٹھا کر
لگائیں وہ تہمتیں کہ بولا خدا خدا کر خدا خدا کر
ملا نہ ایسا تو کوئی ہمدم - کہ دل کا ہوتا بیان شب غم
وہ بخت خفتہ نہیں کہ اک دم ہم آپ سوئیں اُسے جگا کر

مطلع

کہا نہ کچھ عرض مدعا پر - وہ لے رہے دم کو مسکرا کر
سنا کئے حال چپکے چپکے - نظر اٹھائی نہ سر اٹھا کر
عجیب یہ تیرہ خاکداں ہے اسی کی ہے روشنی جہاں ہے
فلک نے اختر بنائے ہیں چراغ ہستی بجھا بجھا کر
نہ طور دیکھے نہ رنگ برتے غضب میں آیا ہوں دل لگا کر
وگرنہ دیتا ہے دل زمانہ - یہ آزما کر وہ آزما کر
ستم کے جو لذت آشنا ہوں کرم سے بے لطف و مزہ ہو
جو تو وفا بھی کرے تو ظالم - یہ ہو تقاضا کہ تو جفا کر
خدا کا ملنا ہنسی ہے آساں بتوں کا ملنا ہے سخت مشکل
یقیں نہیں گر کسی کو ہمدم تو کوئی لائے اُسے منا کر
یہ جی میں یاں ٹھن گئی ہے بالکل کہ حال دل کیجئے بے تامل
غضب کیا کیوں کیا تغافل گھٹا دیا حوصلہ بڑھا کر
نگاہ دزدیدہ پُر شرارت اور اُس پہ دزد حنا ہے آفت
مگر وہ عیار ہے قیامت - کہ چور دیں اس کو دل چرا کر
نگہ کو بے باکیاں سکھاؤ حجاب شرم و حیا اٹھاؤ
بھلا کے مارا تو خاک مارا - لگاؤ چوٹیں جتا جتا کر

حضرت داغ تصانیف

حضرت داغ کی ایک یہ بھی خوش قسمتی تھی کہ آپ کی زندگی ہی کئی دیوان شایع ہو چکے تھے - چنانچہ آفتاب داغ - گلزار داغ - مہتاب داغ - آپ کے مشہور دیوان ہیں - علاوہ ازیں فریاد داغ مثنوی ہے جس کا ایک حصہ اس کتاب میں کسی جگہ نقل کیا گیا ہے -

قدیم کلام کے متعلق حضرت داغ کے ایک لایق شاگرد کا بیان ہے کہ وہ کسی حریف نے اڑا لیا - کیا عجب ہے اگر یہ صحیح ہو - دنیا میں سخن چوروں کی کمی نہیں گو یا مذکورہ بالا دیوانوں میں جو کچھ ہے وہ بالکل تازہ یاتوں کو کہ حیدرآبادی کلام ہے اسکے علاوہ ملک کے قریب قریب ہر گلدستے میں حضرت داغ کا کلام نظر آتا تھا حتی کہ اگر ان کو جمع کیا جائے تو ایک خاصہ دیوان تیار ہو سکتا ہے اور ہمیں امید ہے کہ حضرت داغ کے لایق شاگردوں میں سے کوئی حضرت ان کے کلام کو مرتب کر کے ملک پر ایک گونہ احسان کرینگے -

حضرت داغ کی وفات

آخر وہ زمانہ آگیا کہ دنیا داغ جیسے باکمال آدمی سے خالی ہو - چنانچہ یکم ذوالحجہ ۱۳۲۲ھ کو آپ پر فالج گرا - اخباروں میں یہ خبر عام ہوگئی، اور حضرت داغ کے پاس چاروں طرف سے مزاج پرسی کے خطوط آنے لگے - مگر آٹھ روز کے قلیل عرصہ میں مرض نے کام تمام کر دیا اور آپنے ۹ ذوالحجہ ۱۳۲۲ھ کو وفات پائی - اِنّا لِلّٰہ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون -

مگر وفات کی خبر دیر سے شایع ہوئی کیونکہ مرحوم کی زندگی میں کئی بار ان کے انتقال کی خبر گرم ہو چکی تھی حتی کہ انکے اکثر احباب و تلامذہ نے تعزیت کے خطوط لکھے تھے جن کا جواب خود حضرت داغ نے دیا تھا - ایک عقل مند نے تو دھر گھسیٹا تھا کہ جناب داغ آپ مجھے اس سے مطلع فرمائیں کہ آپ کیا واقعی راہی عالم بقا ہوئے، اور اس کی خود حضرت داغ نے تسکین کی تھی -

مگر شکر اب کے یہ بات نہ تھی - بلکہ ۹ ر ذوالحجہ سنہ مذکور کو داغ جیسا مرد میدان

دنیا سے اُٹھ گیا تھا اور اپنے احباب و اعزا کو داغ دے گیا تھا - اگرچہ انتقال ۵ ذی الحجہ
کو ہوا تھا مگر نماز جنازہ بعد نماز عید الضحیٰ ہوئی - کل اخبار نے خبر دی کہ آپ کے
جنازہ کے ساتھ دس ہزار سے قریب آدمی تھے حضور نظام کے حکم سے حضرت داغ
کا تابوت حضرت یوسف شریف کی درگاہ میں دفن ہوا ہے - خداوند کریم آپ کے
پس ماندگاں کو صبر جمیل کی توفیق دے - یہ امر نہایت قابل افسوس ہے کہ
مرحوم کی اولاد نرینہ نہیں صرف ایک لڑکی یادگار ہے -
بڑے سے لیکر چھوٹے تک کل اخبارات اظہار افسوس کر رہے ہیں جن میں ہم
بعض کی نقل اس کتاب کے اخیر میں بطور ضمیمہ کرینگے خداوند کریم مرحوم کو جنت نصیب کرے

خانہ عشق بے چراغ ہوا
آج اُٹھی جہاں سے داغ ہوا

کلام داغ

غزلیات

سبق ایسا پڑھا دیا تو نے	دل سے سب کچھ بھلا دیا تو نے
~~ہم نکمے ہوئے زمانہ کے~~	~~کام ایسا سکھا دیا تو نے~~
کچھ تعلق رہا نہ دنیا سے	شغل ایسا بتا دیا تو نے
لاکھ دینے کا ایک دینا ہے	دل بے مدعا دیا تو نے
کیا بتاؤں کہ کیا لیا میں نے	کیا کہوں میں کہ کیا دیا تو نے
بے طلب جو ملا ملا مجھ کو	بے غرض جو دیا دیا تو نے
تھا مرا منہ نہ قابل لبیک	کعبہ مجھ کو دکھا دیا تو نے
جس قدر میں نے تجھ سے خواہش کی	اس سے مجھ کو سوا دیا تو نے
رہبر خضر و ہادی الیاس	مجھ کو وہ رہنما دیا تو نے
مٹ گئے دل سے نقش باطل سب	نقشہ اپنا جما دیا تو نے
ہے یہی راہ منزل مقصود	خوب رستے لگا دیا تو نے

روتا ہے تجھ بغیر دل زار زار زار — اور کھینچتا ہے آہ شرر بار بار بار
اے دل شکار عشق میں شاید ہو تیر جست — پہلے نکال منہ سے تو زنہار [illegible]
بیمار عشق کا نہ کسی کو خدا کرے — جینے کو بھی رہ لائے یہ آثار زار زار
ہم کو اسیر کر کے جو صیاد لے چلا — کیا روئے دیکھ کر سوئے گلزار زار زار
بیٹھا جب ہے یہ خرام عجب کیا کرے اگر — دامان حشر کو تیری رفتار تار تار
وہ گل اگر نہ پاس ہو وقت شناوری — ہو ہم کو موج قلزم زخار خار خار

اب داغ سے علاقہ رہا کیا وہ کون ہے
اب تو ہوئے ہیں آپ کے اغیار یار یار

دوستی کا ہو زمانہ میں بھروسا کس پر — تو مجھے چھوڑ چلا اے دل شیدا کس پر
امتحاں [illegible] دل کا تو دکھا دوں لیکن — یہ تو کہیئے کہ فلک ٹوٹ پڑیگا کس پر
یوں تو معشوق گل و شمع بھی کہلاتے ہیں — دیکھنا یہ ہے کہ مرتا ہے زمانہ کس پر
فتنہ پرداز جفاکار فسوں گر عیار — ہائے افسوس دل آیا بھی تو آیا کس پر
مجھ سے کہتے ہیں نکالینگے ہمیں کچھ تدبیر — صاف کہہ دو کہ دل آیا ہے تمہارا کس پر
لیکے دل بھی نہ دیا بوسہ جو مانگا تو کہا — کوئی سنتا بھی ہے کرتے ہو تقاضا کس پر
وہی قاتل وہی مخبر ہے وہی منصف ہے — میرے احباب کریں خون کا دعوی کس پر
جانب چرخ اشارہ سے بتایا اس نے — جب کہا میں نے میرا صبر پڑیگا کس پر

روکتا دل کو کہ شوق زلف دلبر لیچلا — تھا منا مجھ کو یہ سودا سراسر لے چلا
چھل دیا وہ شعبدہ گر میں ہی کترا رہا — اس کو لینا وہ کوئی دل کو چرا کر لے چلا
ابر رحمت کا گماں اہل جہنم کو ہوا — سوئے دوزخ جو میں اپنا دامن تر لیچلا
پھر بلایا پھر کہا کچھ پھر اسے رخصت کیا — نامہ بر جب حسرتوں کا میری دفتر لیچلا
خوب رضواں سے در فردوس پر جھگڑی ہوئی — جب بت کافر کو میں دل میں چھپا کر لیچلا
کوئی دامنگیر تھا کوئی گریباں گیر تھا — اس کو اپنے ساتھ میں جب روز محشر لیچلا
اس کی چتون پھر گئی محفل میں ہلچل پڑ گئی — مضطرب کو مضطرب مضطر کو مضطر لیچلا
منزل مقصود پہ پہنچے بڑی مشکل سے ہم — ہمسفر اکثر تھا یا شوق اکثر لے چلا

یہ حسین و مہ جبیں یہ شہر ایسی لہر بہر
داغ کلکتہ سے لاکھوں داغ دل پر لے چلا

توہی اپنے ہاتھ سے جب دل ربا جاتا رہا — دل کی بھی پروا نہیں جاتا رہا جاتا رہا
بس توقع پر تھی اپنی زندگی وہ مٹ گئی — جو بھروسا تھا ہمیں وہ آسرا جاتا رہا
میں نے دیکھا ان کی زلفوں کو تو وہ کہنے لگے — آپ کا دل کھل پڑا کم ہو گیا جاتا رہا
دل چرا کر آپ تو بیٹھے ہوئے ہیں چین سے — ڈھونڈنے والے سے پوچھے کوئی کیا جاتا رہا
مرگ دشمن کا زیادہ تم سے مجھ کو ہے ملال — دشمنی کا لطف شکووں کا مزہ جاتا رہا
اچھی صورت کی رہا کرتی تھی اکثر تاک جھانک — رہ گئیں آنکھیں مگر وہ دیکھنا جاتا رہا
دیکھو دیکھو مجھ پہ سیدھے رہو تیر نگاہ — صید جس دم آنکھ سے اوجھل ہوا جاتا رہا

داغ کچھ درہم نہ تھا جس کا نہیں ہوتا ملال
ہو گیا گم ہو گیا جاتا رہا جاتا رہا

رکھئے اب بہر عیادت نہ قدم گن گن کر — لے رہا ہے یہ مریض آپ ہی دم گن گن کر
دے خوشی کے عوض اندوہ و الم گن گن کر — لے شب وصل کے بدلے شب غم گن گن کر
یاد آتی ہے اگر اک نگہ لطف تیری — بھول جاتا ہوں ترے لاکھ ستم گن گن کر
چلتے ہیں ساتھ جنازہ کے جو چالیس قدم — تو نزاکت سے وہ رکھتے ہیں قدم گن گن کر
پیچ تقدیر کے کیا کیا مجھے یاد آتے ہیں — شب کو اس کاکل پر پیچ کے خم گن گن کر
تھا ہمیں ہجر میں ایک ایک مہینہ برسوں — دن گذارے ہیں ترے سر کی قسم گن گن کر
انگلیوں پر جو ہوا کرتی ہے گنتی ہر روز — یاد کرتے ہیں وہ انداز ستم گن گن کر

چار ہی داغ دیئے تو نے فلک لاکھ کو
جو سخی ہیں نہیں دیتے ہیں درم گن گن کر

غیر بھی میری طرح کرتے ہیں آہیں کیونکر — میں بھی دیکھوں تو لپٹتی ہیں نگاہیں کیونکر
قہر ہے عہد جوانی کی امنگ اور ترنگ — دل بھی مانے وہ تقیدوں کو نہ چاہیں کیونکر
نہ دلاسا نہ تسلی نہ تشفی نہ وفا — دوستی اس بت بدخو سے نباہیں کیونکر
زیر دیوار کبھی جھانک کے تم دیکھ تو لو — ناتواں کرتے ہیں دل تھام کے آہیں کیونکر
چاہ کا نام جب آتا ہے بگڑ جاتے ہو — وہ طریقہ تو بتا دو تمہیں چاہیں کیونکر

حسن ہوتا ہے حاصل تصویر
روپیہ تو ہے قابل تصویر

شکل منحوس کیوں نظر آئے
مول لے کر بھی ہم تو پچھتائے

ایسی تصویر کس کو بھاتی ہے
پر بلا سے ہنسی تو آتی ہے

تجھ سے رونق نہیں گھر کے لئے
رکھ لیا ہے نظر گزر کے لئے

تو کہ اس سے رونق تعمیر
اور دکھا لگائے یہ تصویر

تو ہے رنج و ملال میں کس کے
چپ لگی ہے خیال میں کس کے

کیوں ہے خاموش لب تو کھول ذرا
وہ مجھ سے بول اپنے بول ذرا

لنترانی کہاں گئی تیری
خوش بیانی کہاں گئی تیری

آرزوئے وصال کہہ تو سہی
کیا ہوا تیرا حال کہہ تو سہی

جھوٹ سچ ہم کو آزمانا ہے
عشق ہے یا فقط بہانا ہے

تیرے منہ میں زبان ہو کہ نہیں
تجھ میں کمبخت جان ہے کہ نہیں

کون سا تھا وہ آئینہ رخسار
تجھ کو سکتے کا دے گیا آزار

آئینہ تیرے منہ پہ رہتا ہے
اس سے کیا حال اپنا کہتا ہے

دام دے کر تجھے خریدا ہے
تجھ سے ہر طرح اپنا دعوی ہے

ہاں زلیخا مجھے نہ ٹھیرانا
بنکے یوسف کہیں نہ اترانا

بال باندھا میرا غلام ہے تو
اسی باعث سے نیکنام ہے تو

طائر رنگ اڑ کے چل نہ سکے
تیری حسرت کبھی نکل نہ سکے

بھاگ کر بے وفا نہ ہو جانا
بعض نا آشنا نہ ہو جانا

نہ کہیں گے کہ صورت اچھی ہے
ہاں مگر کچھ طبیعت اچھی ہے

تیری تصویر کا بہانا ہے
تیرا خاکا بہت اڑانا ہے

پہلے تو اس کو چاک چاک کروں
اور پھر میں جلا کے خاک کروں

کیا یہ تصویر لاجواب نہیں
سو سنے ایک کا جواب نہیں

ان کو تصویر پر نظر ہر دم
مجھ کو تقدیر پر نظر ہر دم

حضرت داغ کی لکھی ہوئی چند تواریخیں

ہو گیا میرا اضافہ آج دو بنے سے سوا | یہ کرم اللہ کا ہے یہ عنایت شاہ کی
اس ترقی کی کہو اے داغ یہ تاریخ تم | ابتدا سے اپنی ساڑھے تین سو نقدی ہوئی

دیگر

۱۳۰۱ھ

عنایت ہیم کا کیا شکریہ ہو | کہ فدوی کو کیا کیا عنایت ہوا
بدیہ کہو داغ تاریخ تم | یہ سونے کا توڑا عنایت ہوا

دیگر

تیز ہیں تیز گناہوں سے بھی انکی دھاریں | یہ وہ تلواریں ہیں جنوں کا نہیں جنکے علاج
گھاٹ دونوں کے خوش اسلوب ہیں نوک کیا | جو ہر آب کی یہ شکل کہ بحر مواج
مغربی اور جنوبی ہیں یہ دونوں بے مثل | سر بسر ہیں سر بدخواہ انہیں کے محتاج
تیرے قبضہ میں ہے تاریخ عطائے شاہی | لکھ دے اے داغ عنایت ہوئیں تلواریں آج

۱۳۰۱ھ

رباعیات

تم تو فلک حسن پہ ہو ماہ منیر | سائے کی طرح ساتھ ہے داغ دلگیر
خال لب گلفام ہے شاہد اس کا | بے داغ نہ کھنچ سکی تمہاری تصویر

دیگر

اس شکل کا دنیا میں نہیں کوئی نظیر | صورت ہے طبیعت کی طرح شوخ و شریر
اللہ رے حجاب بدگمانی تیری | بھیجی ہے مجھے نصف بدن کی تصویر

دیگر

ہر عیب سے خالی ہے تمہاری تصویر | دنیا سے نرالی ہے تمہاری تصویر
کس شکل مصور سے یہ پوری کھنچتی | دل کھینچنے والی ہے تمہاری تصویر

دیگر

مغرور ہے تجھ سے بھی جو بڑھ کر تصویر | رکھتی نہیں پاؤں کو زمیں پر تصویر
چھیڑوں جو ذرا میں تو کہاں پاس حجاب | ہو جائے ابھی جامہ سے باہر تصویر

دیگر

گو لاکھ کرے ناز تمہاری تصویر | میری تو ہے دمساز تمہاری تصویر

کہو تی ہے سب بھید تھا اُمجھ سے · تو بن گئی عنا ز تمہاری تصویر

دیگر

گرمی میں جو آیا رمضان ابکی بار | اے داغ گناہ اپنے ہونگے فئے انبار
دو روزے کا ہر روزہ ہے اُس موسم میں | روزہ بھی اک دن میں ہوا بار افطار

متفرقات

چاک ہو پردہ وحشت مجھے منظور نہیں — ورنہ یہ ہاتھ گریباں سے کچھ دور نہیں
اجل کا نام لیں تقدیر کو روئیں مجھے کیسی — مرے قاتل کا چرچا کیوں ہے میرے سوگواروں میں
کیا کیا فریب دل کو دئے اضطراب میں — اُن کی طرف سے آپ لکھے خط جواب میں
امتحاں نازِ دل کا تو دکھا دوں لیکن — یہ تو کہئے کہ فلک ٹوٹ پڑیگا کس پر
فرقت کی شب مرہ کا مرلیا دل کے داغ سے — ڈھونڈا اجل کو تا بہ سحر اس چراغ سے
تنگ آ کے چیخ سے اے آہ کیا ہوا حاصل — کہ اور راہ کھلی ہے بلا کے آنے کی
تو دوست ہے کس طرح نہ لیں تیری بلائیں — ہم کو وہ پیار کرتے ہیں دشمن کی بلائیں
بوجھ وہ لے نہ بہت دست دعا پر تاثیر — مجھ کو ڈر ہے کہ میرا ہاتھ اُتر جائیگا
دو ٹکڑے کر دست دعا ساتھ دعا کے جاتے — ہائے بیداد ہوئے پاؤں مرے ہاتھوں میں
کوئی خوبی نظر آتی نہیں تجھ میں ظالم — اے فلک پیر ہی صد عیب بجا کہتے ہیں
ہر اک کو مبتلائے روا مبتلا دیا — یوں ہم نے اک زمانہ کو عاشق بنا دیا
کیا لطف ستم یوں ہی نہیں حاصل نہیں ہوتا — غنچہ کو وہ ملتے ہیں اگر دل نہیں ملتا
چبانے لگے ہونٹ وہ بوسہ دے کر — یہ جھوٹے کو اچھی سزا مل رہی ہے
خدا شرم رکھ لے مری عاشقی کی — وہاں امتحان وفا ہو رہا ہے
موت آئی ہے قیامت کو یہاں تک آتے — پیچھے پیچھے تیرے دامن کے لگی رہتی ہے
یار کا پاس نزاکت دل ناشاد رہے — نالہ تھمتا ہوا رکتی ہوئی فریاد رہے
ہمیشہ عذر بھی کرتے ہوئے نہیں بنتی — وہاں سوال یہ ہے کیوں قصور ہوتا ہے
مر جاؤں اگر میں تو ستم کون اُٹھائے — زندہ مجھے رکھا ہے رقیبوں کی دعا نے
دل کو اس عاجزی سے دیتا ہوں — کوئی جانے سوال کرتا ہے
ترسکے سے ہم لئے داغ چھوڑ دینگے عشق — خدا کا واسطہ دیتا ہے کیوں خدا کے لئے

لطف مے تجھ سے کیا کہوں زاہد
ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں

خلق کے اعمال سے چھین لونگا حشر میں
گم ہوا ہے ہاتھ سے قاصد کے دلبر کا جواب

داغ کے دل کا تو کچھ بھید نہ پایا ہم نے
ایک حسرت سی برستی ہے مگر آنکھوں میں

فلک نے کینہ لیا - تو نے ظلم - میں نے وفا
ازل میں وہ ہی ملا جسکو جو پسند آیا

زہے نصیب طبیعت میں ہو جو آزادی
بہت بلاؤں سے انسان دور ہوتا ہے

وہ کوہ طور تھا موسیٰ کا حصہ
آئنے میں تجھے دیکھوں کہاں سے

موت بھی سو بار آئی اور الٹی پھر گئی
شکل پہچانی نہیں جاتی ترے بیمار کی

کبتک کھنچے رہو گے کبتک تنی رہے گی
کسکی بنی رہی ہے کسکی بنی رہے گی

یوں دفن میرے ساتھ دل بے قرار ہو
چھوٹا سا اک مزار کے اندر مزار ہو

عرصۂ حشر میں اللہ کرے گم مجھ کو
اور پھر ڈھونڈتے گھبرا کے ہوئے تم مجھ کو

بڑھا رہتا ہے کیا کیا طالب دیدار ہو ہو کر
مرے پائے نگر پر بھی گماں ہے دست سائل کا

ہم نہیں سونگھتے کبھی وہ پھول
جن میں بوئے وفا نہیں آتی

محشر میں بھی کیسکے اٹھائینگے ناز ہم
ایسے نیاز مند ہیں اے بے نیاز ہم

دیکھ لیگا یہ مزا حشر میں ہو جائیگا
آپ جو حکم کرینگے وہی ہو جائے گا

نہ ہمت نہ قسمت نہ دل ہے نہ آنکھیں
نہ ڈھونڈا نہ پایا نہ سمجھا نہ دیکھا

حقیقت میں ہے ماسوا چیز ہی کیا
ادھر تو ادھر تو یہاں تو وہاں تو

نہ تو مجھ کو چھوڑے نہ میں تجھ کو چھوڑوں
وہیں تو جہاں میں وہیں میں جہاں تو

غم سے کہیں نجات ملے چین پائیں ہم
دل خون میں نہاتے تو گنگا نہائیں ہم

ایک بھی بات کا پورا نہیں دیکھا معشوق
دل شکن سینکڑوں ہیں عہد شکن لاکھوں ہیں

اب شرم سے نظر تری ملنے کی نہیں ہیں
یہ خانہ نشیں گوشہ نشیں پردہ نشیں ہیں

تم شہرت جہاں سے کس جا کہاں نہیں
میرا اضطراب دل سے جہاں ہوں کہاں نہیں

ادائے خاص ہے معشوق کے لئے نخوت
تمہی بھی شکل ہو جب بھی غرور ہوتا ہے

دل میں عاشق کے تصور سے کھٹک ہوتی ہے
ان حسینوں کی عجب نوک پلک ہوتی ہے

بھری ہیں عجب ادائیں اس شوخ سیمتن میں
اک ٹیڑھ سادگی میں اک سیدھا بانکپن میں

بلا ہے مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی
اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

تم کو چاہا تو خطا کیا ہے بتا دو مجھ کو ——— دوسرا کوئی تو اپنا سا دکھا دو مجھ کو
بے مثل کہا اس بت کافر کو خدا لئے ——— سمجھے کہ نہ سمجھے کوئی مانے کہ نہ مانے

یادگار داغ

حضرت داغ کی وفات کے بعد سے اخبارات میں یہ بحث چھڑی ہے کہ مرحوم کی کوئی یادگار قائم کیجائے۔ بعض اخبارات نے لکھا کہ عمارت تعمیر ہونی چاہیے۔ بعض نے زور دیا کہ ایک عالیشان جلسہ کیا جائے جس میں ملک کے سربرآوردہ اصحاب شامل ہو کر کوئی یادگار قائم کریں۔ چونکہ یادگار کا منشا یہ ہوا کرتا ہے کہ مرحوم کا نام قائم رہے اسلئے ہماری رائے میں ان کے دواوین اور کلام ہی انکی یادگار ہیں۔ غالب۔ ذوق جیسے اہل کمال کی اگر کوئی یادگار قائم نہیں کیگئی ہے تو کیا انکا نام مشہور نہیں ہے بلکہ ابد آباد تک قائم رہیگا۔ اسکی تائید اخبار آرمی نیوز لودیانہ کی ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ "شاعر شیوابیان داغ دہلوی مرحوم کی یادگار قائم کرنے کی تحریک میں نے بعض اخباروں میں دیکھی ہے لیکن میرے نزدیک تو یہ تحصیل حاصل ہے۔ یادگار تو اُس شخص کی ہونی چاہئے جسکا نام مٹ جانے کا خوف ہو۔ جبتک اردو زبان آفتاب کے نیچے بولی جاتی ہے داغ زندہ ہے۔ جبتک گلزار داغ۔ آفتاب داغ اور مہتاب داغ باقی ہیں حضرت داغ صدیوں تک اپنی چہکتی ہوئی غزلیں آنیوالی نسلوں کو سنائینگے۔ کیا ضرورت ہے میر و سودا۔ ذوق کی یادگار بنانے کی۔ کیا ضرورت ہے کالیداس والمیک اور حافظ اور سعدی کے نام زندہ رکھنے کی بے سود کوشش کی۔ یہ لوگ تو زندہ جاوید ہیں موت انپر فتح نہیں پا سکتی۔ زمانہ انکو مٹا نہیں سکتا۔ فرض کریں کہ ہم کوئی عمارت بنائیں تو وہ کبتک باقی رہے گی۔ تاج گنج کا مقبرہ بھی ہمیشہ نہیں رہیگا۔ اور پختہ سے پختہ عمارتیں ایک روز خاک کا ڈھیر ہو جائینگی۔ مگر اہل کمال کے نام کو فنا کا خوف نہیں ہے۔ اسلئے میں کوئی ضرورت نہیں دیکھتا ہوں کہ داغ مرحوم کی یادگار میں ہم کوئی عمارت کھڑی کریں"۔

اخبار مذکور کی رائے نہایت بیش قیمت اور تحریر مدلل ہے اسلئے ہم امید کرتے ہیں کہ ہواخواہان داغ کم از کم اسپر غور تو ضرور کرینگے۔

قطعات تاریخ وفات حضرت داغ مرحوم

قطعۂ نتیجۂ طبع جناب افتخار الشعرا اعتبار الملک حضرت مضطر خیر آبادی

مرگ نواب میرزا خان داغ — آہ تھی نام رکھ کے بیماری

نقدِ جاں لینے پہنچو ہوئی فوراً — طرفہ بیمار طرفہ ہتیاری

دے گئی داغ ملک کے دل پر — داغ اور داغ بھی بڑا بھاری

زخم کاری تو تھا امیر کا داغ — اور یہ داغ داغ ہے بھاری

کیا برابر کے دونو مصرعے تھے — کیا برابر کی جوڑ تھی پیاری

مطلع لاجواب تھا پورا — غیرتِ مطلعِ نکوکاری

مگر افسوس ایک بھی تو نہ — نام باقی ہے بہر صد زاری

مہر و مہ دونوں دیکھئے دھوکر — رن ہے کالا تو رات اندھیاری

انکے ماتم میں شعر نوحۂ غم — ہو بہو مرثیہ غزل ساری

بیت بیت ملال سے گویا — مصرعہ مصرعہ عزاداری

جتنے مضموں ہیں سب پریشاں حال — جتنے مطلب ہیں مطلب حزاری

سارے موزوں خیال پیچ و پیچوں — بجز خود غرقِ گریہ و زاری

بندشیں سب کھلی ہوئی چھوٹی — حالتِ غم بیان پر طاری

اُن کے صدمہ سے سینہ چاک قلم — اُنکے غم میں دوات کو زاری

اُنکے ماتم کا تا ڈ کاغذ پر — رنگ رنگ سپید زنگاری

کیا ہی ملکِ سخن ہوا برباد — گویا دلی ہی لٹ گئی ساری

چاند و سورج تو چھپ گئے دونوں — رات تاروں کو ہو گئی بھاری

اب تلامیذ داغ کو مضطر — حسن توفیق خاص ہے باری

تاکہ چمکائیں ملک کے آنسو — دیکھ کر اُنکی گرم بازاری

حسن شہرت میں نام ہو پیارا — شاعری میں بیان ہو پیاری

اب رہا میں فقیر باب امیر — سو ہماں کیا ہے جز نگونساری

طبع ناقص کی اک یہ بھی ہے جولانی	اس میں گندے خیال بیکاری
ہاں عقیل و ریاض و کوثر ہے	کی ہے تاریخ سخن میں گلکاری
ورنہ استاد کی وفات کے بعد	شاعری ہو چکی تھی بیچاری
کاش ان کے تلامذہ سے بھی	یونہیں فیض سخن ہے جاری
انہیں مقطع غریب سمجھ جائے	ایک کا بوجھ دس میں گیا بھاری
لے خدا حسن لے یہ دعا میری	بار دے نوک ہے تو نہیں باری
خاندان امیر و داغ کو دے	نیک نامی و نیک کرداری
ایک سے ایک بڑھ کے ہو شہرہ	پائیں دنیا میں عزتیں ساری

ہو ستایش رائگاں [illegible]
[illegible]

نتیجہ طبع متین مولوی قیام الدین صاحب بجنت جونپوری

داغ اس رہ گزار عالم سے	پہونچے آخر کو اپنی منزل پر
سال رحلت داغ ہے یہ جنت	داغ اے ہائے دے گئے دل پر

[illegible]

قطعہ تاریخ از جناب منشی عبد الرشید صاحب تلمیذ جناب تجمل جلال پوری

میرزا داغ بادشاہ سخن	کر گئے ملک بقا سے سفر
محفل شاعری ہوئی ویران	لٹ گیا ظلم دل کشا کا گھر
گئی رونق بہار باغ سخن	کیا غرض آئے اب جو ابر تر
غم تو تھا ہی امیر احمد کا	صدمہ اک اور ہو گیا دل پر
فکر تاریخ کی جو تھی مجھ کو	ہاتف غیب نے کہا رو کر
سال ہجری میں لکھ رشید حزیں	آہ اک داغ دے گئے دلبر

۱۳۲۲ھ

از جناب محمد دلاور صاحب پشاوری

بلبل ہندوستان حضرت داغ	میرزا خان خوش بیان سخن

اوستادِ نظام و ناظم الملک — میرزا خان خوش بیانِ سخن
حاجیِ پاک دین و عالی قدر — نغز گفتار و آسمانِ سخن
زینتِ محفلِ سخن سنجان — رونقِ بزمِ دوستانِ سخن
یادگار و نشانِ حضرت ذوق — مقتدائے سخنورانِ سخن
شد نہاں نخل بندِ باغِ سخن — گشت برباد بوستانِ سخن
چوں نہ نالد ز فرقتِ او ہمہ — نالہ ہا خیزد از زبانِ سخن
نہمی شد چو از مہ ذی الحجہ — ارجعی خواند زیں جہانِ سخن

سالِ نقلش بخواں تو بیدل زار
وائے اے نکتہ دانِ جانِ سخن

از خاکسار مؤلف کتاب ہذا (اطہر)

دے گئے داغ ہائے حضرت داغ — ملگئے خاک میں سخن کے انیس
ہچکیاں دل میں لیتے ہیں پیہم — پیاری پیاری زبان کلام نفیس
نہم ذی الحجہ کو سدھارے داغ — خاک اڑاتے ہیں اب انیس و جلیس

بے تکلف کہو سن ہجری ۱۳۲۲ھ
اک ہزار اور تین سو بائیس

عطیہ جناب منشی خورشید احمد صاحب صمصام

شاعری را بُد گُلے در جلد باغ — گشت آنہم وقفِ منقارِ کلاغ
یعنی اندر محفلِ اہلِ کمال — نامِ استادِ جہاں بُد چوں چراغ

سنِ فوتش گفت دل با ادب
مادیِ شعر افصح الملک داغ سنہ ۱۳۲۲ھ

مختصر حالات داغ بطور ضمیمہ ماخوذ از روزانہ پیسہ اخبار لاہور
مطبوعہ ۲۵ فروری سنہ ۱۹۰۵ء

آپ کا نام مرزا خان اور تخلص داغ ہے۔ سنہ ۱۸۳۰ء میں دلی میں پیدا ہوئے۔ مدت العمر دلی اور رامپور وغیرہ میں رہے۔ اور آخر عمر حیدرآباد میں بسر کی۔ سرکار نظام دکن سے ڈیڑھ ہزار روپیہ ماہوار وظیفہ پاتے تھے۔ اور مختلف تقریبوں پر جو انعام و اکرام انہیں ملتے رہتے تھے وہ اسکے علاوہ ہیں۔ حضور نظام دکن کے استاد تھے اور استاد السلطان کے لقب سے ملقب تھے۔ انکا نام مع القاب حسب ذیل ہے "خان بہادر بلبل ہندوستان جہان استاد ناظم یار جنگ نواب مرزا خان صاحب داغ امیر الدولہ فصیح الملک دہلوی استاد حضور بندگان عالی آصف جاہ نظام دکن"

شعر و شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ اور ایسے انوکھے اور برجستہ کہتے ہوئے مگر سادہ شعر کہتے تھے کہ سننے والے بے ساختہ احسنت کہہ اٹھتے تھے۔ اوائل عمر میں جبکہ آپ کو میدان سخن میں قدم رکھتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا آپ نے یہ شعر کہا ؎

رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

مشہور ہے کہ مرزا غالب مرحوم ایک صحبت میں اس شعر کو بار بار پڑھتے تھے اور اس پر وجد کرتے تھے۔

نواب مرزا خان داغ ملک الشعراء استاد ذوق کے شاگرد ہیں اور بقول منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی مرحوم کے داغی حضرت داغ ذوق دہلوی کے شاگردوں میں فرد کامل تھے۔ بیشک اُن کے با مذاق اور باہل کمال ہونے کا اس سے بڑھکر اور کیا ثبوت نہیں ہو سکتا کہ وُہ اُن کے حریف اور ہمعصروں کے مداح پائے جاتے ہیں[۵] ایک غزل کے قطعہ میں اپنے حضرت ذوق کے شاگرد ہونے کا اعتراف کیا ہے۔

۵ صفحہ ۱۳ پر ولادت ۱۸۳۱ء [illegible] سنہ ۱۸۳۱ء ہے جیسا کہ شروع کتاب میں لکھا گیا ہے۔

بعدِ استاد ذوق کے کیا کیا   شہرہ افزا کلام داغ ہوا

جب شعر و سخن میں مشاق ہوئے - اور قدردانی حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوا - تو رامپور میں گئے - وہ زمانہ نواب کلب علیخان بہادر والئی رامپور کا تھا - جو ہر قسم کے اہلِ کمال خصوصًا لائق شعرا کے بڑے قدردان تھے - رامپور میں عرصہ تک معتمد خاص اور اصطبل اور فراش خانہ کے داروغہ رہے - انہی ایام میں اسیر مرحوم - امیر مینائی مرحوم - منشی امیر اللہ تسلیم - جلال لکھنوی - خواجہ قلق اور مرزا غالب بھی رامپور میں مقیم تھے - انکی صحبت میں بڑے مزے سے زندگی بسر کرتے رہے - معلوم ہوتا ہے کہ اپنے وطن (دلی) کے بڑے مشتاق تھے کیونکہ جب رامپور میں رہتے تھے - تو ہمیشہ دلی کو یاد کیا کرتے تھے - وطن کی اس یاد نے اُنہیں بےچین کر رکھا تھا - مگر محسن کے الطاف و کرم سے رامپور میں رہنے پر مجبور تھے - چنانچہ ایک شعر میں کہتے ہیں ؎

ہر چند رامپور میں گھبرا رہا ہے داغ   کس طرح جائے کلب علیخان کو چھوڑ کر

مگر نواب کلب علیخان کی وفات پر رامپور کی حالت بدل گئی - نہ کوئی شاعر کا قدرداں رہا اور نہ شاعر رہے - یہ اُنہی ایام کا ذکر ہے جب حضرت داغ نے گھبرا کر کہا تھا ؎

رہے کیا مصطفیٰ آباد میں داغ   مزے سارے تھے وہ خلد آشیاں تک

غرضیکہ جب رامپور میں شاعری کی اس طرح کساد بازاری ہوئی - تو وہ بھی دوسرے باکمالوں کے ساتھ حیدرآباد دکن میں چلے گئے - وہاں جا کر اپنے شعر و سخن کی بدولت جو شہرت اور عزت اُنہوں نے حاصل کی - وہ کسی سے پوشیدہ نہیں - اعلیٰ حضرت نظام دکن نے اُنہیں اُردو غزل میں اپنا استاد مقرر کر کے استاد السلطان بنا دیا - اور اس طرح حضرت داغ کو اپنے زمانہ کے تمام اُردو شعرا کا افسر قرار دیا -

انکے اشعار کی زندگی بخش سادگی مشہور عالم ہے - غزلیں کی غزلیں اس طرح کہہ دیتے تھے گویا کسی سے باتیں کر رہے ہیں - بعض اوقات اُنکی شوخی حد سے بڑھ جاتی تھی جو ایک خاص لطف پیدا کرتی - حسن اتفاق سے اُنہیں داغ ایک نہایت عجیب تخلص مل گیا تھا - بعض مقطعوں میں یہ لفظ ایسا موزوں اور شیریں معلوم ہوتا ہے کہ جب شعر کو ایک دفعہ پڑھ لیں تو پھر دُہرانے کو جی چاہتا ہے - ان کے مقطعوں میں یہ

دو مقطعے خصوصیت سے مشہور ہیں ؎

ہمارا نام ونشاں پوچھیں تو اے قاصد بتا دینا ۔ تخلص داغ ہے اور عاشقوں کے دل میں رہتے ہیں

؎ بلائے مجھ سے تو فرمایا تمہیں کو داغ کہتے ہیں

تمہیں رہتے ہو لالیں تمہیں ہو واہ کامل ہیں!

رام پور میں حضرت امیر مینائی اور جلال لکھنوی ایسے باکمال شاعروں سے اکثر ملتے رہتے تھے ۔ مگر جب سے دکن گئے تھے انہیں ان بزرگوں کی ملاقات نصیب نہیں ہوئی تھی ۔ جسکا آپ کو از بس اشتیاق تھا ۔ چنانچہ ایک جگہ کہا ہے ؎

اے داغ ہے دکن سے بہت دور لکھنؤ ۔ ملتے امیر احمد و سید جلال سے

آخر میں اعلیحضرت نظام کے اظہار توجہ سے حضرت امیر مینائی بھی حیدر آباد تشریف لے گئے ۔ لیکن جاتے ہی بیمار ہوئے اور ہفتہ عشرہ میں انتقال کر گئے ۔ اور حیدر آباد کی سرزمین نے اس فرد فرید کو اپنے آغوش میں جگہ دی ۔ جناب داغ اور حضرت امیر مینائی کے یکجائی مشاعرہ ۔ اور ایک ساتھ دونوں کے اظہار کمال کا موقع نہ آنے پایا ۔ جسکا تمام حیدر آباد کو انتظار تھا ۔

جناب داغ پچھلے دنوں بعض عزیزوں کے بے وقت مرجانے اور نیز تقاضائے سن سے اکثر بیمار رہتے ۔ مگر اس عمر میں بھی شعر بغیر نہ رہ سکتے تھے ۔

سنہ ۱۸۹۵ء میں آپ سخت بیمار ہوئے تھے ۔ بد باطن حاسدوں نے انکی موت کی خبر اڑا دی ۔ اور یہ خبر تمام اخباروں میں چھپ کر ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہونچ گئی ۔ شاعروں نے قطعات تاریخ وفات لکھے ۔ اور بعض شعرا کے حلقہ میں اس بے وقت وفات پر ماتمی جلسے بھی ہوئے مگر فوراً اس خبر کی تردید کیگئی ۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اس جھوٹی خبر سے ضرور رنج ہوا خصوصاً ان حاسدوں سے جنہوں نے انہیں جیتے جی مردہ کہلا دیا ۔ چنانچہ اخبار میں تردید چھپنے کیلئے آپنے اپنے ہاتھ سے لکھکر بھیجی ایک دوسرے خط میں آپ نے اس واقعہ کے متعلق لکھا تھا "دشمنوں نے میری بے خبر اڑا دی ہے ۔ اور حال یہ ہے کہ اب فضل الٰہی سے میں بخوبی صحیح و تندرست ہوں ۔ بیماری جاتی رہی ۔ میں باقی رہ گیا ۔ دشمن داغ کا دل جلانا چاہتے ہیں ۔ انکو داغ دل نصیب ہو ۔ مورخہ ۱۱ جولائی سنہ ۱۸۹۵ء فصیح الملک داغ دہلوی ۔ محبوب گنج ۔ حیدر آباد دکن "۔

کارخانہ مشہور عالم جنتری ہو کا انعامی سلسلہ تیسرے سال سے جاری ہے

کارخانہ کی ملنساری اور پبلک کی قدر دانی سے ملک کے ہر ایک حصہ میں ٹکٹ فروخت ہو چکے

شرائط

اوّل۔ آپ کارخانہ کے ٹکٹ اپنے شہر کے کسی احباب سے خرید فرماویں بصورت نہ ملنے کے آپ براہ راست کارخانہ میں موازی آٹھ آنہ علاوہ محصول بھیجکر چار ٹکٹ منگالیں ٭

دوم۔ پھر اُن چاروں ٹکٹوں کو دیگر احباب کے ہاتھ موازی دس دس آنہ پر فروخت کرکے مبلغ ۲/۸ وصول کرلیں۔ اسمیں سے موازی آٹھ آنے تو آپ اپنے خود رکھ لیں اور باقی مبلغ ۲/- جمع رکھیں۔ پھر آپ اپنے چاروں خریداروں کے نام ٹکٹوں پر معہ مفصل پتہ کے لکھکر کارخانہ میں واپس بھیجدیں۔ اور مندرجہ ذیل تصویردار میں سے ایک چیز جو پسند خاطر ہو تحریر فرماویں ٭

سوم جس وقت آپکا آرڈر پہنچیگا۔ کارخانہ فوراً انعامی اشیاء حسب الارشاد بذریعہ وی۔ پی معہ ۱۶ عدد ٹکٹ کے مبلغ ۲/- پر آپ کی خدمت میں بھیجدیگا یہ دو روپیہ صرف اُن ۱۶ ٹکٹوں کی قیمت ہے جو آپ اپنے خریداروں کے لئے منگاتے ہیں جن کی قیمت دو روپیہ آپکے پاس جمع ہے) مگر محصولڈاک انعامی اشیاء کا علاوہ دو روپیہ کے زائد جو خرچ کیا جائیگا۔ جو آپ کو اپنی گرہ سے دینا پڑیگا۔ پس وی پی وصول کرکے انعامی اشیاء آپ خود رکھ لیں اور اپنے چاروں خریداروں کو چار چار ٹکٹ معہ اُن کے ناموں کے سارٹیفکیٹ کے دیدیں پھر وہ صاحب بھی اسی طرح یکے بعد دیگرے فروخت کا سلسلہ جاری رکھکر جو چیز چاہیں مفت منگالیں ٭

المشتہر

پنڈت گردھاری لعل منجم و جفار سیالکوٹی مصنف مشہور عالم جنتری و مالک کارخانہ کوڑ لاہور